ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب
سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین دہلی کی مذہبی اور تاریخی مطبوعات

ذیل میں ندوۃ المصنفین دہلی کی چند اہم دینی، اصلاحی اور تاریخی کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے، مفصل فہرست جس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی دفتر سے طلب فرمائیے۔

اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ جدید ایڈیشن جس میں نظرثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

سلسلۂ تاریخ ملت ۔ مختصر وقت میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ سلسلہ نہایت مفید ہے، اسلامی تاریخ کے یہ حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع بھی۔ انداز بیان نکھرا ہوا اور شگفتہ

نبی عربی صلعم ۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سیرت سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دلنشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

خلافت راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ) عہد خلفائے راشدین کے حالات و واقعات کا دلپذیر بیان۔ قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

خلافت بنی امیہ (تاریخ ملت کا تیسرا حصہ) قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

خلافت ہسپانیہ (تاریخ ملت کا چوتھا حصہ) قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

خلافت عباسیہ جلد اول (تاریخ ملت کا پانچواں حصہ) قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

خلافت عباسیہ جلد دوم (تاریخ ملت کا چھٹا حصہ) قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

فہم قرآن ۔ جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

غلامان اسلام ۔ اسّی سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان، جدید ایڈیشن۔ قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

اخلاق و فلسفۂ اخلاق ۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین اور سہل کیا گیا ہے۔ قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

قصص القرآن جلد اول ۔ تیسرا ایڈیشن۔ حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات و واقعات تک۔ قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

قصص القرآن جلد دوم ۔ حضرت یوشع سے حضرت یحییٰ تک کے حالات تک۔ تیسرا ایڈیشن۔ قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

قصص القرآن جلد سوم ۔ انبیاء علیہم السلام

برہان

جلد بست و پنجم — شمارہ (۱)

جولائی سنہ ۱۹۵۰ء مطابق رمضان المبارک سنہ ۱۳۶۹ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

ٹنڈن جی یہی کہتے ہیں کہ مسلمان عرب و ایران کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ان ملکوں کی طرف بالکل ہی نہ دیکھیں تو کیا آج جبکہ پوری دنیا سمٹ سمٹا کر ایک خاندان یا ایک قبیلہ بن گئی ہے اور اس بنا پر سائبیریا کی پہاڑیوں میں کوئی دھماکہ ہوتا ہے تو واشنگٹن تک کے لوگ چوکنے ہو کر دیکھنے لگتے ہیں کیا کسی قوم کے لئے یہ ممکن بھی ہے۔ اگر وہ زندہ رہنا چاہتی ہے کہ آس پاس کے ملکوں سے آنکھیں بند کر لے اور اندھی بہری بن کے اپنے ملک کی چہار دیواری میں بند ہو کر بیٹھ رہے پھر جو لوگ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں خود ان کا کیا حال ہے؟ کیا وہ عرب و ایران کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبشِ قدم پر کڑی نگاہ نہیں رکھتے؟ وہاں عرب لیگ۔ اور مصر و عراق اور ایران کی مجلسوں میں جو گفتگوئیں ہوتی ہیں ان پر ان کے کان نہیں لگے رہتے اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ کیا بھارت کی حکومت ان ملکوں سے دوستی کا دم نہیں بھرتی! ان ملکوں سے جو صدیوں کے پرانے کلچرل تعلقات ہیں۔ اور جو زیادہ تر مسلمانوں کی وجہ سے ہیں کیا بھارت کی حکومت ان تعلقات کو بڑھانے اور ترقی دینے کی جدوجہد نہیں کر رہی ہے؟ اور کیا اس مقصد کے لئے علاوہ سفارتی علائق کے باقاعدہ کلچرل کونسل قائم نہیں ہے؟ کیا اس پودے کو پروان چڑھانے کے لئے حکومت کی طرف سے عربی اور فارسی میں رسالے شائع نہیں کئے جاتے،

اور پھر عرب اور ایران پر ہی کیا موقوف ہے! کیا آپ امریکہ کو نہیں دیکھتے۔ روس سے آپ نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں؟ فرانس اور انگلینڈ، چین، برما اور انڈونیشیا پر آپ کی نظریں نہیں جمی ہوئی ہیں؟ کوریا کے جنوبی اور شمالی حصوں پر آپ کی نگاہ نہیں پڑ رہی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان سب کو آپ بھی دیکھتے ہیں۔ مگر اپنی اپنی نظر ہے۔ آپ معلوم نہیں کس نظر سے دیکھتے ہیں لیکن مسلمان جس نظر سے دیکھتے ہیں وہ عین ان کے نظریۂ حیات اور آئیڈیالوجی کے مطابق ہے۔

ایک مسلمان اپنے مخصوص نظریۂ حیات اور اسلام کی عالمگیر اخوتِ انسانی کی تعلیم کے ماتحت

دنیا کے ہر انسان کو بلا تفریق رنگ و نسل اور بلا امتیاز مذہب و ملت ایک ہی آدم کی اولاد اور اس بنا پر سب کو اپنا بھائی سمجھتا ہے اس کا ایمان ہے کہ

"بنی آدم اعضائے یک دیگر اند"

جارحانہ قومیت جو آج دنیا میں بدامنی و بے چینی کا سب سے بڑا سبب ہے اور جس کی تباہ کاریاں آج روز روشن کی طرح ایک ناقابل انکار حقیقت بن چکی ہیں مسلمان کے نظریۂ حیات کے بالکل خلاف اور اس کی ضد ہیں۔

انسانی برادری کے اس عام تعلق کے بعد مذہب، وطن اور نسل وغیرہ کے دوسرے روابط ہیں جن پر بین الملکتی یا بین الاقوامی تعلق کی کمی بیشی کا دارومدار ہوتا ہے پس بھارت کے مسلمانوں کو عرب و ایران کے مسلمانوں کے ساتھ عام انسانی تعلق کے علاوہ ایک یہ تعلق بھی ہے کہ وہ ان کے ہم مذہب ہیں اور انسانی بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے برادر دینی بھی ہیں۔ اس مذہبی تعلق کی وجہ سے ساری دنیا کے مسلمان ایک ہی وقت میں ایک ساتھ مل کر خدائے واحد کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں ایک ہی مہینہ میں سب ایک ساتھ روزہ رکھتے اور ایک ہی موسم میں کعبہ کا طواف کرتے ہیں اور ان میں آپس میں شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم ہو سکتے ہیں ان کی پیدائش اور موت کے وقت جو رسوم ادا کی جاتی ہیں وہ بھی ایک ہیں یہ سب ایک ہی خدا کو مانتے اور ایک ہی کتاب پر عمل کرتے ہیں

لیکن اس مذہبی تعلق کی وجہ سے اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ بھارت کا یا کسی ایسے ملک کا مسلمان جہاں اقتدار اعلیٰ وہاں کی غیر مسلم اکثریت کے ہاتھ میں ہو وطن سے غداری کر کے عرب و ایران یا کسی اور اسلامی ملک کے مسلمانوں کے ساتھ ساز باز کر سکتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں پر اور اسلامی تعلیمات پر اس سے بڑھ کر کوئی الزام اور بالکل غلط و بے بنیاد اتہام نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک وطنی حقوق کی رعایت اور حملۂ غیر کے خلاف وطن کی حفاظت کا تعلق ہے اسلامی تعلیمات کے ماتحت ایک مسلمان کا بھی وہی فرض ہے جو اس ملک کے دوسرے غیر مسلم باشندوں کا ہے خواہ اس ملک پر حملہ کرنے والا کوئی غیر مسلم ملک ہو یا مسلم ملک شرط صرف یہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی شہری حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا ہو اور وہ اپنے دینی و مذہبی معاملات و مسائل میں آزاد ہوں ایک سگے بھائی سے زیادہ اور کون سا رشتہ مضبوط ہوگا لیکن اگر ایک شخص اپنے حقیقی بھائی کے گھر پر زبردستی قبضہ کرنا چاہتا ہے تو اسلام ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا کہ محض بھائی ہونے کی

وجہ سے غاصب کو قبضہ کر لینے دیا جائے اور اس کی مقاومت نہ کی جائے نہیں بلکہ اس کے برعکس اسلام اس بھائی کو ظالم اور غاصب قرار دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ اس کا مقابلہ کر کے اپنے گھر کی حفاظت کی جائے۔

اسلام چونکہ دین فطرت اور مکمل قانون عدل و انصاف ہے اس لئے مختلف روابط و علائق کی وجہ سے ایک فرد کے دوسرے فرد پر یا ایک قوم کے دوسری قوم پر جو حقوق واجب ہوتے ہیں اسلام ان میں سے ہر حق کی الگ الگ تشخیص و تعیین کرتا ہے اس کے واجبات و فرائض کی تشریح و توضیح کرتا ہے اور ہر حق کا جدا جدا مرتبہ و مقام متعین کر کے ایک حق کو ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ دوسرے حق پر دست برد کرے اسلامی تعلیمات کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ایک مسلمان کسی غیر اسلامی ملک میں بھی اعتماد اور بھروسہ کی زندگی بسر کر

ممکن ہے وہ لوگ جو خود اپنے اوپر بھی بھروسہ نہیں کر سکتے وہ آج ہماری ان باتوں کو وقتی مصلحت اندیشی یا ڈپلومیسی پر محمول کریں ان لوگوں کو ہم یاد دلائیں گے کہ یہ بات ہم آج نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ تقسیم ہند سے بہت پہلے جب کہ ہندو مسلمان دونوں شانہ بشانہ جنگ آزادی لڑ رہے تھے۔ ملک کے دو نہایت مقتدر علماء مولانا سید سلیمان ندوی اور حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیری علی الترتیب کلکتہ اور پشاور کے آل انڈیا جمعیۃ علمائے ہند کے عظیم الشان سالانہ اجتماعات کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبوں میں بالکل صاف صاف اسلام کا یہی حکم جس کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے بیان فرما چکے ہیں جو حضرات قرآن و حدیث یا کتب فقہ کا براہ راست مطالعہ نہیں کر سکتے وہ انھیں خطبوں کو چاہ دیں ہیں ملاحظہ فرمائیں

اس موقع پر ہم ٹنڈن جی اور ان کے ہم خیال ہندوؤں سے ایک بات پوچھنی چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ کبھی آپ لوگوں نے اس پر غور کیا ہے کہ اگر اسلام دوسرے مذہب کے پیروؤں کے ساتھ صلح و آشتی محبت و ہمدردی اور عدل و انصاف سے رہنے کی تعلیم نہیں دیتا اور کسی ایسے ملک کو جہاں کی بھاری اکثریت غیر مسلم ہو مسلمانوں کا وطن تسلیم نہیں کرتا تو پھر آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جمعیۃ علماء ہند، علماء دیوبند و سہارنپور اور دوسری بڑی بڑی دینی جماعتوں کے اکابر علماء جو دین کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت گوارا نہیں کرتے یہ سب کے سب تقسیم ہند کی مخالفت میں کانگریس سے بھی پیش پیش تھے پھر اس سلسلہ میں جمعیۃ علماء نے جس خلوص، ایثار، بے نفسی اور بے لوث محبت وطن کا عملی ثبوت دیا ہے ٹنڈن جی یا ان کی پارٹی کا ہر

سودا خار عشق میں خسرو سے کوہکن ∴ بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز ∴ اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

تدوین حدیث

(۶)

محاضرۂ چہارم

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

لیکن ہمیشہ اس قسم کے حالات عارضی حالات ہی کی شکلوں میں نمودار ہوئے ہیں، چونکہ کے بعد پھر اپنے اصلی مسلک کی طرف لوگ واپس ہو گئے جس کی وجہ یہی تھی کہ مسلمانوں کا سارا کتب خانہ ان معلومات سے معمور ہے، جونہی جہل کا ازالہ ہوا، صحیح معلومات اور صحیح مسلک لوگوں کے سامنے آگیا۔ آیندہ اگر توفیق رفیق ہوئی اور زندگی نے ساتھ دیا اور تدوین حدیث کی اس تاریخ کی تکمیل کا موقعہ ملا تو انشاء اللہ ان قصوں کو بیان کیا جائے گا۔ اس وقت تو صرف بتانا مقصود ہے کہ اپنے عہد خلافت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی دین کے اس شعبہ کی خصوصیتوں کی حفاظت اور نگرانی کی پوری کوشش کی، جذبات کے فوری تاثرات کے زیر اثر حدیثوں کے قلم بند کرنے کا ایک غیر صحیح اقدام ان کی طرف سے جو ہو بھی گیا تھا، اس کی فوراً آپ نے اصلاح فرما دی، بلکہ لکھنے کے بعد اس مجموعہ کو جلا دینے سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء مبارک کی جیسا کہ میں نے عرض کیا نئے سرے سے تازہ تجدید ہو گئی، اگر یہ صورت نہ پیش آتی تو یہ سوال ہی کا ہے کو اٹھتا کہ لکھنے کے بعد جلانے کی مصلحت کیا تھی۔ خصوصاً جب خود ان ہی کا بیان ہے کہ علاوہ اپنے براہ راست معلومات کے ان ہی لوگوں کی روایتیں اس کتاب میں درج کی گئی تھیں جن کی امانت و وثاقت پر اپنے نزدیک ان کو اطمینان تھا۔ حضرت کو الفاظ

فیھا احادیث عن رجل ائتمنتہ ووثقتہ — اس میں حدیثیں ایسے آدمی سے لی گئی ہیں جس کی امانت پر میں نے بھروسہ کیا اور اس کے بیان پر اعتماد کیا

کا ظاہر ہے کہ یہی مطلب تھا، مگر باوجود اس کے لکھنے کے بعد اس کو جلا دینا جیسا کہ بہ تفصیل عرض کیا گیا اس کی وجہ وہی نبوی منشاء کی تکمیل ہی ہو سکتی ہے جس کے متاثر ہونے کا خطرہ حضرت ابوبکرؓ کے اس جمع کردہ نسخہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

لیکن حضرت ابوبکرؓ کا کام تدوین حدیث کے سلسلے میں صرف ان ہی دو خدمات تک محدود نہیں ہے افسوس ہے کہ کتابوں میں ان کی اس خدمت کا تذکرہ کیا گیا تھا لیکن شاید اس کی اہمیت کا اندازہ جیسا کہ چاہئے تھا لوگوں کو نہ ہوا۔ بات میں ممکن ہے کچھ طوالت پیدا ہو لیکن کیا کیا جائے مجھ سے پہلے کام لینے والوں نے اختصار سے کام لیا میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جس اہمیت کے مستحق تاریخ کے یہ وثائق تھے ان کی اس اہمیت کا اندازہ اچھے اچھوں کو نہ ہو سکا۔

کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ بجائے عمومی اشاعت کے دین کے اس حصہ کے متعلق یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا کہ پہونچانے کی حد تک وہ پہنچا تو دیا جاتا لیکن عموماً ہر شخص تک پہنچ جائے اس کی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ جیسا کہ بتایا گیا اسی سے مسلمانوں کی دینی زندگی میں اس حصہ کے لحاظ سے سہولتیں پیدا ہوئیں جو ان سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے بھی راہ کھلی ہوئی ہے لیکن محروموں کی محرومی میں اس لئے اضافہ نہیں ہوتا کہ اس حصہ کے مطالبہ و گرفت میں وہ نوعیت نہیں پیدا ہوتی جو قرآنی حصہ کی خصوصیت ہے، مگر اسی کے ساتھ ایک دوسرا نتیجہ یعنی ان روایتوں کے جاننے والوں اور جو ان سے ناواقف تھے ان دونوں طبقوں میں اختلاف کا پیدا ہو جانا واقفیت اور عدم واقفیت کی وجہ سے ناگزیر تھا ابھی کچھ دیر پہلے حضرت عمرؓ ہی کے متعلق دو قصے اس سلسلہ میں گذر چکے، معمولی آدمی نہیں حضرت عمرؓ جیسی شخصیت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثوں یعنی استیذان (اجازت) کے خاص طریقے اور بیت المقدس والی مسجد کے اس قصے سے جس کا ذکر میں نے حاشیہ میں کیا ہے آپ سن چکے وہ ناواقف تھے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ذکر دوسرے صحابیوں سے فرمایا تھا واقعہ یہ ہے کہ دین کے اس حصہ کو جس طریقہ سے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہونچایا تھا ایسی صورت میں بعضوں کا اس سے واقف ہونا اور بعضوں کا ناواقف رہ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہوسکتی، خصوصاً جن لوگوں کو معاشی یا اسی قسم کے دوسرے کاروبار کی وجہ سے چوبیس گھنٹہ کی حاضرباشی کا دربار نبوت میں موقعہ میسر نہ تھا استیذان والی روایت میں خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اعتراف کرنا پڑا۔

خفی علی ھذا من امر رسول اللہ	یعنی روایت مجھ سے جو مخفی رہی تو اس کی وجہ یہ ہے
صلی اللہ علیہ وسلم الھانی عنہ	کہ بازاروں کے کاروبار کی مشغولیت نے اس کا
الصفق فی الاسواق ص۱۲۱ ج۲ العزلہ	موقعہ میرے لئے نہیں رکھا تھا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی کثرت روایت کی وجہ بیان کرتے ہوئے بھی یہی کہتے تھے کہ

ان اخوانی من المھاجرین کان	میرے دوسرے مہاجر بھائیوں کو بازاروں کے
یشغلھم الصفق فی الاسواق	کاروبار نے اپنے ساتھ مشغول رکھا مگر میں تو صرف
وکنت الزم رسول اللہ صلی اللہ	پیٹ پر رسول اللہ کے آستانے پر پڑا ہوا تھا۔
علیہ وسلم علی ملاء بطنی	

غالباً ابوہریرہؓ کی اس پوری روایت کا ذکر کہیں پہلے بھی آچکا ہے حاصل اس کا یہی تھا کہ مہاجرین تو بازار کے کاروبار میں عموماً مشغول رہتے تھے اور انصار کو اپنے باغوں اور کھیتوں کی وجہ سے زیادہ فرصت میسر نہیں آتی تھی البتہ یہ فقیر ابوہریرہ صرف پیٹ پر پیغمبر کے آستانے پر پڑا ہوا تھا اسی کا نتیجہ یہ ہوا جیسا کہ خود ان کا بیان ہے کہ فاشھد اذا غابوا واحفظ اذا نسوا میں اس وقت حاضر رہتا تھا جس وقت یہ لوگ غائب رہتے تھے اور جن باتوں کو دوسرے بھول جاتے تھے مجھے حاضر باشی کی وجہ سے یاد رہ جاتی تھیں، کیونکہ بار بار سننے کا موقعہ ملتا تھا۔

اگرچہ یہ باتیں کس نوعیت کی ہوتی تھیں اس کا اندازہ حضرت عمرؓ والی ان ہی دو واقعوں سے ہوسکتا ہے، استیذان اصولی طور پر ایک قرآنی قانون ہے، قرآن ہی میں حکم دیا گیا ہے کہ کسی دوسرے گھر میں بے دھڑک بغیر اجازت مسلمانوں کو گھسنا نہ چاہئے، بلکہ صاحب خانہ کو مانوس

جاکر اور سلام کلام کرکے داخل ہونا چاہتے قرآنی قانون ہونے کی وجہ سے اس کی تبلیغ عام ہو چکی تھی
بانی سلام کتنی دفعہ کرنا چاہتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر عمومی طریقہ سے لوگوں کو تعلیم دی
تھی کہ تین دفعہ سلام کرنے کے بعد بھی جواب نہ ملے تو پلٹ جاؤ بس یہی تین دفعہ سلام کرنا اس کی عمومی
اشاعت مسلمانوں میں ضروری نہ تھی، ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ بس استیذان یعنی کسی
گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت طلبی کے وقت سلام کرنے کا جو قرآنی حکم ہے اسی حکم کی
یہ تفصیل کہ تین دفعہ سلام کیا جائے یہ ایسا مسئلہ تھا جو عمومی اشاعت پانے والے مسائل کی حیثیت
نہیں رکھتا تھا اسی طرح بیت المقدس کے متعلق حضرت داؤدؑ کا قصہ سو ظاہر ہے کہ ایک
تاریخی واقعہ تھا ہر تاریخی واقعہ کی تبلیغ ہر شخص تک کھلی ہوئی بات ہے کہ فرائض نبوت میں داخل
نہیں ہے بقول ابوبکر الجصاص

لیس علی النبی صلی اللہ علیہ	یعنی جن امور میں مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے ان
وسلم توقیفھم علی الا فضل	کے اس پہلو سے امت کے ہر فرد کو آگاہ کرنا جو
مما خیرھم فیہ تفسیر جصاص ج۲ ص۱۲	بہتر اور افضل ہو، یہ پیغمبر کے لئے ضروری نہیں ہے

اسی لئے بعضوں تک پیغمبر کی اس قسم کی باتیں پہونچیں اور بعضوں تک نہ پہنچیں۔ یہ ایک ایسی صورت
حال تھی کہ مسلمانوں کی سہولت اور آسانی کے لحاظ سے اس کی جو کچھ بھی قیمت ہو لیکن جاننے والوں
اور نہ جاننے والوں کے درمیان اختلاف کا پیدا ہو جانا اس کا ایک لازمی و ناگزیر نتیجہ تھا۔ اسی کے
ساتھ شرعی قوانین کی محدودیت اور قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے ساتھ پیش آنے
والے حوادث وواقعات کی لامحدودیت نے اس ضرورت کو جو پیدا کیا تھا کہ شرعی کلیات کو پیش نظر
رکھ کر انسان ہی محدود قوانین کی روشنی میں نت نئی پیش آنے والی صورتوں کے لئے احکام پیدا
کئے جائیں جس کا اصطلاحی نام فقہ ہے، دین اور وہ بھی دین اسلام جو مدعی ہے کہ ہر وہ شخص جو
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت و رسالت کے بعد انسان بن کر زمین کے کرہ
پر قیامت تک پیدا ہوتا رہے گا اس کے لئے یہ آخری قانون ہے، ایک ایسے عالمگیر وسیع

دینی آئین کے لئے تفقہ کے اس باب کا کھلا رکھنا کس حد تک ضروری ہے اس کا اندازہ آپ کو عام دنیاوی قوانین کے ماہرین کے بیانوں سے ہو سکتا ہے۔ حالاں کہ کسی محدود علاقے کے لئے محدود زمانے میں حکومتیں ان قوانین کو بناتی ہیں، لیکن باوجود اس کے جیسا کہ سرسائمنڈ نے اپنی مشہور کتاب "اصول قانون" میں لکھا ہے

"بہر حال کسی ملک کے ججوں کے اختیار تمیزی کے بغیر صرف قانون سے انفصال مقدمات ناممکن ہے" (مترجمہ دارالترجمہ سرکار عالی ص۲۲)

تفصیل کے لئے تو دیکھئے میری کتاب "تدوین فقہ" یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ "تفقہ" کی اسی ناگزیر صورتِ حال سے اختلافات کا پیدا ہو جانا لابدی تھا اور وہ پیدا ہوا، مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کا ایک بڑا حصہ عموماً انہی دونوں باتوں یعنی احاد خبروں کی واقفیت وعدم واقفیت پر مبنی ہے یا ان اجتہادی نقاطِ نظر پر ہے جن کا پیدا ہو جانا اجتہادی کوششوں میں قدرتی امر ہے اور خواہ ان اختلافات کے متعلق نہ جاننے والوں میں جس قسم کے خیالات بھی پھیلے ہوئے ہوں[1] مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ

---

[1] میرا اشارہ اس عام چرچے کی طرف ہے جو مسلمانوں کے متعلق پھیلا ہوا ہے کہ بدترین قسم کی فرقہ بندیوں میں یہ قوم مبتلا ہے غیر تو غیر اپنوں کو بھی اس پر طاقات چھاتی پیٹتے دیکھا گیا ہے لیکن جو اصل واقعہ ہے اسے اپنی مختلف کتابوں مقالات و مضامین میں بہ تفصیل بیان کر چکا ہوں حاصل یہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں فوج در فوج دنیا کی قومیں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں تو اس میں شک نہیں کچھ دن کے لئے جیسا کہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے نت نئے خیالات وعقائد کے رکھنے والے فرقے پیدا ہو گئے تھے ان میں بعض فرقوں کی بنیاد تو سیاسی اختلافات پر مبنی تھی اور بڑی تعداد ان فرقوں کی تھی جو اسلام میں اپنے موروثی مذہب کے جراثیم کو لئے ہوئے داخل ہوتے تھے، شعوری یا غیر شعوری طور پر شروع میں یہ چاہا گیا کہ اسلامی تعلیمات اور ان کے موروثی خیالات میں تطابق ومصالحت پیدا کی جائے اسی غیر محمود کوشش نے جہاں تک میرے معلومات کا اقتضا ہے ان مختلف فرقوں کو اسلام میں پیدا کر دیا تھا لیکن جوں جوں آئندہ نسلوں کے قدم حقیقی اسلام میں راسخ ہوتے چلے گئے آبائی موثرات کا دباؤ ڈھیلا پڑتا گیا، صحیح اسلام جوں جوں نومسلموں کے سامنے بے نقاب ہوتا چلا گیا اپنے آبائی خیالات سے ان کا تعلق کمزور ہوتا رہا تا ایں کہ جو تھی پانچویں صدی ہجری تک پہنچتے پہنچتے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ان ہی اختلافات کے سلسلے میں یہ عجیب و غریب صورتِ حال جو نظر آ رہی ہے کہ مسلمانوں کی قوم علاوہ دنیا کے مختلف اقالیم و ممالک میں کروڑہا کروڑ کی تعداد میں پھیلی ہوئی ہے۔ تخمینہ کرنے والے افراد کے نزدیک چالیس سے ستر کروڑ افراد انسانی پر یہ قوم مشتمل ہے جن میں مختلف زبانوں کے بولنے والی سیکڑوں نسلیں بنی آدم کی شریک ہیں۔ ان میں گورے، کالے، زرد، گندمی الغرض ہر رنگ اور ہر شکل کے لوگ ہیں لیکن بایں ہمہ بجز ایک فرقہ کے جن کی اقلیت اتنی ناقابلِ لحاظ اقلیت ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے مقابلہ میں گویا ان کا وجود و عدم سمجھنا چاہئے کے برابر ہے یہ ساری عظیم اکثریت اہل السنت والجماعت کے ایک ہی فرقہ کی شکل میں جو پائی جاتی ہے، لوگ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بتدریج یہ رنگ اتنا تھا کہ یہ سارے فرقے خود بخود مضمحل ہو کر ناپید ہو گئے صرف مسلمانوں کی مذہبی تاریخوں میں لوگ ان فرقوں کا نام لکھتے ہیں لیکن دنیا سے ان کا وجود معدوم ہو چکا ہے معمولی چھوٹے ناپرسان حال فرقوں ہی کا یہ انجام نہیں ہوا بلکہ بعض بڑے منہ زور، صاحب السیف والقلم فرقے مثلاً معتزلہ تک کا یہ حال ہے کہ اس وقت اس فرقے کے کسی آدمی کا ملنا تو دور کی بات ہے، کتب خانوں میں اس مذہب کے عقائد و خیالات کی کوئی خالص کتاب بھی نہیں پائی جاتی لغت یا تفسیر وغیرہ کے سلسلے میں گنتی کی چند کتابیں ہیں ان میں کچھ ان کے خیالات ملتے ہیں یا اہلِ سنت نے تردید کے لئے ان کے مسلمات کا اپنی کتابوں میں جو ذکر کیا ہے اس سے کچھ ان کے خصوصیات کا علم حاصل ہوتا ہے، میں نے لکھا ہے کہ باقی حنفی، شافعی، مالکی و حنبلی فقہ کے یہ چار مکاتب خیال بلا شبہ مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کے اختلافات پر فرقہ بندی کے اختلافات کا اطلاق قطعاً غلط ہے آخر جب ان میں ہر مکتب کے لوگ دوسرے مکتبِ خیال کے ائمہ و اکابر کا اسی قدر احترام کرتے ہیں جتنا اپنے بزرگوں کا تو پھر ان میں کسی ایک جماعت کے دین کو دوسری جماعت کے دین سے جدا کیسے قرار دیا جا سکتا ہے یہی نہیں ہر ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھتے ہیں، ازدواجی تعلقات رکھتے ہیں۔ بلکہ حد یہ ہے کہ ایک جماعت کے لوگ دوسری جماعت کے پیروں کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں حضرت غوث پاک کا وجود اس کی سب سے بڑی مثال ہے کہ فقہاً حضرت حنبلی مسلک کے پابند تھے لیکن ایسا کون سا مسلمان ہے جو آپ کو سید الاولیا نہیں مانتا واقعی فرقہ کا اطلاق صرف شیعوں پر یا خوارج پر ہو سکتا ہے سو خوارج کا وجود کروڑہا کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے قابلِ ذکر نہیں رہا شیعہ فرقہ کے مسلمانوں کی تعداد اس میں شک نہیں کہ خوارج سے زیادہ ہے لیکن اہلِ سنت کی اکثریت کثیرہ عظیمہ کے مقابلہ میں سچ پوچھئے تو ان کی تعداد بھی سمندر میں چند تنکوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

اس کو کیوں نہیں سوچتے کہ اختلافات کے ان دو مستقل آتش فشاں پہاڑوں پر جس قوم کی دینی زندگی کی تعمیر کھڑی کی گئی ہے، اسی دین میں وحدت و یگانگت کا یہ حیرت انگیز مظہر مگر ساتھ ہی دلکش رنگ کیسے پیدا ہو گیا؟ کیا یہ کوئی اتفاقی واقعہ ہے لوگوں کا مطالعہ اگر صحیح ہوتا تو ان کے سامنے ان سارے انتظامات، اور استقرائی و احتیاطی تدبیروں کا نقشہ آجاتا جو شروع ہی سے اس راہ میں اختیار کئے گئے عہدِ نبوت میں تو اختلافات کے پیدا ہونے کی گنجائش ہی کیا تھی، پیغمبر کا وجود قولِ فیصل تھا جو براہ راست خدا سے علم پا رہے تھے، ہر اختلاف کا فیصلہ پیغمبر کی طرف رجوع کرنے کے ساتھ ہی ہو جاتا تھا۔ قرآن ہی میں بار بار مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا تھا کہ ہر اختلاف میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو تاہم ایک چیز اس زمانہ میں بھی پیدا ہو چکی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسی کو اصلاح کا ذریعہ بنایا تھا۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اختلافاتِ باہمی سے مسلمانوں کو جو منع کیا گیا ہے، ہمیں سوچنا چاہئے کہ واقعی اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا ہر مسلمان کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ وہی معلومات اپنے پاس رکھے جو دوسرے رکھتے ہیں، یا یہ کہ ہر مسلمان وہی بات سوچے جو دوسرے سوچتے ہیں، مگر غور کرنا چاہئے کہ کیا یہ ممکن بھی ہے؟ خصوصاً دین کے اس ثانوی حصہ کو جب پیغمبر اس طریقے سے پہنچا رہے تھے کہ ادرتو اور ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے مقربینِ بارگاہ کو بھی بسا اوقات اس سلسلے میں اپنی ناواقفیت کا اعتراف کرنا پڑتا تھا ایسی صورت میں یہ خیال کہ معلومات کے اختلاف سے جو اختلاف قدرتاً پیدا ہوتا یا ہو سکتا تھا اس سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے خود ہی سوچئے کہ اس کا مطلب کیا ہوگا؟ اسی طرح جب تفقہ کا باب کھولا گیا تھا اور عرض کر چکا کہ عملی طور پر کوئی دنیوی قانون بھی اس کے بغیر چل نہیں سکتا تو قیامت تک کیلئے ساری دنیا کے لئے جو دینی دستور دیا گیا تھا وہ اس دروازے کے بند کرنے کے بعد نت نئی روزانہ پیش آنے والی صورتوں اور ضرورتوں کی تکمیل کی ضمانت کیسے کر سکتا تھا اور تفقہ" کے دروازے کو کھلا رکھنے کے بعد یہ توقع کیا پوری ہونے والی توقع ہو سکتی ہے کہ شرعی کلیات اور نصوص کو پیش نظر رکھ کر نئے پیش آنے والے حوادث کے متعلق

حکم پیدا کرنے والے ہمیشہ ایک ہی نتیجہ تک پہونچیں گے۔

میرے نزدیک تو اختلاف سے ممانعت کا اگر یہی مطلب لیا جائے گا تو دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سارے انسانوں کو حکم دیا جائے کہ اپنے چہروں کے رنگ کو ایک کر دو، اپنے قدوں کو برابر کر دو ہر شخص ایک ہی قسم کی آواز منہ سے نکالے الغرض جو کچھ ایک کے پاس ہے مزید ہی قرار دیا جائے کہ وہی سب کچھ دوسرے کے پاس بھی ہو اور وجہ یہ بیان کی جائے ان ہی چیزوں کے اختلاف سے لوگوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ حکم ہمیشہ ان ہی چیزوں کو دیا جاتا ہے یا دیا جا سکتا ہے جو آدمی کے اختیاری حدود میں ہوں۔ بھلا غریب آدمی کے بس میں ہے کہ اپنے چہروں کے رنگ و روغن، شکل و صورت، قد و قامت چال ڈھال وغیرہ قدرتی اختلافات اور انفرادی خصوصیتوں کو مٹا کر ایک کر دے اور جیسے یہ اس کے بس کی بات نہیں، یقین کیجئے کہ ذہنی اور دماغی یا باطنی خصائل و غرائز کے فطری اختلافات جن کی وجہ سے فکری اختلافات پیدا ہوتے ہیں ان اختلافات کو بھی آدمی اپنی قدرت اور اپنے ارادے سے مٹا نہیں سکتا۔ پس یہ کہنا کہ تفقہ میں ہر مسلمان فقیہ کو اس کا پابند بنایا گیا ہے کہ جس نتیجہ تک شرعی قوانین کی روشنی میں دوسرے پہونچیں اسی نتیجہ تک وہ بھی پہونچے اور یہ باور کیا جائے بلکہ پایا جائے کہ اس حکم کی تعمیل سے قاصر رہنے والے قرآن کے ان مطالبوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں جن میں مسلمانوں کو تفرق و اختلاف سے بچنے کی شدید تاکیدیں کی گئی ہیں اور عذابِ عظیم کی دھمکیاں دی گئی ہیں ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ کوئی معمولی دعویٰ نہ ہوگا، مسلمانوں کی تاریخ کے سارے روشن اوراق یقیناً اس کے بعد اچانک سیاہ پڑ جائیں گے، میں اوروں کے متعلق تو نہیں کہتا کہ اس سلسلے میں ان کے خیالات کیا ہیں لیکن جہاں تک اپنی ناقص غور و فکر سے کام لینے کے بعد جس نتیجہ تک پہنچا ہوں، اسے پیش کر دیتا ہوں۔

میں تو یہی سمجھتا ہوں اختلاف و تفرق سے جن آیتوں میں مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے اگر ان کا مطلب یہی لیا جائے گا تو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ اسی قسم کا مطالبہ ہوگا کہ کالے رنگ والوں

کو حکم دیا جائے کہ اپنے چہروں کو گورا بنالیں ورنہ عذاب عظیم کے وہ مستحق ہوں گے میرے نزدیک تو دونوں مطالبوں میں اصولاً کسی قسم کا فرق نہیں ہے بس سوچنے کی بات یہی ہے کہ قرآن جس اختلاف سے منع کر رہا ہے وہ ہے کیا؟ یقیناً یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہو سکتی جس کی تعمیل انسانی دسترس سے باہر ہو آخر لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا یعنی وسعت اور گنجائش ہی کو دیکھ کر مطالبہ کیا جاتا ہے یہی تو قرآن ہی کا کلی قانون ہے جب ہر باب میں اس قانون کی ہمہ گیری مسلم ہے تو اختلاف کا مسئلہ اس کے دائرے سے کیسے باہر ہو سکتا ہے اس معیار پر اس مسئلہ کی جو واقعی حقیقت ہو سکتی ہے اسے متعین کیجئے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں یعنی وہی گورے اور کالے کے اختلاف کو دیکھئے، چہروں کے رنگ کے اس اختلاف کو یہ تو ظاہر ہے کہ آدمی ختم نہیں کر سکتا گوروں کو کالا اور کالوں کو گورا یا رنگینوں کو پھیکا، اور پھیکوں کے چہروں پر وہ رنگ نہیں بھرے جا سکتے جو رنگین چہروں والے کی خصوصیت ہے لیکن اسی کے ساتھ اگر چاہا جائے تو چہروں کے رنگ کے ان قدرتی اختلافات کو مخالفت کا ذریعہ بنا کر بنی آدم کو مختلف ٹولیوں میں یقیناً بانٹا جا سکتا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ آئے دن یہ کیا جا رہا ہے کتنی بے دردی کے ساتھ رنگ کے اسی قدرتی اختلاف کو خوں ریز مخالفتوں کا ذریعہ بنالیا گیا ہے پس اختلاف تو ایک قدرتی بات ہے لیکن اس قدرتی اختلاف کو ارادی مخالفتوں کا ذریعہ بنانا یہ قطعاً انسان کی ایک مصنوعی حرکت ہے قدرتی اختلاف کو بند کرنا یہ تو ہمارے بس کی بات نہیں ہے مگر ان سے ارادی مخالفتوں کی آگ بھڑکانی یہ بالکلیہ آدمی کی اختیاری چیز ہے، میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کو جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہ اس مسئلہ کا یہی اختیاری پہلو ہے بالفاظ دگر مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ معلومات یا افکار و خیالات یا اجتہادی نتائج کے اختلاف کو چاہئے کہ باہمی مخالفتوں کا ذریعہ نہ بنائیں یعنی ان ناگزیر اختلافات کو بنیاد بنا کر ایک طبقے کے دین کو دوسرے طبقے کے دین سے جدا کرنے کے جرم کے مرتکب نہ ہوں قرآن اسی جرم سے مسلمانوں کو روکنا چاہتا ہے حاصل یہ ہے کہ جن اختلافات کا مٹانا، آدمی کے بس میں نہیں ہے ان کے مٹانے یا ختم کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے اور نہ کیا جا سکتا ہے، بلکہ ان اختلافات

کو ازادی مخالفتوں اور مخاصمتوں کا یعنی ایک کے دین کو دوسرے کے دین سے جدا کرنے کا ذریعہ بنانا یہ فعل چوں کہ ہمارے اختیاری حدود میں داخل ہے، اس لئے درحقیقت اسی سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے اور منع کرنے کی چیز یہی ہو بھی سکتی ہے قرآن نے اس باب میں جو حکم دیا ہے وہ بالکل واضح اور متین ہے مثلاً ارشاد ہے۔

ولاتکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا	اور نہ بن جانا ان لوگوں کی طرح جن میں ایک دوسرے
من بعد ماجاءھم البینات واولئک	سے جدا جدا ہوئے اور مختلف ہوتے بعد اس
لھم عذاب عظیم (آل عمران)	بات کے ان کے پاس "بینات" آچکے تھے یہی
	لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں اختلفوا سے پہلے "تفرقوا" کا لفظ ہے جس سے اشارہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں اسی طرف کیا گیا ہے کہ لوگ دراصل تفرق کو پیدا کرنا چاہتے ہیں یعنی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنا چاہتے ہیں، تب اس جدائی کا ذریعہ مذہب کے اختلافات کو بنا لیتے ہیں، حالاں کہ "البینات" ان کے پاس موجود رہتا ہے۔

اسی آیت کو پیش نظر رکھ کر اسلام کا نقطہ نظر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دین کے جس حصہ کی حیثیت "بینات" کی ہو یعنی دین سے جس کا تعلق بالکل واضح اور روشن ہو، مثلاً وہ ساری چیزیں جو عمومیت کی راہ سے منتقل ہوتی ہوئی مسلمانوں میں چلی آرہی ہیں اسلام کے ساتھ ان کا تعلق اتنا واضح اتنا بین اور کھلا ہوا ہے کہ جو اسلام اور ان چیزوں کو جانتا ہے، خواہ مسلمان ہو یا نہ ہو شاید اسلام کا ان کے بغیر وہ تصور ہی نہیں کر سکتا مثلاً قرآن یا حج یا نماز رمضان کے روزے وغیرہ ان کا یہی حال ہے بہر حال ان ہی "البینات" پر متفق و متحد ہو جانے کے بعد ہدایت کی گئی ہے کہ دین کے "غیر بیناتی" حصہ کو ذریعہ بنا کر مسلمانوں کی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنے کی حرکت جدا کرنے والوں کو عذاب عظیم کا مستحق بنا دیتی ہے حاصل یہی ہوا کہ قدرتی طور پر جن اختلافات کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے ان سے نہیں منع کیا گیا ہے اور نہ ان سے منع کیا جا سکتا ہے کہ اختیاری حدود میں دا

داخل ہی نہیں ہیں بلکہ ان ناگزیر قدرتی اختلافات کو چاہتے کہ باہم ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے ممانعت کا حقیقی رخ انسان کے اسی ارادی فعل کی طرف ہو سکتا ہے اور اسی کی طرف اس کا رخ ہے بھی،

میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا کہ عہد نبوت میں ان قدرتی اختلافات کے پیدا ہونے کی گنجائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باوجود کی وجہ سے تھی ہی نہیں، تاہم اس وقت بھی اختلاف کی ایک صورت سامنے آہی گئی یعنی زبانوں کا دستور ہے کہ ایک ہی زبان کے بولنے والے کیوں نہ ہوں لیکن ان لوگوں میں بھی تھوڑا بہت لہجہ طریقہ ادا، تلفظ وغیرہ کے اختلافات پیدا ہی ہوجاتے ہیں کہنے والوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہر بارہ میل پر زبانوں کے ان اختلافات کا تجربہ کیا گیا ہے ممکن ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہو، لیکن اس مشاہدے کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ایک ہی زبان کے بولنے والوں میں مذکورہ بالا اختلافات کو ہر جگہ لوگوں نے پایا ہے، ہماری اردو زبان ہی کو دیکھ لیجئے، شمال وجنوب مشرق ومغرب کے اکثر ہندوستانی علاقوں میں یہ بولی جاتی ہے، لیکن باوجود ایک زبان ہونے کے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جنوبی ہند کے اردو بولنے والے ایک ہی لفظ کو اس طریقہ سے ادا کرتے ہیں کہ شمالی ہند والے اگر چاہیں بھی تو اس طریقہ سے اس لفظ کا تلفظ نہیں کر سکتے، اور یہی حال مختلف صوبجاتی مقامی اختلافات کا ہے۔ عربی زبان جس میں قرآن مجید نازل ہوا تھا۔ یہ زبان سارے عرب کی تھی۔ لیکن عرب کے مختلف علاقوں کے باشندوں کی زبان میں بھی وہ سارے اختلافات پائے جاتے تھے، جن سے کوئی زبان بھی ہوتی نہیں ہے۔ حجاز، یمن، نجد یا مختلف قبائل قریش بنی تمیم، قحطانی، غیر قحطانی قبائل کے اندر اس قسم کے کافی لسانی اختلافات پائے جاتے تھے، اسی سے اندازہ کیجئے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود جیسی جلیل ہستی جن کی ساری زندگی قریش میں بلکہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں گذری۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو قرآن پڑھایا تھا، لیکن نسلاً واصلاً ہذلی تھے۔ اس لئے حتیٰ کا تلفظ آخر عمر تک وہ عتیٰ کرتے رہے مسند احمد میں ہے کہ مشہور حدیث جس

میں ہے کہ تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو صفات بیان کئے گئے ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ آپ دنیا سے اس وقت تک تشریف نہ لے جائیں گے جب تک ملت عوجا، (ٹیڑھی ملت) سیدھی نہ ہو جائے۔ جس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ لوگ لا الہ الا اللہ کے قائل ہو جائیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندھی آنکھوں اور بہرے کانوں اور جن قلوب پر غلاف چڑھے ہوتے ان کو اسی کلمہ لا الہ الا اللہ سے کھول دیں گے۔ عربی میں اسی مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حتی یقیم بہ الملۃ العوجاء بان یقولو الا الہ الا اللہ فیفتح بہا اعینا عمیا واذانا صما وقلوبا غلفا۔ حضرت عطا فرماتے تھے کہ میں نے کعب احبار سے جو توراۃ کے مستند عالم اس زمانہ میں سمجھے جاتے تھے ان سے پوچھا کہ آپ کا علم ان الفاظ کے متعلق کیا ہے یعنی تورات میں یہ الفاظ کیا پائے جاتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ کعب نے اس کی تصدیق کی صرف فرق یہ نظر آیا کہ

ان کعبا یقول بلغتہ اعینا عمومی	یعنی کعب بجائے اعینا عمیا کے اعینا عمومی اور
اذانا صمومی وقلوبا غلوفی	اذانا صما کے اذانا صمومی اور قلوبا غلفا کے
مسند احمد ص۱۴۲/۲	قلوبا غلوفی کے ساتھ ان الفاظ کا اپنی لغت کی
	وجہ سے تلفظ کرتے تھے۔

درحقیقت یہ زبان کا اختلاف نہیں ہے بلکہ لہجہ کا اختلاف ہے جس کی تعبیر عطاء نے "لغت" کے لفظ سے کی ہے۔ کعب یمن کے رہنے والے تھے۔ حجازی لہجہ اور یمنی لہجہ کے فرق کا اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے "عمیا" کو کھینچ کر یمنی "عموما" اور "صما" کو "صموما"، "غلفا" کو "غلوفا" بنا دیتے تھے۔

(باقی آئندہ)

قدرتی نظامِ وحدت

(۳)

از

(جناب مولوی طفیل الدین صاحب استاذ دار العلوم معینیہ سانتھ)

حضرت براء رضؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عشا میں سورۃ "والتین والزیتون" پڑھتے ہوئے سنا ہے، میں نے آپ سے بڑھ کر اور کسی کو خوش آواز نہیں دیکھا۔[۱]

یہ ساری تفصیل آپ کے سامنے ہے، اس کاوش کا مقصد یہ ہے کہ تخفیف صلوٰۃ کا جو مطلب آج کل بعض لوگ سمجھتے ہیں وہ کس قدر غلط ہے، ان مذکورہ بالا حدیثوں سے ظاہر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں ہلکی نماز کا کیا مطلب ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے، کہ آپ ہم کو ہلکی نماز کا حکم فرماتے تھے، اور جب انھوں نے عملی مثال بیان کی تو یہ کہ آپ سورۂ صافات کے ساتھ امامت فرماتے تھے[۲]

قرات ترتیل | یہ تو ہر نماز میں آیتوں کی تعداد کے اندازہ لگانے کے لئے نقل کیا گیا ہے، علاوہ ازیں پڑھنے کا طریقہ بھی جاننا ضروری ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک پڑھنے کا کیا طریقہ اختیار فرما رکھا تھا اس سلسلہ میں سب سے پہلے قرآن کا یہ فرمان سامنے رکھنا چاہئے

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا　(مزمل۔۱)

جس کا منشاء یہ ہے کہ آپ کو ترتیل اور ٹھہر ٹھہر کر صاف صاف پڑھنے کا حکم تھا، جس کی آپ پوری پیروی فرماتے تھے، تیز پڑھنے کا کبھی بھی آپ کا معمول معلوم نہیں ہوتا ہے جس

---

[۱] مشکوٰۃ عن البخاری والمسلم باب القراۃ [۲] مشکوٰۃ عن النسائی باب ما علی الامام۔

سے قرآن پاک کے کلمات پورے طور پر ادا نہ ہو سکیں یا سننے والا اچھی طرح کلمات سمجھ نہ سکے
حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تلاوت فرماتے
وسلم اذا قرأ یقطع قرأتہ اٰیۃ اٰیۃ	تھے تو ایک ایک آیت علیحدہ علیحدہ کرکے پڑھتے
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰ الحمد	تھے، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، پھر الحمد للہ رب العالمین
للہ رب العالمین ۰ الرحمٰن الرحیم	پھر الرحمٰن الرحیم، ایک آیت کو دوسری میں نہیں
(قیام اللیل محمد بن نصر المروزی باب الترتیل فی القراۃ صلہ)	ملاتے تھے

حضرت حذیفہ رضؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، تو دیکھا آپ کی قرأت اعتدال کے ساتھ تھی، نہ پست تھی نہ بلند، رک رک کر پڑھتے اور ترتیل کا پورا لحاظ فرماتے تھے[1]

ام المومنین حضرت حفصہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأۃ کے متعلق فرماتی ہیں کہ کوئی سورۃ جب آپ پڑھتے تو ترتیل کے ساتھ پڑھتے، جس سے سورۃ لمبی سے لمبی معلوم ہوتی
حضرت ام سلمہؓ سے ایک روایت میں ہے کہ ایک ایک حرف الگ الگ کرکے پڑھتے[2]

صحابہ کرام کا معمول ان حدیثوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ آپ کے پڑھنے کا کیا دستور تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرز عمل بھی مقدار قراۃ اور ترتیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی جیسا رہا اس لیے کہ یہ حضرات سراپا سوز و عشق تھے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ ایک دفعہ صبح کی نماز میں سورۃ بقر پڑھ گئے آپ سے جب کہا گیا کہ اب تو آفتاب نکلنا ہی چاہتا تھا (مطلب تاخیر اور لمبی سورۃ کا ذکر تھا)، تو آپ نے فرمایا آفتاب سے غافل نہ تھا آپ کی مراد یہ تھی کہ اس کا خیال و انداز بھی تھا[3]

---

[1] قیام اللیل محمد بن نصر المروزی ص۵ باب الترتیل فی القراۃ [2] ترمذی ۵ جلد ۱ [3] قیام اللیل ایضاً باب الترتیل فی القراۃ ص۵۵
[3] کتاب الصلوٰۃ لابن القیم ص۱۰۱

حضرت عمر فاروق رض کا بھی کچھ یہی معمول تھا کیونکہ آپ کے متعلق آیا ہے کہ آپ فجر کی نماز میں سورۂ نحل، یوسف، ہود، یونس، بنی اسرائیل اور اسی طرح کی سورتیں پڑھا کرتے تھے[1]
حضرت علقمہؓ کہتے ہیں میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رض کے ساتھ نماز پڑھی ہے آپ قرأۃ میں ترتیل فرماتے اور صاف صاف تلاوت کرتے، اسی طرح عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق ہے کہ وہ آخری رات کی نماز میں جب قرأت کرتے تو ایک ایک حرف علیحدہ کرکے پڑھتے حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں قرآن تیز تیز نہ پڑھو جیسا شعر پڑھا جاتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ آیت وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا کی تفسیر فرماتے ہیں " بینہ تبینا " خوب صاف صاف پڑھو[2]
موقع کا لحاظ | اس تفصیل کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہمیشہ لمبی ہی قرأۃ کی جائے ضرورت اور مجبوری ہو تو اسے پس پشت ڈال دیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اطمینان کے وقت یہی سنت طریقہ معمول ہونا چاہئے۔ یوں ضرورت و مجبوری یا کسی اور ضرورت کی وجہ سے قراۃ میں کمی کی جا سکتی ہے خود ذات بابرکت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فجر کی نماز میں معوذتین تک پڑھنا ثابت ہے حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں میں آپ کی اونٹنی کی نکیل تھامے تھا کہ آپ نے معوذتین کی رغبت دلائی اور اہمیت بتائی اور پھر انھیں تعلیم فرمایا، پھر مجھے خوش کرنے کے لئے ان ہی سورتوں کے ساتھ فجر کی نماز پڑھائی اور فارغ ہونے کے بعد متوجہ ہو کر فرمایا

یا عقبۃ کیف رأیت (مشکوٰۃ باب القراۃ) اے عقبہ تو نے کیسا پایا۔

تعدیل ارکان | ان چیزوں کے ساتھ تعدیل ارکان بھی ضروری ہے، یعنی رکوع، سجود اور قیام و قعود باطمینان ادا کیے جائیں، حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سمع اللہ لمن حمدہ کہتے ہوئے سیدھے کھڑے ہو جاتے اور اس قدر اطمینان سے کھڑے رہتے کہ ہم کو خیال ہوتا کہ آپ بھول گئے اور پھر آپ سجدہ کرتے اور دونوں سجدوں کے درمیان اس طرح بیٹھتے کہ ہم کہتے تھے کہ شاید آپ کو وہم تو نہیں ہو گیا۔

---

[1] کتاب الصلوٰۃ لابن القیم صلا [2] ان سب روایتوں کے لئے دیکھئے قیام اللیل باب الترتیل فی القراۃ صلا و مسلم

حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ آپ کا رکوع، سجدہ، دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا اور رکوع سے اٹھنا یہ سب تقریبًا برابر ہوتا، سوائے قیام کے۔[۱]

حضرت انسؓ کو کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے زیادہ مشابہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی نماز دیکھی گئی اور ان کی تسبیحات رکوع و سجود کا انداز دس دس ہے[۲]

ایک دفعہ حضرت انسؓ نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز پڑھ کر لوگوں کو بتائی جس کو حضرت ثابتؓ بیان کرتے ہیں کہ ویسی نماز تم کو پڑھتے نہیں دیکھتا ہوں۔ وہ (انسؓ) رکوع سے سر اٹھاتے تو اس طرح سیدھے کھڑے ہو جاتے کہ کہنے والا کہہ اٹھتا کہ وہ بھول گئے اور پہلے سجدہ سے سر اٹھانے اور بیٹھتے تو کہنے والا کہہ اٹھتا کہ یقینا وہ آگے بھول گئے ہیں۔[۳]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے

اسوأ الناس سرقة الذی یسرق من صلوته قالوا یارسول اللہ وکیف یسرق من صلوته قال لا یتم رکوعها ولا سجودها رواہ احمد (مشکوٰۃ باب الرکوع)	لوگوں میں بدترین چور وہ شخص ہے جو اپنی نماز میں چوری کرتا ہے صحابہؓ نے پوچھا نماز کی چوری کیسی؟ آپ نے فرمایا نماز کی چوری اس کا رکوع اور اس کے سجدے پورے طور پر ادا نہ کرنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض امام تعدیل ارکان کو فرض تک کہتے ہیں، اور وجوب کا درجہ دینا تو لازمی معلوم ہوتا ہے لہٰذا یہ تمام حدیثیں سامنے رکھی جائیں اور تخفیف صلوٰۃ (ہلکی نماز) کا مطلب سمجھیں، مقتدی کے ساتھ ارکان نماز اور حقوق نماز کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ اسی لئے کہا گیا کہ امام کی ذمہ داری بہت اہم اور نازک ہے اور امام کو ضامن کہا گیا ہے اس سے اس کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں پورا اتر سکے۔

باطنی اصلاح اتنی عظیم الشان عبادت کے ظاہری احکام کی بجا آوری کی تاکید کا یہ عالم ہے بلاشبہ اس کے باطنی احکام کی اہمیت تو اور بھی زیادہ ہوگی کیونکہ اگر ظاہر کو اعضاء وجوارح کی حیثیت

---

[۱] مشکوٰۃ باب الرکوع [۲] مشکوٰۃ عن ابی داؤد باب الرکوع [۳] کتاب الصلوٰۃ لابن القیم

حاصل ہے تو باطن کو قلب کی، پھر اگر قلب ہی میں فساد پیدا ہو جائے، تو اعضاء جوارح کب تک کار آمد رہ سکتے ہیں۔ ارشاد نبوی ہے۔

الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت	سنو جسم میں ایک لوتھڑا ہے، جس کی اصلاح
صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد	سارے جسم کو صالح رکھتی ہے اور اس کا فساد
الجسد کلہ الا وھی القلب (بخاری)	کل جسم کو بگاڑ دیتا ہے اور سنو وہ "دل" ہے

اس دل پر احسان کی پوری کیفیت طاری ہونی چاہئے، جو جسم کا سلطان ہے، نماز کی حالت میں مسجد کی جماعت یہ محسوس کرے، کہ ہم رب العزت کے دربار میں اس کے روبرو کھڑے ہیں، اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے، اعمال و افعال کو بھی اور دل کی ہر ایک کھٹک کو بھی۔

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم	اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو تو اس احساس کے
تکن تراہ فانہ یراک (بخاری)	ساتھ کہ اس کو دیکھ رہے ہو ورنہ وہ تو بہر حال دیکھ رہا ہے۔

نمازی کے دل میں جب یہ یقین جاگزیں ہو جائیگا، تو وہ اللہ اکبر کہتے ہی اپنے کو قہار و جبار اور غفور و رحیم مالک کے روبرو پائے گا، اور اس کی عظمت و جلال اور اس کی رحیمی و کریمی کا پرتو اپنی طرف بڑھتے دیکھے گا، جس سے نمازی کا ظاہر و باطن اطاعت کا مجسمہ بن جائیگا اور دل نوافل کروں سے جھک اٹھے گا۔

خضوع و خشوع اسی کیفیت کا نام اصطلاح میں "خشوع و خضوع" ہے جو عبادت کی جان اور بندگی کی روح ہے، ارشاد ربانی ہے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ	ان مسلمانوں نے یقیناً فلاح پائی، جو اپنی نماز میں
صَلَاتِہِمْ خَاشِعُوْنَ (مومنون۔۱)	خشوع کرنے والے ہیں

یہ آیت بتاتی ہے، کہ خشوع گو صحت نماز کی شرط نہیں مگر قبولیت کی شرط تو بہر حال ہے چنانچہ بعض مفسرین نے اس کو لکھا ہے[1]،

---

[1] بیان القرآن جلد ۷ ص۵

خشوع کی حقیقت کیا ہے؟ ابن رجب حنبلی لکھتے ہیں

اصل الخشوع ھو لین القلب ورقتہ وسکونہ وخضوعہ وحرقتہ فاذا خشع القلب تبعہ جمیع الجوارح والاعضاء لانھا تابعۃ لہ (الخشوع فی الصلوٰۃ ص۱)	خشوع کی اصلیت دل کا نرم ہونا اور اس کا پسیجنا ہے، نیز اس کے اطمینان اور جھکاؤ اور سوزش کا نام ہے، قلب جب جھک پڑتا ہے تو سارے اعضاء و جوارح اس کی پیروی میں جھک پڑتے ہیں کیونکہ یہ سب اس کے تابع ہیں

یہ بالکل صحیح ہے کہ اعضاء و جوارح قلب کے تابع ہوتے ہیں، گویا اس جسم کی دنیا میں دل کو سردار کی حیثیت حاصل ہے جس کے صلاح و فساد کا اثر بقیہ حصوں کو قبول کرنا ناگزیر ہے اور جس کی ہر حرکت و سکون کا سایہ ایک ایک عضو پر پڑنا از بس ضروری، جیسا کہ ابھی ادپر حدیث نبوی گذری، یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ خشوع کا پہلا پرتو قلب پر پڑتا ہے جس کی طرف حضرت علیؓ نے اشارہ فرمایا

الخشوع خشوع القلب (ابن کثیر ص۲۳۸)۔ خشوع دل کا جھک پڑنا ہے۔

پھر یہ اثر دل سے اعضاء و جوارح پر پھیل پڑتا ہے، چنانچہ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ خشوع دل میں پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے آنکھیں پست ہو جاتی ہیں اور دل جھکاؤ کو قبول کرتا ہے[1] اسی علت کے پیش نظر بعض سلف صالحین فرماتے ہیں جب نمازی کو دیکھو کہ وہ اپنے جسم اور کپڑوں سے کھیل رہا ہے سمجھ لو اس کا دل خشوع کے اثر سے بیگانہ ہے[2]۔

خشوع کا حصول | نماز میں خشوع کیوں کر حاصل ہوتا ہے؟ یہ سوال گو اس زمانہ میں اہم ہے مگر جن لوگوں کو ایمان کی حلاوت نصیب تھی ان کے لئے یہ سوال کوئی خاص سوال نہ تھا ایمان کے ضعف و اضمحلال اور اخلاص و للہیت کے فقدان نے ہمارے لئے دشواری پیدا کر دی ہے ورنہ ہم جس ظاہری اہتمام کے ساتھ مسجد تک پہنچتے ہیں اتنا بھی اہتمام باطن کا ہوتا تو بھی بسا غنیمت

---

[1] ابن کثیر ص۲۳۸ [2] الخشوع فی الصلاۃ

ایمان کی تازگی اور اس احساس کے ساتھ حاضری ہو، کہ دربار الٰہی میں جہاں رب العالمین جلوہ افروز ہے کھڑے ہیں، یہ دست بستگی اسی کے سامنے ہے ہم اس کے جاہ وجلال کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور وہ ہمارے قیام و قراۃ کو ملاحظہ کر رہا ہے، ظاہر کو بھی دیکھتا ہے اور باطن کو بھی اور اللہ اکبر کہہ کر ہم نے تھوڑی دیر کے لئے دنیا کے رشتوں کی رگ کاٹ ڈالی ہے اور اپنا رشتہ مالک حقیقی کے ہاتھ میں دے دیا ہے اس کی عظمت اور کبریائی سامنے ہے اور ہم اس میں گم ہیں یہ یقین دل کی بھٹی کو تیز کر دے گا، آلائشوں، زنگوں اور میلوں کو خاکستر بنا کر کندن بنا دیگا اور رب العالمین، الرحمن الرحیم، مالک یوم الدین کے جلوؤں کے ساتھ دل اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے گا۔ اور اھدنا الصراط المستقیم پر پہنچ کر دل اور اس کا پورا حلقہ امید و بیم اور خشیت و محبت سے معمور ہو جائے گا اور ان کلمات کے ساتھ دل کے ساز کا تار تار جنبش میں آجائے گا اور نماز سے جب فارغ ہو چکے گا تو اس کی زبان پر وہی کلمات ہوں گے جو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، "جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ"

اس کے لئے جو مانع نظر آئے، اسے دفع کرنے کی کوشش کرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا، اس باب میں کسی چیز کو برداشت نہیں فرمایا، ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے سوال پہ فرمایا تھا کہ نماز میں ادھر ادھر دیکھنا۔

ھو اختلاس یختلسہ الشیطان من صلاۃ العبد (بخاری)	وہ اچک ہے جو شیطان بندہ کی نماز سے اچک لیتا ہے۔

آپ نے ایسی چیزوں سے بھی اجتناب فرمایا ہے جس سے کسی درجہ میں خلل کا اندیشہ ہو سکتا ہے، چنانچہ ایک بار حضرت عائشہؓ نے دروازہ پر ایک خوبصورت باریک پردہ لٹکا رکھا تھا آپ نے نماز شروع کرنا چاہی تو فرمایا میرے سامنے سے اپنا یہ منقش پردہ ہٹالو[1] اسی طرح ایک دفعہ بوٹیدار چادر میں آپ نے نماز ادا کی مگر نماز بعد اسے فوراً پھینک دی اور اس کی جگہ

---

[1] بخاری و مسلم کتاب اللباس

سادہ منگوالی اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس چادر نے مری توجہ ہٹا دی[1] یہ تو آپ کا اپنا حال تھا امت کو بھی اس ہدایت سے نوازا، اور ساتھ ہی ہر ایسی چیز سے اور ہر ایسے فعل سے منع فرمایا جس کو خشوع کے خلاف محسوس فرمایا مثلاً یہ کہ بھوک میں کھانا سامنے آجائے اور طبیعت کا رجحان کھانے کی طرف ہو تو پہلے کھانا کھالیا جائے، پھر نماز پڑھی جائے آسمان کی طرف دیکھا نہ جائے ادھر ادھر تاکا نہ جائے، جمائی کی نہ جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ پاخانہ، پیشاب کی خلش کے وقت فراغت سے پہلے نماز نہ پڑھی جائے[2]

استقبال قبلہ اور اس کا اثر | نماز میں استقبالِ قبلہ کا حکم اگر ایک طرف نظام وحدت کی ایک کڑی ہے، تو دوسری طرف اس میں خشوع وخضوع کا شرعی اہتمام ہے تاکہ دلجمعی پیدا ہو سکے اور ساری جماعت میں یکجہتی ہو، مختصر لفظوں میں کہا جاسکتا ہے، نماز میں دخول ظاہری طور پر افعال الجوارح اور خلاف ادب کلام باللسان کو حرام کر دیتا ہے اور نماز کی نیت جو باطنی ہے وہ باطن پر اثرانداز ہوتی ہے اور دوسرے افکار کو حرام قرار دیتی ہے جو غیر اللہ سے متعلق ہو۔ یہ وہ امور ہیں جن کا اہتمام علمائے سلف رحمہم اللہ تعالیٰ اور صحابہ کرام نے اپنے اپنے دور میں خوب ہی فرمایا اور پچھلوں کے لئے نشانِ راہ چھوڑ گئے۔

پہلوں کا خشوع | ابوداؤد شریف باب الوضو بالامام میں ایک صحابی کا ذکر آیا ہے کہ حالت نماز میں ان کو دشمن کے تیر آآکر لگتے رہے، خون بھی نکلا مگر انھوں نے نیت نہ توڑی اور برابر نماز میں اسی طرح مصروف رہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ عمر فاروق رضؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ امامت کرتے ہوئے آپ کو زخم لگایا گیا آپ کی جگہ دوسرے نے امامت کی مگر نماز میں کوئی فرق نہ آیا۔

عبداللہ بن الزبیر رضؓ کا نماز میں یہ حال ہوتا کہ بے حس وحرکت سے معلوم ہوتے دیکھنے والا کہتا یہ بے جان درخت کی لکڑی ہے جس کو ہوا ہلا رہی ہے گویا ایسی محویت ان کو نماز میں ہوتی تھی[3]

---

[1] مسلم باب کراہیۃ الصلوٰۃ فی ثوب له اعلام ۲۴۲ [2] یہ سب حدیثیں بلوغ المرام باب الخشوع میں دیکھی جائیں
[3] احکام القرآن لابن العربی سورہ مومنون

ابن سیرینؒ نماز میں جب کھڑے ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی خشیت سے ان کے چہرہ کا خون خشک پڑ جاتا تھا[۱]

حضرت مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے کہ آپ جب نماز میں داخل ہوتے تو محویت و خشیت الہٰی کا یہ عالم ہوتا کہ کوئی بھی آہٹ آپ کو سننے میں نہیں آتی[۲]

حضرت عامر بن عبد قیسؓ کے متعلق بیان ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ نماز پڑھتے ہوئے مری گردن پر خنجر چل جائے تو یہ برداشت، مگر یہ برداشت نہیں ہے کہ نماز میں دنیا کے معاملہ میں فکر کروں[۳]

حضرت سعید بن معاذؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی بھی کوئی ایسی نماز نہیں پڑھی جس میں دنیا کی فکر مرے دل میں پیدا ہوئی ہو[۴]

خوش نصیب ہیں وہ مسلمان جو اس اہتمام سے باجماعت نماز پڑھتے ہیں اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شعبہ میں پیروی کرتے ہیں۔ کہ آپ کا نماز میں یہ عالم ہوتا تھا، ایک صحابی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہیں اور آپ کا سینہ ہانڈی کی طرح جوش مار رہا ہے اور آہ و بکا کا ایک شور سا بپا ہے اس کی آواز عرش معلیٰ تک اپنا اثر قایم کر رہی ہے یہ اور اس طرح کے بیسیوں واقعات ہیں جن کی تفصیل یہاں مقصود نہیں ہے اور یہ سب کیوں نہ ہو جب کہ ساری عبادت و اطاعت کی جان یہی اخلاص ہے اَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (اعراف ۳)

اس اثر کے رسوخ کے لئے ریاکاری۔ دکھاوا، شہرت اور عزت کے سارے بت پاش پاش کر دے جائیں۔ جو راستہ کا پہاڑ ہے، اور گمراہی کا سرچشمہ، قرآن نے پکار کر کہا
فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (ماعون)

ان نمازیوں کو بڑی خرابی ہے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں اور جو اپنی نمازوں میں ریاکاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیزوں کو روکتے ہیں۔

---
[۱] کتاب الصلوٰۃ للامام احمد [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] ایضاً

جن ؟ (۲)

از

(مولانا حکیم محمد ابوذر صاحب مدرسہ عزیزیہ بہار شریف)

آیت یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ الخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنات کی جماعت میں سے بھی نبی آئے ہیں، چنانچہ بعض حضرات اسی کے قائل ہیں یہ بات کہ ہم کو ان انبیاء کا علم نہیں تو عرض یہ ہے کہ یوں بھی تمام انبیاء کرام کا علم ہی کب حاصل ہے، قرآن کریم کہتا ہے وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ. اے پیغمبر! بیشک ہم نے آپ سے پہلے بہت پیغمبر بھیجے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر آپ سے کیا گیا ہے مگر بعض ایسے بھی ہیں جن کا حال آپ کو نہیں بتایا گیا۔ لیکن بفحوائے إِنَّ اللهَ اصْطَفَى آدَمَ وغیرہ آیات جمہور سلف نبوت کو انسان کے لئے مخصوص کہتے ہیں اور آیت مذکورۃ الصدر کی تفسیر میں دو قول ہیں

پہلا قول | مِنْكُمْ جو آیت یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِنْكُمْ الخ میں وارد ہے، اس سے یہ مراد نہیں کہ جن و انس میں سے ہر ہر فریق کے رسول آئے کیونکہ مِنْ کے حقیقی معنی تبعیض کے ہیں یعنی بعض، اور کُمْ جمع کا صیغہ ہے اس بنا پر اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ بعض مجموعہ سے رسول آئے، نہ کہ ہر ہر فریق میں سے لہذا اگر ان دو جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت سے رسول آجائے، تو یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ الخ کا مصداق صحیح ہے اسی اعتبار سے دوسری جگہ ہے يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ میٹھے اور نمکین دونوں قسم کے سمندر سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں حالانکہ موتی و مرجان صرف نمکین پانی سے نکلتا ہے

دوسرا قول | یہ ہے کہ رسول کا اطلاق عام ہے اس کو بھی رسول کہتے ہیں جو رسول کے جانب مبلغ مقرر کر کے بھیجا جاتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اہل انطاکیہ کے پاس تین شخصوں کو

تبلیغ کے لئے بھیجا تھا، ان کو قرآن کریم نے رسول کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اِذْ اَرْسَلْنَا اِلَیْهِمُ اثْنَیْنِ فَکَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْا اِنَّا اِلَیْکُمْ مُرْسَلُوْنَ جب ہم نے اُن کے پاس دو کو بھیجا تو انھوں نے دونوں کو جھوٹا بتلایا پھر تیسرے رسول سے تاکید کی تو ان تینوں نے کہا ہم تمہارے طرف رسول بن کر آتے ہیں (سورہ یٰس)، جنوں کی جماعت رسول اللہ صلعم سے قرآن سن کر اپنے قوم میں بھیجی گئی تو اس کو رسول کی صفت سے تعبیر کیا گیا ہے فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ (سورہ احقاف) پھر جب قرآن پڑھا جا چکا تو وہ لوگ اپنی قوم کے پاس نذیر بن کر گئے ———— اسی طرح یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ الخ میں جنوں کے رسول سے وہ اجنہ مراد ہیں جو اپنے وقت کے نبی سے تعلیم حاصل کر کے قوم کی تبلیغ کے لئے مقرر کئے گئے تھے ————

پانچویں دلیل | پانچواں ثبوت اس امر کا کہ عوام میں جو جن مشہور ہیں ان کا کوئی وجود نہیں اور یہ کہ رسول کریم صلعم پر جو جن ایمان لائے تھے وہ انسان ہی تھے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جہنم کی نسبت فرماتا ہے فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (سورۂ بقرہ) دوزخ میں یا تو انسان ہونگے یا پھر پتھر وغیرہ آگ کو بھڑکانے والے سامان ہوں گے، اگر جن کوئی مکلف مخلوق ہے تو یوں کہنا چاہئے تھا وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْجِنُّ وَالْحِجَارَةُ الخ اس دلیل میں بھی کوئی وزن نہیں ہے اس جگہ قرآن پاک کا مقصد کفارِ عرب کو عذاب جہنم سے ڈرانا ہے کہ اے منکرو بتوں نے اصنام کی عبادت کو ذریعۂ نجات سمجھا ہے غور کرو یہ تمہیں کہاں تک نجات دلائیں گے جب کہ یہ اپنے کو بھی جہنم سے بچا نہ سکیں گے۔

یہ اس صورت میں ہے کہ "حجارہ" سے اصنام مراد ہوں اگر اس سے عام پتھر مراد ہیں تو اس صورت میں آگ کی شدت اور تیزی کو بیان کرنا مقصود ہے کہ جہنم کی آگ سے دنیا کی آگ کو کوئی نسبت نہیں ہے، اس کا ایندھن لکڑی نہیں بلکہ پتھر اور انسان ہیں یہاں معذبین جہنم کی شمار بیان نہیں کی جا رہی ہے ورنہ پھر حجارہ کے ذکر کا کیا موقع تھا، پتھر کون سا مکلف

ہے جو جہنم کے معذبین کی شمار میں بیان کیا گیا ہے ہاں جہاں جہنم کے معذبین کا شمار ہے وہاں قرآن کریم میں انسان کے ساتھ جن کا بھی ذکر ہے لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ

چھٹی دلیل | چھٹا ثبوت ان مومن جنوں کے انسان ہونے کا یہ ہے کہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چند خصوصیتوں کا ذکر فرمایا ہے جن میں ایک یہ ہے کہ میں تمام اقوام کی طرف بلا استثناء مبعوث کیا گیا ہوں اور جو مجھ سے پہلے نبی گذرے ہیں وہ صرف اپنی قوم کے طرف مبعوث ہوئے تھے، اس حدیث کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ جن جو آنحضرت صلعم پر ایمان لانے کوئی اور مخلوق تھی کیونکہ قرآن کریم صاف بتاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں سے تھے، سوال یہ ہے کہ اگر وہ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے تو ان کا موسیٰ پر ایمان لانا جائز ہی کس طرح ہو سکتا الخ

یہ استدلال بھی لچر ہے حدیث کے الفاظ یہ ہیں اما انا فارسلت الی الناس کلهم عامة وکان من قبلی انما یرسل الی قومه۔ اس میں ناس (انسان) کا لفظ ہے یعنی آپ نے باعتبار امت انسانی کے اپنی خصوصیت کا ذکر فرمایا ہے۔ کہ میں تمام انسانوں کیطرف مبعوث ہوں اور اگلے انبیاء کی بعثت انسانوں میں سے صرف اپنے قوم کی طرف ہوتی تھی انسان کے علاوہ کسی دوسری مخلوق کے طرف آپ یا پہلے نبیوں میں کوئی نبی مبعوث ہیں یا نہیں؟ اس کا اس حدیث میں کوئی ذکر ہی نہیں بنا بریں اس سے اگلے نبیوں کی انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوق کی طرف مبعوث ہونے کی نفی نہیں کر سکتے اور سورہ جن کے مومن جنوں کا یہودی ہونا ان کے انسان ہونے اور انسان میں سے بھی بنی اسرائیل ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی،

ساتویں دلیل | ساتواں ثبوت ان جنات کے انسان ہونے کا یہ ہے کہ رسول کریم صلعم کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا یہاں جنوں کو رسالت میں شامل نہیں کیا گیا، اگر جن بھی کوئی علیحدہ قوم ہیں اور ان کے لئے بھی آپ پر ایمان لانا ضروری تھا یا جائز ہی تھا تو یوں

فرمانا چاہئے تھا یا اَیُّھَا النَّاسُ وَالْجِنُّ اِنِّی رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا پس جو جن آپ پر ایمان لائے تھے وہ قرآنی تشریح کے ماتحت انسانوں ہی میں سے تھے اور اسی وجہ سے آپ پر ایمان لانے کے مکلف تھے "

یہ استدلال ایک اصولی غلط فہمی کا مظاہرہ ہے یہ اصول مسلّمہ ہے کہ کسی چیز کا ذکر نہ ہونا اس کے نفی کو مستلزم نہیں ہوتا، اگر کوئی کہے میری جیب میں قلم ہے تو اس جملہ کا مطلب کبھی بھی یہ نہیں ہوتا کہ اس کی جیب میں قلم کے علاوہ کوئی دوسری چیز موجود ہی نہیں ہے بلکہ قلم کے علاوہ دوسری چیزوں کے موجود رہتے ہوئے بھی کہہ سکتا ہے کہ میری جیب میں قلم ہے اسی طرح نبی اکرم صلعم کا انسان کے علاوہ جن کی طرف مبعوث ہوتے ہوئے بھی یہ فرمانا صحیح ہے کہ میں تمام انسانوں کی طرف مبعوث ہوں اور یہ جملہ ہرگز اس کو مقتضی نہیں ہے کہ آپ انسان کے علاوہ کسی دوسری جماعت کی طرف مبعوث نہیں ہیں، ورنہ پھر یہ دعویٰ کرنا صحیح ہو جائے گا کہ آپ صرف قوم عرب کی طرف مبعوث ہیں اس کے علاوہ کسی دوسری قوم کی طرف مبعوث ہی نہیں ہیں کیونکہ سورۃ جمعہ میں ہے ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ، اس جگہ غیر عرب کو رسالت میں شامل نہیں کیا گیا اگر آپ امیین قوم عرب کے علاوہ دوسرے انسانوں کی طرف بھی مبعوث ہیں تو یوں فرمانا چاہئے تھا ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ وَغَیْرِ الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ"، آیت یاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا میں جو عام انسانوں کا ذکر ہے تو اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ حسب تشریح قرآنی (یعنی آیت سورۃ جمعہ) ناس سے صرف قوم عرب مراد ہے اور الناس پر الف لام عہد داخل ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے قوم عرب! میں تمام اقوام عرب اور تمام قبائل عرب کی طرف مبعوث ہوں ——— لیجئے اب کیا ہے حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلعم کی نبوت تو عرب کے لئے مخصوص ہو گئی، ختم نبوت کا مسئلہ ہی درہم برہم ہو گیا۔

اس کے بعد مرزا صاحب اس طرح لب کشائی کرتے ہیں

ایک اور آیت اس مضمون کے بارہ میں اس سے بھی واضح ہے اور وہ سورہ سبا کی آیت وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ کافہ کف سے نکلا ہے جس کے اصل معنی جمع کرنے اور روکنے کے ہیں، پس آیت کے معنی یہ ہوتے کہ اے محمد صلعم ہم نے تجھے صرف اس لئے مبعوث کیا ہے کہ تو انسانوں کو جمع کرے اور کسی انسان کو اپنی تبلیغ سے باہر رہنے نہ دے۔ اب دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تجھے صرف انسانوں کو جمع کرنے کے لئے بھیجا ہے اور بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ انسانوں کے سوا کوئی اور بھی مخلوق ہے، اور وہ بھی محمد صلعم پر ایمان لانے کی مکلف ہے الخ

مرزا صاحب کی اس دلیل کی اصل یہ ہے کہ نفی کے بعد استثناء قصر کا فائدہ دیتا ہے، یعنی مستثنیٰ کے لئے حکم مخصوص ہوتا ہے اور اس کے ماسوا سے حکم کی نفی ہوتی ہے پس اس آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہوا کہ مستثنیٰ یعنی انسان کے لئے حضرت محمد صلعم کی رسالت مخصوص ہے اور انسان کے علاوہ دوسری مخلوق سے آپ کی رسالت کی نفی ہے پس انسان کے سوا کوئی مخلوق بھی حضرت رسول اللہ صلعم پر ایمان لانے کی مکلف نہیں،

مرزا صاحب کی یہ دلیل بھی ناواقفیت کی بناء پر ہے قصر کی تین قسمیں ہیں. قصر افراد، قصر قلب قصر تعین۔ قصر افراد میں متکلم کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف مستثنیٰ کے لئے ثابت ہے مستثنیٰ کے علاوہ دوسرے افراد اس حکم میں شریک نہیں ہیں مثلاً جب کسی کا یہ خیال ہو کہ بکر کو مارنے میں زید و عمر دونوں شریک ہیں، اور اس خیال کی تردید کی جائے اور کہا جائے ماضارب الا زید یہ قصر افراد ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ صرف زید مارنے والا ہے، عمر اس میں شریک نہیں ہے، قصر قلب میں متکلم کا مقصود صرف مستثنیٰ کے عکس کی تردید ہوتی ہے، مثلاً جب کسی کا خیال ہو کہ زید بیٹھا ہوا ہے اور اس خیال کی تردید میں کہا جائے مازید الا قائم، یہ قصر قلب ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ زید کھڑا ہے بیٹھا ہوا نہیں ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ قیام کے علاوہ کسی دوسری صفت کے ساتھ متصف ہی نہیں کیونکہ قیام کے علاوہ کتابت عدم کتابت علم و جہل وغیرہ میں سے کسی صفت کے ساتھ ضرور ہی متصف ہوگا، قصر تعین کی صورت یہ ہوتی ہے

کہ مثلاً مخاطب کو یہ شک ہوتا ہے کہ اس کتاب کا لکھنے والا زید ہے یا عمر، تو اس وقت متکلم کا یہ کہنا کہ ما کاتب الا زید، یہ قصر تعیین ہے چونکہ اس قصر کے ذریعہ کاتب کی تعیین ہوگئی ہے کہ زید ہے عمر نہیں ہے یہ قصر کی تین قسمیں ہوئیں، اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس مقام میں قصر کی کون قسم ہے؟ یہاں قصر افراد نہیں، کیونکہ اگر باری عز اسمہ کا اس قصر سے یہ مقصد ہے کہ آپ کی دعوت و رسالت میں انسان کے علاوہ کوئی دوسری مخلوق شریک نہیں ہے، تو یہاں کافۃ کا لفظ مہمل اور بے معنی ہوجاتا ہے بلکہ یہ مقصد وما ارسلناك الا للناس سے حاصل ہوجاتا ہے یعنی آپ کو صرف انسانوں کے لئے بھیجا ہے، انسانوں کے علاوہ کسی دوسری مخلوق کے طرف مبعوث نہیں ہیں قرآن کریم کا ایک لفظ اور ایک نقطہ بھی مہمل نہیں لہذا قصر افراد نہیں ہوسکتا۔ اور قصر تعیین بھی نہیں کیونکہ اگر انسان اور دوسری مخلوق کے درمیان آپ کی رسالت کو متعین کرنا ہے کہ آپ کی رسالت کے لئے صرف انسان ہی متعین ہے تو اس صورت میں بھی کافۃ کا لفظ مہمل ہے لہذا اب متعین ہوگیا کہ قصر قلب ہے، یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگلے انبیاء کی طرح حضرت رسول اللہ صلعم کی رسالت کسی خاص جماعت اور گروہ کے ساتھ مخصوص ہوگی اور عام انسان آپ کی دعوت میں شامل نہیں اس آیت میں اسی شبہ کی تردید ہے کہ آپ کی رسالت تمام ہی انسانوں کے لئے ہے صرف بعض انسانوں کے ساتھ مخصوص نہیں اس سے انسان کے علاوہ کسی دوسری مخلوق سے آپ کی رسالت کے تردید پہ دلالت نہیں ہوگی کیونکہ قصر قلب کے متعلق بیان ہوچکا ہے کہ اس میں صرف مستثنیٰ کے ضد کی نفی ہوتی ہے ما سوا اس کے علاوہ دیگر امور کے نفی پر دلالت نہیں کرتا یہاں مستثنیٰ جمیع انسان ہے اس کا عکس بعض انسان ہوگا لہذا یہ آیت صرف بعض انسانوں کے اندر آپکی نبوت مخصوص ہونے کی تردید ہوگی اور دوسری مخلوقات کی نفی اس کا مفہوم نہیں ہے لہذا اس آیت کریمہ کو اس ثبوت میں پیش کرنا کہ انسان کے علاوہ کوئی دوسری مکلف جماعت نہیں سراسر جہل ہے اور زبان عربی سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

مرزا صاحب نے قرآن واحادیث سے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ انسان کے علاوہ جن کوئی

اور مخلوق نہیں جو سات دلیلیں پیش کیں ان کی حقیقت واضح ہو گئی اور آپ نے دیکھ لیا کہ ان
کے دماغی جدت جدید کا قلعہ منہدم ہو کر رہ گیا ہے اس کے بعد آپ نے اس آیت کی تاویل میں جو
جن وانس کے دو مخلوق ہونے پر نص صریح ہے مسحور کن تحریف پیش کی ہے لیکن قرآن میں تحریف؟
یہ ممکن نہیں یہ وہ جادو ہے کہ سر پر چڑھ کر بولتا ہے قرآن کریم کی تحریف میں دلچسپ سے دلچسپ
انداز بیان ہی کیوں نہ اختیار کیا جائے اس کی تردید کے لئے وہ کسی غیر کا محتاج نہیں بلکہ خود ہی اس
کے طلسم کو توڑ کر پھینک دیتا ہے کیونکہ دیگر وجوہ اعجاز کے علاوہ قرآن مجید کا ایک اعجاز یہ بھی ہے
جو ارباب بصیرت سے مخفی نہیں، یعنی انا اللہ لحافظون کی صداقت! اب آیئے مرزا صاحب کی ذہنی
اپج ملاحظہ فرمایئے

والجان خلقنہ من قبل من نار السموم یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ جن کی خلقت
انسان سے جدا ہے اور یہ کہ جن کی پیدائش انسان سے قبل ہے اور اس کا مادہ آگ سے ہے
اور انسان کی پیدائش مٹی سے ہے اس سے ثابت ہوا کہ جن وانس دو الگ الگ مخلوق ہیں۔

اس کے متعلق مرزا صاحب کی تحریف یہ ہے کہ "جن کو آگ سے پیدا کرنے کا مفہوم یہ ہے
کہ اس کی طبیعت میں اشتعال و تمرد ہے" اور "انسان کو مٹی سے بنانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان
کی فطرت میں انقیاد و اطاعت ہے، عربی کا یہ عام محاورہ ہے کہ جو شے کسی کی طبیعت میں داخل ہو
اس کو خلقت سے تعبیر کیا جاتا ہے، پس جن انسان سے کوئی الگ مخلوق نہ ہوا بلکہ انسان ہی کے
وہ افراد جو متمرد و سرکش اور باغیٔ نظام ہیں جن کے نام سے موسوم ہیں ——————

یہ ہے ہمارے مرزا صاحب کی دماغی جدت لیکن یہ کلام الٰہی ہے اس میں محض دماغی جدت
طرازیوں سے کام نہیں چلتا مرزا صاحب کی یہ تفسیر قرآن کریم کے سیاق و سباق کے منافی ہے
قرآن مجید میں جن مقامات میں تخلیق آدم کا ذکر ہے اس سے پہلے حشر کا بھی ذکر ہے، قطعی طور پر
یہ روش صاف بتاتی ہے کہ تخلیق آدم کو حشر کی دلیل میں پیش کیا گیا ہے کہ بعد الموت پھر دوبارہ
زندہ کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ جب باری تعالیٰ نے پہلی مرتبہ انسان کو جو عدم محض تھا تو

سے پیدا کیا تو پھر دوبارہ پیدا کرنے میں کونسی دشواری ہے خلاصہ یہ کہ تخلیقِ آدم کو حشر کی دلیل میں پیش کیا گیا ہے لہٰذا لازمی طریقہ پر یہ ان کی تخلیقِ جسمانی کا ذکر ہے نہ کہ ان کی عادت و فطرت کا بیان، اور مٹی ان کا مادہ جسمانی ہے اور اسی کے مقابلہ میں والجان خلقنٰہ من قبل من نار السموم ہے بنا بریں متعین ہو گیا کہ یہاں جن کی آگ سے تخلیقِ جسدی ہی کا بیان ہے نہ کہ ان کی طبیعت و عادت کا تذکرہ

دوسرے یہ کہ مرزا صاحب کی اس تفسیر سے صاحب کلام کا مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے اور یہ توجیہ الکلام بما لا یرضی بہ قائلہ ہے ابلیس سے جب حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ دریافت کی گئی تو وہ کہتا ہے انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین یہاں اس نے نوعیتِ تخلیق کو اپنی افضلیت ثابت کرنے کے لئے پیش کیا ہے اب اگر خلقتِ نار سے تمرد و سرکشی اور خلقتِ طین سے انقیاد و اطاعت مراد لی جائے تو پھر یہ افضلیت کی دلیل نہ ہوگی بلکہ اپنی طرف سے رذالت و حقارت کا اقرار ہوگا کیونکہ تمرد و سرکشی اور باغی نظام ہونا کوئی خوبی کی بات نہیں بلکہ ناصیۂ شرافت کے لئے بدنما داغ ہے اس طرح آپ کی اس خود ساختہ تفسیر سے کلام کا حقیقی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

سِلسِلۂ تاریخ ملت

نبی عربی صلعم

تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں متوسط درجہ کی استعداد کے بچوں کے لئے سیرت سرور کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق، جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جدید ایڈیشن جس میں اخلاق سرور کائنات کے اہم باب کا اضافہ کیا گیا ہے اور آخر میں ملک کے مشہور شاعر جناب ماہر القادری کا سلام بہ درگاہ خیر الانام بھی شامل کر دیا گیا ہے کورس میں داخل ہونے کے لائق کتاب، قیمت عہ مجلد عہ بقیہ حصص، خلافت راشدہ عہ، خلافت بنی امیہ عہ، خلافت ہسپانیہ عہ

وزیر مامون احمد بن یوسف

(۲)

از

(ڈاکٹر خورشید احمد فارق ایم اے۔ پی ایچ ڈی)

صولی نے لکھا ہے کہ یحییٰ جب سرکاری کام سے بیرون بغداد جاتا تو یوسف اس کی نیابت کرتا تھا۔ سرکاری احکام نویسی (توقیع) جو وزیر یا خلیفہ کی مخصوص ذمہ داری تھی وہ انجام دیتا اور دفاتر کی نگرانی اعلیٰ (دواوین الازمۃ) کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں رہتی، دواوین الازمۃ تاریخ اسلام میں پہلی بار مہدی کے عہد میں ایجاد کئے گئے تھے ان کا مقصد ہر شعبہ کی الگ الگ نگرانی تھا یہ بھی دیوان التوقیع کی طرح خلیفہ یا اس کے وزیر کے زیر نظر ہوتے تھے

صولی نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے یوسف کی دفتری سیرت پر روشنی پڑتی ہے یحییٰ کے ملازم جب عرضداشتوں پر سرکاری مہر لگوا کر عرضداروں کے پاس لاتے تو ان سے انعام وصول کرتے تھے۔ یوسف کو اس کا علم ہوا تو اس نے یحییٰ سے شکایت کی۔ یحییٰ نے مہر کا کام یوسف کی نگرانی میں دے دیا، پھر کسی سے کچھ وصول نہیں کیا گیا[۱]

یوسف کی مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ بحیثیت سکریٹری اس کی تنخواہ اس کی ضروریات کے لئے ناکافی تھی اس کے اسباب دوسرے تھے: حکومت کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ عمال و کتاب اور ان دونوں سے تعلق رکھنے والوں کے قبضہ میں آجاتا تھا اور یہ لوگ بے دل کھول کر داد عیش دیتے تھے، روپیہ مفت آتا اس لئے بیدردی سے خرچ بھی ہوتا چیزوں کے نرخ چڑھ گئے تھے، کنیزوں کے رکھنے کا رواج عام تھا بڑے بڑے حرم ہوتے تھے جن میں کئی کئی آزاد عورتوں کے علاوہ متعدد کنیزیں نفس پرستی کے لئے ہوتیں ان کی خرید، داشت و پرداخت پر بہت خرچ آتا کنبے بڑے بڑے ہوتے تھے۔ لباس، گھر اور ظاہری ٹھاٹ باٹ پر بھی

---

[۱] صولی ۔ ۱۰۶

بہت زور دیا جاتا تھا اور بغیر خوش پوش خوش گھر اور پرشکوہ بنے سرکاری ماحول میں منزلت کا حصول ممکن نہ تھا۔ پھر مدح سرائی کر کے انعام وصول کرنے والے شعراء کے طائفے جمع ہوتے تھے ان کو مطمئن یا دوسرے الفاظ میں روپئے سے ان کی تعریف خریدنا یا ان کی خوفناک ہجو کا منہ بند کرنا وقت کا ایک اہم اقتصادی مسئلہ تھا اس قسم کے مالی مواقعوں سے صرف وہ لوگ بہرہ بر آ ہوتے جن کو قرب سلطانی کی وجہ سے یا تو لگی بندھی بڑی بڑی رقمیں ملتیں یا بڑی بڑی جاگیریں ملی ہوئی تھیں (جیسے خاندان عباس و علی کے معزز افراد یا شاعروں، ندیموں اور گورنروں)، یا ناجائز طریقوں سے سرکاری عہدوں کے بل بوتے پر روپیہ حاصل کرتے یوسف کو نہ تو خلیفہ سے خاندانی قربت تھی نہ وہ خلیفہ کے ندیموں، گویوں، شعراء وغیرہ میں شامل کہ کہیں روپئے کی اس کو آمدنی ہوتی اور نہ اس قدر ناخدا ترس تھا کہ ناجائز طریقے اختیار کرتا بلکہ یحییٰ کی نگرانی میں بغداد کے دفاتر کے عمال کے لئے ایسے طریقے استعمال کرنا آسان بھی نہ تھا

نتیجہ یہ تھا کہ اس کی تنخواہ اس شان و شوکت اور نفس پرستی کے معیار کے لئے کافی نہ تھی جس سے اس کا ماحول بھرا ہوا تھا صولی نے کئی موقعوں کا ذکر کیا ہے جب یوسف نے اپنی ضروریات یحییٰ یا فضل کے سامنے پیش کی تھیں۔ ایک بار تو خود احمد کی شادی کا معاملہ تھا احمد کی شادی ایک شیعی برمکی سکریٹری (متعلق برامکہ کے دفتر سے تھا) کی لڑکی سے ٹھہری تو اس کے مہر کی ادائیگی کے لیے یوسف نے یحییٰ سے اپنی دو ماہ کی تنخواہ (واجب الادا) کے ساتھ دو ماہ کی تنخواہ پیشگی طلب کی یحییٰ نے اپنے پاس سے احمد کے مہر کی رقم اور اسی قدر بطور عطیہ دے دی اور یوسف کو پچھلے دو ماہ کی تنخواہ اور اسی قدر عطیہ کا حکم لکھ بھیجا نیز یہ کہ پیشگی تنخواہ دینا خلاف ضابطہ ہے اس کے خط کے آخری الفاظ یہ ہیں: اور مجھے امید نہیں کہ جعفر (یحییٰ کا فضل سے چھوٹا لڑکا)، احمد کا بار میرے یا تمہارے اوپر ڈالنا گوارا کرے گا جس طرح فضل نے قاسم (احمد کا بڑا بھائی) کا بار ہمارے یا تمہارے اوپر ڈالنا گوارا نہ کیا تھا۔[1] غالباً شادی کے موقع پر ہی ایک دوسرے موقع پر یوسف کو روپیہ کی ضرورت ہوئی تو اس نے تین شعر لکھ کر فضل بن یحییٰ کو بھیجے فضل نے تیس ہزار درہم ارسال کئے

---

[1] صولی ص ۱۰۷

اور لکھا کہ تم زیادہ شعر لکھتے تو اسی حساب سے روپیہ بھیجتا۔[۱]

صولی نے یوسف کے چیدہ چیدہ خطوط، توقیعات اور اشعار پیش کئے ہیں اس کے ایک توقیع کا نمونہ یہ ہے، " دنیا کا ایک ظلم یہ ہے کہ وہ کسی کو بقدر حق نہیں دیتی۔ زیادہ دیتی ہے یا کم " اپنے لڑکے کو لکھا " اگر تمہاری سخاوت تمہارے جاننے والوں تک محدود رہی تو تمہارے گھر سے باہر نکلے گی جب رشید نے علی بن عیسیٰ بن ماہان کو خراسان کا گورنر مقرر کیا[۲] تو غالباً اور کئی صوبوں کے الحاق کی درخواست کی رشید نے یوسف سے کہا علی کو لکھ کر خراسان کی اہمیت اور منفعت بتا دو غالباً اس کو معلوم نہیں یوسف نے یہ الفاظ لکھے: ہم نے خراسان کا گورنر بنا کر پوری طرح تمہاری مدد کردی ہے: خراسان جب تک تم زندہ ہو تمہاری صوبیداری کے لئے کافی ہے[۳] اپنے ایک لڑکے کو لکھا: فلاں کی صحبت سے بچو اگرچہ وہ تمہارا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو کیونکہ وہ تم سے بہت متعلق ہے کبھی انسان کے جسم کا کوئی حصہ سڑ جاتا ہے تو اس کو کاٹنا پڑتا ہے۔[۴] یوسف کو ایک کنیز سے غیر معتدل شیفتگی ہو گئی کسی نے اس کو ملامت کی تو اس نے کچھ شعر کہے جن کا ترجمہ یہ ہے اس کی صورت، دلکش باتوں اور رسیلے گانے نے اس کو حسین بنا دیا ہے،

(۱) وہ رومی بادشاہ قیصر کے خاندان کی لڑکی ہے جس نے مصیبت کا مزہ نہیں چکھا اور ناز و نعمت میں پلی بڑھی۔

(۲) جب سے میرے قبضہ میں آئی ہے میں اس کا غلام ہوں حالانکہ پہلے ایسا نہ تھا۔[۵]

یوسف کے کلام میں صداقت فکر اور رقت جذبات نمایاں ہے۔

یوسف جب مرض موت میں مبتلا تھا تو یحییٰ نے اسے بلا بھیجا اس کی زبوں حیثیت دیکھ کر

---

[۱] صولی۔ ۱۵۹، [۲] یہ بنو عباس کا نہایت قابل اعتماد اور ذی اثر فوجی افسر تھا گورنر ہو کر اس نے خراسان کو اپنے واسطے خوب لوٹا کھسوٹا [۳] رشتہ ۔ اخبار الطوال، [۴] شاید اسی توقیع کا نتیجہ تھا جو علی نے خراسان کو اپنی جاگیر تصور کر لیا تھا [۴] صولی ۔ ۱۶۲ [۵] صولی ۔ ۱۶۱

یحییٰ نے کہا، تمہاری مالی حالت مجھے تمہارے مرض سے زیادہ سخت معلوم ہوتی ہے جب یوسف
گھر لوٹا تو یحییٰ نے چار لاکھ درہم بھیجے اور رقعہ میں لکھا کہ اس وقت میرے خزانہ میں زیادہ نہیں تھے
اس واقعہ کا راوی خود احمد ہے وہ کہتا ہے میرے والد کا انتقال ہوا تو ہم نے ان کی میراث میں
یحییٰ کے اس عطیہ کے علاوہ اور روپیہ نہ پایا"

جیسا کہ دستور تھا کہ جو لوگ دفتروں میں کلرک یا سکریٹری ہوتے تھے ان کے لڑکے بالعموم
ان کے ساتھ کلرکی کی ٹریننگ حاصل کرتے تھے۔ احمد اور اس کے بھائیوں نے بھی کلرکی کی
تربیت یوسف کی زیر نگرانی دفاتر میں پائی ہوگی احمد کا بڑا بھائی قاسم جو جاندمن کی شاعری کے
بے مشہور ہوا احمد کی طرح سکریٹری تھا گو اس کو اتنا عروج حاصل نہ ہوا۔ احمد کی دفتروں میں
تدریجی ترقی کے بارے میں صولی یا کسی اور نے کوئی تصریح نہیں کی جس خط میں[1] یحییٰ نے یوسف
کو احمد کے مہر کا روپیہ اور دوسرے مالی عطیوں کی خوش خبری لکھ کر بھیجی تھی اس کے آخر میں
یہ لفظ لکھے تھے: اور مجھے امید نہیں کہ جعفر شادی کے موقع پر احمد کا بار تم پر یا مجھ پر ڈالنا گوارا
کرے جس طرح فضل (بڑا بھائی جعفر کا) نے قاسم (احمد کا بڑا بھائی) کی شادی کا بار ڈالنا گوارا
نہ کیا تھا یہ تصریح اس بات کا اشارہ ہو سکتی ہے کہ احمد جعفر کے اور قاسم فضل کے دفتر میں
کسی ایسے معزز عہدے پر تھے جہاں ان کا جعفر اور فضل سے براہ راست تعلق رہتا تھا یہاں
یہ کہنا مفید ہوگا کہ جعفر اور فضل دونوں کے دفتر الگ الگ تھے اور ان کو کبھی کبھی گورنر یا
فوجی افسر کی حیثیت سے دور دراز صوبوں میں جانا پڑتا تھا اور ان کے ساتھ ان کے دفتر
ہوتے تھے اور جب دونوں کا قیام بغداد میں ہوتا تب بھی ان کے فرائض ایسے متنوع
ہوتے کہ پورے پورے عملے ان کے ماتحت رہتے تھے۔

احمد سے ہماری ملاقات خراسان کی راجدھانی مرو میں فضل بن سہلؒ وزیر مامون کا
کاتب کی حیثیت سے ہوتی ہے برامکہ[2] جو باتی رشید کے غضب کے طوفانی جھونکے میں تباہ ہو چکے

---

[1] بقول صولی ۱۸۵ھ [2] متوفی ۲۰۲ھ [3] رشید نے جعفر کو ۱۸۷ھ میں پہلے وہ اور جو اس پر قدامتا قتل کیا، یحییٰ اور فضل
کو قید کر دیا اور ان کی ساری دولت ضبط کر لی۔

ہیں اور ایسے کہ پھر کبھی نہ ابھر سکے، رشید کا طوس (خراسان) میں ۱۹۳ھ میں انتقال ہو جاتا ہے امین بغداد میں خلیفہ بنتا ہے، مامون (جو چھوٹا بھائی) مرو میں دشمنوں کی سرکوبی کی مہم پر ہے۔ امین تاج پوشی کے بعد رنگ رلیوں میں پڑ جاتا ہے جیسا کہ تاج پوشی سے پہلے تھا اس کے وزیر اور افسر فضل بن ربیع جس کی ریشہ دوانیوں کو برامکہ کی تباہی میں بڑا دخل تھا، اپنے مفاد کی خاطر امین کو اپنے بعد مامون کی خلافت منسوخ کر کے (جیسا کہ رشید نے طے کیا تھا) اپنے لڑکے کو ولی عہد بنانے کے لئے اکساتے ہیں اور وہ اس عہدنامہ کو جس پر بڑی سنگین قسمیں کھا کر اس نے دستخط کئے تھے اور جس کی شان تقدس بڑھانے کے لئے خانہ کعبہ میں ٹانگ دیا گیا تھا توڑ دیتا ہے اور اپنے کمسن لڑکے کو ولی عہد نامزد کر دیتا ہے۔ امین اور مامون میں ٹھن جاتی ہے، مامون خراسان میں ہے دشمن کا ہر وقت خطرہ ہے اس کے وسائل کم ہیں امین محفوظ و مضبوط ہے خود مامون کے الفاظ میں جن کا مخاطب فضل بن سہل ہے: "چوٹی کے افسر امین کے ساتھ ہیں بیشتر افواج اس کے حکم میں ہیں حکومت کے اکثر محصولات و خزانے اس کی گرفت میں ہیں اس نے انعامات و اکرامات سے اہل بغداد کو مسخر کر لیا ہے اور لوگ روپے پیسے کے بندے ہیں اس کے سامنے حفظ بیعت اور پاسداری عہد کی ان کو پرواہ نہیں رہتی، بے ایمانی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں" مامون ٹکر لیتے ہوئے ڈرتا ہے، لیکن فضل بن سہل جو ستاروں سے مامون کی خلافت کی بشارت پا چکا ہے اس کو خلیفہ بنانے اور خود اس کا وزیر بننے کا عزم کر لیتا ہے اور اس کے دل سے خوف و ہراس نکال کر عسکری اور انتظامی امور کی ذمہ داری ساری اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے پہلے تو خراسان میں امین کی دو فوجوں کو جن میں سے پہلی کے بارے میں بغداد کے ہم عصر مبصروں کی رائے ہے کہ "کثرت افواج، ظاہری شان و شوکت، تیز گام گھوڑوں اور ساز و سامان کے اعتبار سے بے مثال تھی شکست ہوتی ہے کام و دہان اور شہوت کے حد سے بڑھے ہوئے تقاضے بہت جلد ان پرشکوہ فوجوں کے حوصلے پست کر کے فرار پر مجبور کرتے ہیں اور جب شکست کی خبر آتی ہے تو امین اپنے محبوب خصی غلام کوثر کے ساتھ مچھلی کے

---

[1] طبری (۱۰/۱۴۸)

شکار میں ہوتا ہے اور خبر رساں سے کہتا ہے: "ابے چل ہٹ، مجھے اب تک ایک مچھلی نہیں لگی اور کوثر دو مار چکا ہے[1] اور جب ایک خیر اندیش[2] اس کو عہد شکنی اور قسم توڑنے سے روکتا ہے تو وہ قرآن و خدا سے نظر بچا کر عبدالملک کی سنت میں پناہ لیتا ہے اور کہتا ہے: "عبدالملک تجھ سے زیادہ سمجھدار اور معاملہ فہم تھا جب اس نے کہا کہ دو سانڈ ایک گلی میں نہیں رہ سکتے[3] دوسرے سانڈ کا اشارہ عبدالملک کے حریف عمرو بن سعید بن الاشدق کی طرف ہے[4]۔ پھر مامون کا جنرل طاہر بغداد پر چڑھائی کرتا ہے اور بارہ ماہ تک بغداد کے بیرونی حصوں میں خانہ جنگی ہوتی ہے اور بغداد کے بہت سے محل، نہریں اور باغات جہاں ہوا و ہوس کے دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی برباد ہوتے ہیں جب امین کے سارے وسائل ختم ہو جاتے ہیں اور گرتے ہوئے اقبال کو دیکھ کر فوجیں دغا دے جاتی اور وفاداریاں متزلزل ہونے لگتی ہیں اور خزانے خالی ہو جاتے ہیں تو وہ پکڑ لیا جاتا ہے اور اس کا سر کاٹ کر مامون کو جو مرو میں ہے بھیج دیا جاتا ہے۔

یہ واقعہ ۱۹۸ کا ہے احمد سے ہماری ملاقات مرو میں ہوتی ہے[5] گمان غالب ہے کہ جعفر اور فضل کی تباہی کے بعد اس کا تعلق مامون کے دفتر سے ہو گیا ہو گا مامون امین کی طرح ولی عہد تھا اور خراسان کے علاقے رشید کی طرف سے اس کے زیر نگیں تھے۔

جب فضل بن سہل نے امین کا سر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بولا "طاہر نے لوگوں کی تلواریں اور زبانیں ہم پر کھلوا دیں ہم نے امین کو قید کر کے بھیجنے کا حکم دیا تھا" اس نے قتل کر کے بھیجا ہے" اس پر مامون نے کہا "جو ہونا تھا ہو گیا اب طاہر کے اس فعل کی معذرت خواہی کرنے کی تدبیر کرو" فضل نے شعبۂ خط و کتابت کے ماہروں کو ایک ایسا خط طاہر کی طرف سے لکھنے کا حکم دیا جو امین کے استحقاقِ موت اور طاہر کے حق بجانب ہونے کی تصریح پر مشتمل ہو، بہت سے

---

[1] (طبری ۱۴۵/۱۰ و فخری ۱۶۰) [2] (بقول مصنف اخبار الطوال ص۳۹۵ یہ اس کا پرائیویٹ سکریٹری اسمٰعیل بن صبیح تھا) [3] (طبری ۱۴۵/۱۰) [4] (اخبار الطوال ص۳۹۵) [5] ارشاد الاریب ۱۴۳/۱ کی روایت ہے کہ احمد حملۂ طاہر کے ساتھ بغداد کے محاذ پر تھا اور امین کی شکست اور قتل کا خط جو غریب نقل ہو گا اس نے لکھا تھا بعد روایت زیادہ قوی شہادتوں کے پیش نظر در خورِ اعتنا نہیں سمجھی گئی۔

لمبے لمبے خط لکھے گئے جو فضل اور مامون کو پسند نہ آئے ضرورت عوام کو مطمئن کرنے کی تھی چند لفظوں سے ان کے زود اشتعال جذبات کا دبانا مقصود تھا اس ضرورت کے لئے چند پُر اثر اور جامع کلمے جن سے امین کا جرم ناقابل معافی ثابت ہوتا درکار تھے اس وقت احمد بن یوسف نے مختصر خط لکھ کر دیا اس میں شک نہیں کہ مخلوع (یعنی امین جو گرفتار ہونے سے کچھ دن پہلے اپنی مایوس کن حالت کے پیش نظر خلافت سے بھائی کے حق میں دست بردار ہو گیا تھا) نسب اور گوشت پوست میں امیر المومنین (مامون) کا شریک تھا لیکن چونکہ وہ دین کی مقدس گرفت اور اجماع مسلمین سے باہر نکل گیا تھا اس نے خلافت دیا اس عہد کے بارے میں خدا کا وہ فیصلہ توڑ دیا جو اس کے اور امیر المومنین کے درمیان ہوا تھا (امین اور مامون نے رشید کی زیر نگرانی اور خلافت کے قضاۃ وغیرہ کی شہادت سے پہلے امین اور پھر مامون کے خلافت کا جو عہد کیا تھا اس کی طرف اشارہ ہے) اللہ نے نوحؑ سے ان کے لڑکے کے بارے میں کہا تھا: "اے نوح یہ تمہارا عزیز نہیں ہو سکتا یہ تو نابکار آدمی ہے" اس سے ظاہر ہے کہ اللہ کی معصیت میں کوئی رشتہ یا قربت در خور اعتنا نہیں ہو سکتی اور نہ کسی رشتہ کا خدا کے حکم کے خلاف توڑنا جائز ہے میں امیر المومنین کو مطلع کرتا ہوں کہ خدا نے مخلوع کو ٹھکانے لگا دیا اور ان کے لئے حکومت استوار کر دی اور اپنا وعدہ ان کے حق میں پورا کر دکھایا اب زمین اپنے دور دراز کے سارے علاقوں سمیت امیر المومنین کے قدموں کے نیچے سر جھکائے کھڑی ہے میں امیر المومنین کی خدمت میں مخلوع کا سر یعنی دنیا اور چادر و چھڑی یعنی آخرت[1] بھیج رہا ہوں شکر اس خدا کا جس نے امیر المومنین کا حق ان کو دے دیا اور بد عہدی و بے وفائی کے مرتکب کو ذلیل کر کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو پھر جمع کر دیا اور ان کے ہاتھوں شریعت کی گرتی ہوئی عمارت کو اٹھا لیا[2]" خط دیکھ کر فضل پھڑک گیا اور احمد سے بولا: "ہم نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا" پھر اس نے اپنے منتظم و قہرمان کو بلایا

---

[1] طبری اور یاقوت کے الفاظ میں کچھ فرق ہے، میں نے یاقوت کی روایت کا اتباع کیا ہے [2] چادر اور چھڑی اور عہد خلافت کی رسمی علامتیں تھیں، اہل الذکر دونوں آنحضرت سے دست بدست منتقل ہوتی تھیں وہ چادر غالباً وہ تھی جو آنحضرت نے شاعر کعب کو انعام میں دی تھی۔ معجم الادباء ص ۲۷۲/۴، ارشاد الاریب ۱۷۲/۱

اور دوات قلم لے کر ایک رقعہ میں احمد کے لئے متعدد مکانات، فرش فروش، فرنیچر، سامان پوشش اور سبار برداری کے جانور وغیرہ کا حکم لکھ کر رقعہ احمد کے سامنے ڈال دیا اور کہا: "کل سے تم دیوان (یعنی دیوان الرسائل) میں بیٹھنا اور باقی کاتب تمہارے سامنے (بحیثیت ماتحت) بیٹھیں گے۔"[1]

مامون خلیفہ ہو گیا خراسان اور دوسرے صوبوں میں اس کی بیعت لے لی گئی اور وہ دارالسلطنت بغداد لوٹ آیا۔ احمد حکومت کا سکریٹری اول تھا جس طرح اس کا باپ یوسف یحییٰ کا نائب تھا وہ فضل کا نائب ہو گیا۔

اس کے بعد احمد سے ہماری ملاقات ۲۰۵ھ میں ہوتی ہے اس سال مامون نے جنرل طاہر کو خراسان اور مشرقی صوبوں کا گورنر مقرر کیا[2] جس وقت طاہر بغداد سے چلنے لگا تو اس نے اپنے لڑکے محمد کو نصیحت کرتے ہوئے کہا، اگر بغداد میں تم کسی کے ساتھ ربط ضبط رکھو تو احمد بن یوسف کے ساتھ رکھنا کیونکہ وہ بامروت آدمی ہے محمد کے دل کو یہ نصیحت ایسی لگی کہ باپ کو رخصت کرکے جب لوٹا تو سیدھا احمد کے گھر گیا اور بہت دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا احمد اس کا مطلب سمجھ گیا اور اس نے لونڈی کو بلا کر کھانا لانے کا حکم دیا وہ ایک بڑے تھرے میں عمدہ روٹی اور کئی رنگ کے سالن اور شیرینی لے کر آئی اور اس کے بعد کئی قسم کی پینے کی چیزیں شیشہ کے عمدہ جگوں میں خوبصورت گلاسوں کے ساتھ اس کے سامنے رکھی گئیں۔ احمد نے کہا: سردار صاحب (امیر) جو چیز آپ پسند کریں شوق فرمائیں اور اگر کل میرے ساتھ کھانا تناول فرمائیں تو بہت ممنون ہوں گا محمد جب احمد کے پاس سے اٹھا تو وہ اس کی روکھی سوکھی تواضع سے کبیدہ خاطر تھا اور اس کو اپنے باپ کی نصیحت پر تعجب ہو رہا تھا اس نے ٹھان لی کہ احمد کو رسوا کرکے رہے گا، چنانچہ اس نے اپنے سارے دوستوں اور شناسائی فوجی افسروں کو احمد کی دعوت میں مدعو کر دیا دوسرے دن صبح کو سب مل کر احمد کی کوٹھی پہ گئے احمد نے بڑے شاندار پیمانہ پر انتظامات کئے تھے

---

[1] اور خلاد الادیب ۱۶۶/۱ [2] دکتاب العبر ابن خلدون ۳/۲۵۱، طبری ۲۰۵/۲)

اور دل کھول کر اپنی فیاضی و مروت کا مظاہرہ کیا تھا۔ تکیوں، قالینوں، پردوں، لونڈوں اور لونڈیوں کی ایسی کثرت اور آن بان اس نے دیکھی کر سناٹے میں آگیا۔ احمد نے تین سو دسترخوان بچھوائے تھے جن کے ارد گرد خدمت کے لئے تین سو لونڈیاں جمع تھیں اور ہر دسترخوان پر تین سو قسم کے کھانے سونے چاندی اور چینی کے برتنوں میں چنے گئے تھے جب کھانا ختم ہوا تو محمد نے دریافت کیا: "کیا باہر کے لوگوں نے کھانا کھالیا؟ معلوم کیا گیا تو کوٹھی کے باہر جتنے لوگ تھے (محمد کے طفیلیوں میں) سب معروفِ طعام تھے۔ تب محمد نے حیران ہو کر کہا: "ابو جعفر (احمد کی کنیہ۔ خطاب احترام) تمہارے کل اور آج میں بڑا فرق ہے۔" احمد نے جواب دیا: وہ میری لڑکی تھی یہ میری فیاضی ہے۔"[1]

فضل بن سہل مامون کی تحریک پر خلافت بنو عباس سے بنو علی کی طرف منتقل کرنے کے جرم میں ۲۰۲ میں قتل ہوا۔ اس کی موت کے بعد وزارت اس کے بھائی حسن کے سپرد ہوئی حسن کی طبیعت پر بھائی کے قتل کا بڑا اثر تھا، اس کو ہر وقت خوف رہتا کہیں بھائی کی طرح کوئی اس کا خاتمہ بھی نہ کر دے اس لئے وہ وزارت سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتا تھا اس کے برخلاف مامون اس کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا اس کو عافیت و فرصت بہت کم ملتی تھی اس کا دل درباری خدمت سے اکتا گیا کچھ عرصہ بعد وہ ایک بیماری میں مبتلا ہوا اور دربار و دفتر آنے سے معذور ہو گیا اس کی حیثیت بس مشیر کی سی رہ گئی احمد بن ابی خالد جو سہل بھائیوں کی طرح عسکری تدبیری قابلیت میں یکتا تھا اس کا جانشین ہوا اور اکثر فوجی مہموں پر جایا کرتا تھا۔ بہ تصریح فخری ۲۱۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ مامون نے حسن بن سہل سے اس کے جانشین کے تقرر کے بارے میں مشورہ کیا۔ حسن نے احمد اور ایک دوسرے سکریٹری ابو عباد ثابت الرازی (رَیّ کا باشندہ) کی سفارش کرتے ہوئے کہا ان سے زیادہ امیر المومنین کے مزاج، طبیعت اور خدمت سے کوئی دوسرا شخص واقف نہیں ہے مامون نے کہا ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لیا جائے حسن کا رجحان احمد کی طرف تھا اس نے

---

[1] ارشاد الاریب ۱۹۴/۱

کہا: "اگر احمد خدمت کی پابندی کے لئے تیار ہو جائے اور لذت کی کچھ قربانی گوارا کرے تو ثابت کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ مضمون نویسی میں اس کی بنیادیں بہت گہری ہیں وہ خلقی کاتب ہے۔ بلاغت تحریر اور علمیت میں وہ ثابت سے زیادہ ہے" مامون نے اس کو اپنا سکریٹری بنالیا[1] سرکاری مراسلت اس کی نگرانی میں تھی اور سرکاری کاغذات پر احکامات اس کے قلم سے صادر ہوتے تھے جب وہ دارالانشاء (سکریٹریٹ) سے کسی سرکاری کام سے غیر حاضر ہوتا تو ثابت اس کی نیابت کرتا جیسا کہ احمد ابن ابی خالد اپنے پیش رو کی غیر حاضری میں کیا کرتا تھا[2]

قمری نے لکھا ہے کہ ابن ابی خالد کی وفات ۲۱۰ میں ہوئی اس کے بعد احمد اس کا جانشین ہوا احمد کی وفات صولی نے ۲۱۳ میں بتائی ہے اور یاقوت نے ارشاد الاریب میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کی رائے میں اس کا انتقال ۲۱۴ میں ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد تین یا چار سال مامون کا وزیر رہا احمد کی موت کا واقعہ عجیب ہے، اس سے احمد اور مامون دونوں کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے ایک روز احمد مامون سے ملنے آیا تو حسب معمول مامون انگیٹھی کے سامنے بیٹھا ہوا عود و عنبر کے دھوئیں کی دھونی لے رہا تھا اس زمانہ میں عود و عنبر بڑے لوگوں میں خوب استعمال ہوتا تھا اور شاید اس کا سب سے زیادہ مسرفانہ استعمال اس موقع پر ہوا جب مامون حسن بن سہل کی لڑکی بوران کو بیاہنے اس کی جاگیر گیا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ حسن نے قریب ایک من (ہندوستانی) عنبر کی شمعیں اس کمرہ میں جلائی تھیں جس میں مامون ٹھہرا تھا اور بارات کے کھانے پر ۲ کروڑ درہم خرچ کیا تھا[3] اس نے انگیٹھی اپنے سامنے سے ہٹوا کر مہمان نوازی اور تعظیم کے جذبہ سے احمد کے سامنے رکھوا دی احمد دھونی لینے لگا جب وہ چلا گیا تو ملازمین نے مامون سے بطور شکایت کہا کہ جب احمد کے پاس انگیٹھی لائی گئی تو اس نے کہا: "لاؤ اس مردود کو دیعنی لوٹائی ہوئی کو" نیز یہ کہ اس نے لوٹتے وقت غلام سے کہا تھا کہ خوشبو کا ایسا بخل بھی کس کام کا میرے واسطے دوسری انگیٹھی منگوا دی جاتی تو کیا

[1] احمد کے بارے میں قمری اور صولی کے علاوہ اور کسی مستند مورخ نے وزیر کا لفظ نہیں لکھا، یاقوت، طبری وغیرہ اس کو بہ حیثیت سکریٹری ہی کے عہدہ سے یاد کرتے ہیں [2] ارشاد الاریب ۱۱/۱ [3] خطیب ۳۲/۲

تھا اس شکایت کا محرک غالباً مامون کا بھائی اور جانشین معتصم تھا (۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ) اس کو احمد سے کد تھی اور مامون کو اس کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ مامون کو بہت غصہ آیا (حالانکہ مامون بنو عباس میں شاید سب سے زیادہ بردبار اور روشن دماغ خلیفہ تھا) اور احمد کی طرف سے اس کے دل میں غبار بیٹھ گیا۔ شکایت سن کر اس نے اس طرح غصہ اور جلال کا اظہار کیا: میرے بارے میں یہ الفاظ! میں ایک دن میں ایک شخص کو ساٹھ لاکھ دینار انعام دیتا ہوں (حالانکہ میرا یومیہ خرچ چھ لاکھ دینار ہے (۳۰ لاکھ روپے))[1] میں نے تو اس کی تنظیم کرنا چاہی تھی" پھر کسی دن احمد ملنے آیا[2] تو مامون پہلے کی طرح دھونی لے رہا تھا (جسم اور کپڑوں کو بسانے کے لئے) اس نے عنبر لانے کا حکم دیا بہترین قسم کے تین تین مثقال کے تین ٹکڑے لائے گئے اور دوسری انگیٹھی میں ایک ایک ٹکڑا جلا کر احمد کے سامنے رکھا گیا مامون نے حکم دیا کہ جب تک عنبر کے ٹکڑے جلیں احمد کا منہ اس کے گریبان میں بند کر دیا جائے (دھواں احمد کی ناک کے علاوہ اور کسی طرف نہ جانے دیا جائے) چنانچہ ایسا کیا گیا تھوڑی دیر تک اس نے ضبط کیا، پھر اس کی سانس گھٹنے لگی، وہ چیخنے لگا، میں مرا میں مرا[3] تب گریبان کھولا گیا۔ وہ بیہوش ہو گیا اس کا دماغ جل گیا تھا، سانس

احمد کی سیرت کے بارے میں صولی یا کسی دوسرے مورخ نے کوئی خاص تصریح نہیں کی اور ایسی تصریحات ہمیں ملتی بھی بہت کم ہیں[5]۔ اس کی مروت کا نمونہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں مروت ایک جامع لفظ تھا، اسلام سے پہلے اس کا تصور کافی وسیع تھا، فیاضی بلکہ پر اسراف فیاضی، شراب نوشی اور اس کی ترنگ میں نتائج سے بے پرواہ داد و دہش، مصائب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ، مصیبت زدہ لوگوں کی دستگیری اس تصور کے نمایاں خد و خال تھے یہ تصور اور بہت سے عربی تصورات کی طرح بذریعہ قرآن اسلام میں منتقل ہو گیا اس میں دوسرے جاہلی تصورات

---

۱ جیسا کہ صولی نے اشارہ کیا ہے، ۲ نوری ص۳۱ ۳ بعض لوگ کہتے ہیں بتصریح نوری، ۴ کہ کسی لغزش پر مامون اس سے ناراض ہو گیا تھا اس غم سے اس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ قبل از وقت مر گیا ۵ اس کی صورت و اخلاق کے متعلق خطیب ۴/۱۴۸ نے ایک نامعلوم شخص کا یہ قول جس کا مخاطب احمد ہے نقل کیا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا جسم جس کو اللہ نے بنایا ہے زیادہ حسین ہے یا تمہارا اخلاق جس میں تم نے اپنی کوشش سے چار چاند لگا دئے ہیں

کی طرح جو تغیر آیا وہ کمی زیادہ تھا کیفی کم یعنی اقتصادی و اخلاقی حالات کی موافقت سے یا تو ابھر جاتا یا نکھر جاتا یا مضمحل ہو جاتا اسلام کے بعد اموئیوں اور عباسیوں کے دور میں چونکہ مروت کے اس تصور کا پورا پورا احق ادا کرنے کے لئے ماحول سازگار تھا اس لئے یہ پوری آن بان کے ساتھ رونما ہوا احمد غالباً خصی تھا اس کی ایک شادی جس کا سولی نے ذکر کیا ہے برکی دفتر کے ایک شیعی سکریٹری کی لڑکی سے ہوئی تھی اس کے بھائی قاسم نے اپنی شاعری میں اہل بیت کی بہت مدح سرائی کی تھی حقیقت یہ ہے کہ اکثر غیر عرب لوگوں کا رجحان اہل بیت کی طرف تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ بالعموم حکومت کے میراث ہونے کے قائل تھے جیسا کہ ایرانی بادشاہت میں قاعدہ تھا کہ باپ کا مورث لڑکا ہوتا تھا اور اس تصور کے زیر اثر رسول اللہؐ کے خاندان سے زیادہ ان کی نظر میں خلافت و اقتدار کا کوئی دوسرا مستحق نہ تھا احمد کی پبلک زندگی کی بدعنوانیوں کی کوئی شکایت ہم تک نہیں پہنچی اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ اس کی پبلک زندگی کے اندرونی پردوں تک ہم نہیں پہنچے دوسری بات یہ ہے کہ رشید اور ماموں کے عہد میں گو کہ سیاسی فتنے اور خونریزیاں خوب ہوئیں بغداد کے مرکزی دفاتر نظم و ضابطے کے دائرہ سے باہر نہیں نکلے۔ پبلک زندگی کی بدعنوانیوں سے میری مراد خاص طور پر مالی بدعنوانیاں ہیں یعنی ذاتی مفادات کے لئے حکومت اور اقتدار کا استعمال جیسا کہ ہولناک شکل میں کچھ دن بعد رونما ہوا البتہ اس کی ایسی بدعنوانیاں ہمیں ملی ہیں جن میں حسن ظاہری سے متاثر ہو کر احمد نے بعض کاتب لڑکوں کو ترقیاں عطا کیں اور بڑے بڑے عطیے دے جیسا کہ ہم عنقریب دیکھیں گے۔ یہ احمد کی کوئی انفرادی خصوصیت نہ تھی، یہ ماحول کا نتیجہ تھا! اس ماحول میں حسن نسوانی (نیم نسوانی خصی لڑکے) وقت کے سب سے زیادہ حاوی اور شدید ترین جذباتی محرکات میں سے تھے عورتیں اور مرد سامان تجارت تھیں اور یہ تجارت خوب فروغ پر تھی دنیا کے اکثر ممالک اور آب و ہوا کی لڑکیاں بغداد، کوفہ، بصرہ، اور دوسرے بڑے بازاروں میں آداب معاشرت اور موسیقی کے زیورات سے آراستہ کر کے بیچی جاتی تھیں اور حسین لڑکوں کو خصی کر کے جوہر مردانیت سے ان کو زبردستی محروم کر کے کچھ جنسی تنوع کے لئے

کچھ حفاظت کے لئے، کچھ زینت خانہ کے لئے، کچھ حسن نسوانی کو ان کی رجولیت کے خطرہ سے
بچانے کے لئے کچھ شان و شوکت کے مظاہرے کے لئے رکھا جاتا تھا اس سامان تجارت کو
خریدنے اور برتنے کے لئے دولت کی افراط تھی، ایک معمولی سا شاعر ایک خوش گلو گویا ہر بڑے
آدمی سے دس پانچ ہزار روپئے بآسانی اپنی تعریف کی قیمت یا اپنی آواز کے صلہ کے طور وصول کر لیتا
اور خلفاء و زراء اور بڑے عہدہ داروں یا ان کے عزیز و اقارب سے جو گھر بیٹھے محض خونی تعلق
کی بنا پر لاکھوں روپئے ماہوار پاتے ایک اچھے شاعر اور شائستہ گویئے کا لاکھ دو لاکھ وصول کر لینا
بڑی بات نہ تھا۔ ہادی (۱۶۹ھ تا ۱۷۰ھ) کی فیاضی تو اس درجہ تھی کہ ابراہیم موصلی کے چند طرب انگیز
اشعار سن کر اس کو اپنے وکیل کے ساتھ بیت المال میں بھجوا دیا تھا کہ جو اور جس قدر چاہے لے لے
اور جب ابراہیم نے ایک لاکھ درہم (پچاس ہزار روپئے) کی تھیلیاں پسند کیں تو وکیل نے ۳۰ لاکھ
بطور رشوت لے کر ۷۰ لاکھ ابراہیم کو لے جانے دئے[1]۔ اس سے ملتی جلتی مثالیں جن میں پبلک
مالیات کو بے دریغ ہوا و ہوس انانیت اور ناموری کی خاطر لٹایا جاتا تھا تاریخ و ادب میں بکثرت
ہیں اس غیر متوازن مالداری اور حسن کے بے قید تمتع کا نفسیات پر اتنا گہرا اور ہمہ گیر اثر تھا کہ اس
سے دینی و اخلاقی اقدار کا پروان چڑھنا تو درکنار محفوظ رہنا بھی مشکل تھا خاص طور پر جبکہ خدا رسول
صحابہ اور خاندانی عمائد کی طرف سے فرض کو مباح اور مباح کو فرض بنانے کی ایک پوری شریعت
حیل اور تاویلات کی تار و پود نفس پرستی کے روح سے وجود میں آچکی ہو اس شریعت کے پیچھے
خدا ترسی اور پر خلوص روشن ضمیری کے بجائے نفس پرستی کے جذبے تھے۔

---

[1] خطیب ۱۶/۲۲۴ و طبری ۱۰/۴۶

(باقی آیندہ)

دارالعلوم دیوبند
کی
تعلیمی خصوصیات

از

(جناب سید محبوب صاحب رضوی کیٹلاگر کتب خانہ دارالعلوم دیوبند)

تعلیم جس قدر سادہ اور مختصر سا لفظ ہے اتنا ہی اہم اور روح کی گہرائی تک کو متاثر کرنے والا ہے، تعلیم محض نقوش، حروف، خطوط، آواز، بولیوں اور چھوٹی بڑی کتابوں کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسی ذہنی و دماغی اور عملی تربیت کا نام ہے جس کے ذریعہ انسان کی فطری قوت و صلاحیت کو ابھار کر سنوارنا اور منظم کرنا ہے اور انسانی جذبات وحسیات کو ایک عمدہ اور اعلیٰ نصب العین کے تحت لا کر مہذب اور شائستہ بنانا ہے۔ تاکہ نوعِ انسانی کے لئے مفید ثمرات ونتائج بروئے کار لائے جاسکیں انسان کو اس کی اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال سکھانا بہت دشوار ہے، اور جس قدر دشوار ہے اسی قدر ضروری بھی ہے، بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اگر تعلیم صرف نہ جانی ہوئی چیزوں کی واقفیت تک محدود ہو تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن اگر اسے عمل کا پابند بنا دیا جائے تو پھر اس کی دشواریاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں، ہر چند علم کی قدر دنیا کی ہر قوم کرتی ہے، لیکن علم کی نسبت مسلمانوں کا جو نظریہ ہے وہ دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے، غیر مسلم علم اس لئے حاصل کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے دنیا میں قوت وعظمت اور ترقی وبرتری حاصل کریں لیکن مسلمانوں کے نزدیک حصولِ علم ایک فرض ہے جس کو پورا کر کے مسلمان علاوہ دنیوی مفاد کے اخروی نجات بھی حاصل کرتا ہے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ یعنی ہر مسلمان مرد وعورت پر علم

حاصل کرنا فرض ہے، یہ فرضیت علم ہی کے لئے ضروری قرار دی گئی ہے اور ہر شخص پر بقدر ضرورت واجب ہے،

ہر ترقی کرنے والی قوم کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس کی ترقی کا راز اس قوم کے عوام کے تعلیم یافتہ ہونے میں مضمر ہوتا ہے، اور یہ اس وقت تک آسان نہیں جب تک تعلیم کا مفت انتظام نہ ہو صدہا برس کے تجربہ کے بعد بیسویں صدی کے بڑے بڑے ماہرین تعلیم بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عوام کی تعلیم مفت ہونی چاہئے اور جب تک یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے گا تعلیم کا عام ہونا مشکل ہے!

ہمارا قدیم نظام تعلیم | لیکن ہمارے قدیم تعلیمی نظام میں ہمیشہ سے اسی اصول پر عمل درآمد رہا ہے، چنانچہ ان مدارس میں تعلیم کا جو نہج اختیار کیا گیا تھا اس میں تعلیمی مصارف کو طلباء کے بجائے درسگاہوں کے ذمہ رکھا گیا ہے اس تعلیمی نظام میں تعلیم پر کوئی فیس عائد نہ تھی اور نہ صرف یہ بلکہ طلباء کے لئے زیر درس اور معلوماتِ عامہ کے لئے کتابوں کا انتظام بھی مفت ہوتا تھا، پھر نہ صرف یہ کہ تعلیم مفت تھی اور قیام گاہ (بورڈنگ ہاؤس) کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا تھا بلکہ نادار اور غریب طلباء کو درسگاہوں کی جانب سے کھانا کپڑا اور دوسری ضروریات کے لئے نقد وظائف بھی دئے جاتے تھے

اس کے علاوہ مدارسِ عربیہ میں حصولِ علم پر کبھی کوئی ایسی پابندی بھی عائد نہیں کی گئی جس کے ذریعہ قوم کے کچھ افراد پر تعلیم و تعلّم کے دروازے بند کر دئے گئے ہوں، بلکہ ان میں ہر وہ شخص جس کو اکتسابِ علم کا کچھ بھی ذوق ہوتا بغیر کسی رکاوٹ کے علم حاصل کر سکتا تھا، عمر اور پیشہ کی قید سے ہمارے مدارس ہمیشہ آزاد رہے ہیں اور ان میں رنگ و نسل، امیر و غریب اور آزاد و غلام کے مابین کوئی امتیازی فرق روا نہیں رہا ہے، اس بنا پر ہر شخص کے لئے خواہ وہ کسی نسل سے متعلق رکھتا ہو اور کتنا ہی کم مقدور کیوں نہ ہو بلا تکلف اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی راہیں ہمیشہ کھلی رہی ہیں، مسلمانوں کی علمی تاریخ میں بے شمار ایسے علماء و فضلاء ملیں گے جو آبائی طور پر مختلف ادنیٰ و اعلیٰ پیشوں سے تعلق رکھتے تھے۔

ادنیٰ پیشوں سے تعلیم کی پابندی اٹھانا یورپ نے درحقیقت مسلمانوں ہی سے سیکھا ہے، اور جس چیز کا سہرا یورپ کے سر باندھا جا رہا ہے اگر مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مدارسِ عربیہ ہی کا پرتو ہے البتہ عمر کی قید اٹھا دینے کا فلسفہ ابھی دنیا کو ان مدارس سے سیکھنا باقی ہے، اور گو "تعلیم بالغان" کی شکل میں اس کی داغ بیل پڑ چکی ہے تاہم حصولِ سند میں ابھی تک اس پر پابندی موجود ہے، بایں ہمہ اب وہ زمانہ زیادہ دور نہیں معلوم ہوتا جبکہ دنیا کی یونیورسٹیوں سے یہ لعنت بھی اٹھا دی جائے گی،

دار العلوم کی تعلیم | ہمارے قدیم نظامِ تعلیم کی یہی روایات دار العلوم کا طرۂ امتیاز ہیں، یہاں بھی طلباً سے تعلیمی فیس نہیں لی جاتی، مستطیع اور ضرورت مند طلباء کو دار العلوم کی جانب سے کھانا کپڑا اور نقد وظائف دئے جاتے ہیں، کتابیں اور قیام کے لئے جگہ ہر مستطیع اور غیر مستطیع طالب علم کے لئے مفت مہیا کی جاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دار العلوم کی تعلیم صرف دولتمندوں کے ساتھ مخصوص نہیں رہی ہے بلکہ غریب سے غریب شخص بھی اس کے ذریعہ سے اپنے بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر سکتا ہے اس کا فیض عام اور بقدر استعداد تام ہے۔

تعلیمی آزادی | دار العلوم ہی ہندوستان میں وہ سب سے پہلی درسگاہ ہے جس نے "آزاد طریقِ تعلیم" کو پیش کیا، اور سیاسی غلامی کی فضا میں ملت کی ذہنی آزادی کو برقرار رکھنے کی جد وجہد کی، اگرچہ یہ کام بہت مشکل تھا مگر دار العلوم نے بعونہٖ تعالیٰ اس پر عمل کر کے اس مشکل کو آسان بنا دیا، دار العلوم کی یہ وہ خصوصیت ہے جو بہت کم درسگاہوں میں پائی جاتی ہے،

دار العلوم نے برطانوی حکومت کی پیش کش کے باوجود کبھی اس کی امداد قبول نہیں کی اسی لئے وہ بہت سی ایسی پابندیوں سے آزاد رہا ہے جو سرکاری "زر امداد" کے ساتھ ساتھ آنی لازمی ہیں بعض لوگوں کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ جب حکومت دار العلوم کو گرانقدر مالی امداد دینے پر آمادہ تھی تو اس کو قبول امداد میں احتراز و انکار مناسب نہ تھا، قوم خواہ کتنی ہی فیاضی دکھائے مگر پھر بھی وہ حکومت کی بیش قرار امداد (گرانٹ) کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ان لوگوں کی نظر

غالباً اس امر پر نہیں گئی کہ مدارس عربیہ کو حکومت کے اثر سے اس لئے آزاد رکھنا ضروری ہے کہ حکومت خواہ مسلمانوں ہی کی کیوں نہ ہو جب تک وہ خالص اسلامی طرز کی حکومت نہ ہو اس کی سیاست بے لاگ اور بے غل و غش نہیں ہو سکتی، اور مدارس عربیہ کے لئے ایسی تعلیم درکار ہے جو ہر قسم کے غیر اسلامی اثر اور خارجی عمل دخل سے بالکلیہ آزاد ہو۔

آج ہماری قومی بدقسمتی سے تعلیم کا مقصد یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے کوئی اچھی اور پُرمنفعت ملازمت حاصل کر کے معقول روزی کمائی جائے گویا تعلیم کا مفہوم ہی سرے سے بدل ڈالا گیا ہے، اور "علم برائے علم" کے بجائے اب صرف حصولِ معاش کے دوسرے بہت سے ذرائع کی طرح یہ بھی ایک ذریعہ بن کر رہ گیا ہے مگر بحمداللہ دارالعلوم کے طلباء کے سامنے حصولِ علم کا یہ مقصد کبھی نہیں رہا اور ظاہر ہے کہ جس شخص کے سامنے یہ مقصد نہ ہوگا وہ یونیورسٹی کے بجائے دارالعلوم کا رخ ہی کیوں کرے گا، جس کی سند کی قیمت حکومت کی نظر میں کھوٹے سکے سے زائد نہیں ہے ایک مرتبہ صوبہ متحدہ کے گورنر سرجیمز منسٹن نے جب کہ وہ دارالعلوم کے معائنہ کی غرض سے یہاں آئے تھے دیوبند سے دور دراز کے ایک طالب علم سے سوال کیا تھا

"اتنی دور سے تمہارے یہاں آنے کا کیا مقصد ہے ؟"

طالب علم نے بے ساختہ جواب دیا کہ

"میں یہاں اس لئے پڑھنے آیا ہوں تاکہ واپس جا کر اپنے وطن کے لوگوں کی دینی خدمت انجام دے سکوں !"

دارالعلوم کے نصابِ تعلیم سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ "السنۃ مشرقیہ" کے سرکاری امتحانات "مولوی فاضل" وغیرہ کے معیار سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہے، اس لئے اگر دارالعلوم چاہتا تو حکومت سے بآسانی اپنی سند کو مولوی فاضل کے مساوی تسلیم کرا سکتا تھا مگر اس نے اپنی سند کو سرکاری محکموں کی ملازمت کے لئے "پروانۂ راہداری" بنانے کے بجائے اس امر کو زیادہ مناسب سمجھا کہ وہ طلباء میں ایسی علمی قابلیت و نضیلت پیدا کر دے

کہ لوگ اس کے طالب علم اور اس کی سند کو دیکھتے ہی یہ باور کرلیں کہ یہ کوئی کام کی چیز ہے اور یہ شخص دین کے جس کام کو اپنے ذمہ لےگا اس کو قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکےگا،

کتابوار نظامِ تعلیم | مدارس عربیہ اور بالخصوص دارالعلوم کے نظامِ تعلیم میں ایک خصوصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے یونیورسٹی نظام میں ابھی تک اس کی افادیت پر توجہ نہیں کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ "جماعت وار نظامِ تعلیم" جو عام طور پر علمی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے اس کے بجائے دارالعلوم میں "کتاب وار نظامِ تعلیم" اختیار کیا گیا ہے یعنی ہمارے مدارس میں "جماعت بندی" (کلاس سسٹم) نہیں ہے بلکہ طلبار کو تعلیمی لحاظ سے کتابوں پر تقسیم کیا جاتا ہے، اگر یہ بتلانا ہو کہ طالب علم تعلیمی استعداد کے لحاظ سے کس درجہ سے گذر رہا ہے تو جماعت کا نام لینے کے بجائے یہ کہا جائے گا کہ وہ فلاں فلاں کتاب پڑھ چکا ہے یا پڑھ رہا ہے سالانہ تعلیمی ترقی میں بھی درجات کے بجائے کتابوں ہی کا لحاظ رکھا جاتا ہے، سالانہ امتحان میں اگر طالب علم ایک یا دو کتابوں میں فیل ہو جاتا ہے اور بقیہ میں پاس تو وہ کتابیں جن میں طالب علم فیل ہوا ہے ان کتابوں کی سالانہ ترقی میں حارج نہیں ہوتیں جن میں اس نے کامیابی حاصل کرلی ہو، جن کتابوں میں طالب علم ناکام ہوتا ہے سال آئندہ میں صرف ان ہی کتابوں کا اُسے اعادہ کرنا ہوتا ہے، یہ نہیں ہوتا کہ ایک یا دو کتاب کی ناکامی کے باعث کامیاب شدہ کتابوں کے اعادہ پر بھی مجبور کیا جائے، جیسا کہ یونیورسٹی نظام میں بالعموم ہوتا ہے، اس نظامِ تعلیم کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں بہت ہی کم طلباء ایسے نکلتے ہیں جو ساری کتابوں میں ناکام ہوں اس لئے طالب علم کی نفسیات پر اس کا یہ اثر مرتب ہوتا ہے کہ اسے اپنی جزئی ناکامی کا اس شدت سے احساس نہیں ہونے پاتا جس شدت سے جماعت وار نظام کی کلی ناکامی میں ہوتا ہے، اس کا نتیجہ جہاں ایک طرف یہ نکلتا ہے کہ طالب علم میں بددلی ہونے نہیں پاتی وہیں دوسری جانب اس کی مدت اور مصارفِ تعلیم میں بھی فی الجملہ وقت اور روپیہ کی کفایت ہو جاتی ہے۔

اس کے برخلاف جماعتوار نظام تعلیم میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ امتحان میں فیل ہو جانے کی وجہ سے بعض طلباء میں ایسی بے رغبتی اور بددلی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تعلیم ہی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو امتحان کی ناکامی محنتی اور غیور طلباء میں خطرناک نتائج تک پیدا کر دینے کا باعث بن جاتی ہے، اور طالب علم اپنے آپ کو شرمندگی سے بچانے کے لئے خودکشی تک کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے،

کتاب وار تعلیمی نظام میں بالعموم ان میں سے کوئی بات پیش نہیں آتی، ذیل میں ۷۵-۱۳۷۴ھ سے ۸۵-۱۳۸۴ھ تک دارالعلوم کے دس سال کے امتحان کے نتائج کا گوشوارہ پیش کش ہے گوشوارہ کے تعداد طلباء کے خانہ میں طلباء کی وہ تعداد درج ہے جو شروع سال میں موجود ہوتی ہے، دارالعلوم میں داخلہ شوال میں ہوتا ہے اور امتحان سن آئندہ کے شعبان میں، درمیان میں طلباء کی تعداد کم وبیش ہوتی رہتی ہے ——— اس کے بعد کے خانہ میں جو تعداد درج کی گئی ہے وہ شعبان میں سالانہ امتحان کے زمانہ میں موجود طلباء کی ہے۔

ناکام طلباء کی تعداد میں وہ طلباء بھی شامل ہیں جو عین امتحان کے زمانہ میں بیمار ہو گئے یا امتحان کے دوران میں کسی وجہ سے غیر حاضر رہے ——— نتیجہ فی صد میں ان سب کو شامل کر لیا گیا ہے، اگر ان کو محسوب نہ کیا جائے (جیسا کہ اصولاً ضروری ہے) تو کامیابی کا معیار اور زیادہ بڑھ جائے گا!

گوشوارہ بر صفحہ آئندہ

نتائج امتحان کا دس سالہ گوشوارہ

نمبر شمار	سن	تعداد طلباء	شریک امتحان	کامیاب	ناکام	نتیجہ فیصد
۱	سنہ ۱۳۵۰ھ	۱۹۴۲	۱۰۰۶	۸۷۳	۱۳۳	۸۷
۲	سنہ ۱۳۵۱ھ	۱۱۴۰	۱۱۳۸	۱۰۶۹	۶۹	۹۴
۳	سنہ ۱۳۵۲ھ	۱۰۹۰	۱۰۰۰	۹۲۶	۷۴	۹۳
۴	سنہ ۱۳۵۳ھ	۱۱۴۲	۱۰۱۳	۸۶۱	۱۵۲	۸۵
۵	سنہ ۱۳۵۴ھ	۱۱۱۴	۱۰۷۶	۸۶۰	۲۱۶	۷۱
۶	سنہ ۱۳۵۵ھ	۱۱۹۶	۱۰۱۴	۸۵۳	۱۶۱	۸۴
۷	سنہ ۱۳۵۶ھ	۱۲۲۶	۱۰۷۶	۱۰۰۴	۷۲	۹۳
۸	سنہ ۱۳۵۷ھ	۱۴۱۶	۱۲۵۵	۱۱۶۶	۸۹	۹۳
۹	سنہ ۱۳۵۸ھ	۱۴۹۳	۱۱۹۸	۱۱۲۱	۷۷	۹۴
۱۰	سنہ ۱۳۵۹ھ	۱۴۲۲	۱۲۳۱	۱۱۴۸	۸۳	۹۳

دس سال کے ان نتائج میں کامیابی کا عام معیار ۸۴ سے ۹۴ فیصد ہے البتہ سنہ ۱۳۵۴ھ میں ۷۱ فیصد تک گر گیا ہے اس کا خاص سبب یہ ہے کہ وبائی امراض کی کثرت کی وجہ سے بیشتر طلباء امتحان میں شرکت نہیں کر سکے۔

امتحان | یہ کہنا تو آسان نہیں ہے کہ مدارسِ عربیہ میں امتحانات کا طریقہ عموماً مروج تھا، تاہم بعض مدارس کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ اُن میں طلبہ کا سالانہ امتحان لیا جاتا تھا، چنانچہ بیجاپور کی تاریخ بستان السلاطین میں وہاں کے مدارس کے حالات میں لکھا ہے کہ :-

"امتحان بتاریخ سلخ ذی الحجہ می شد"

یعنی ذی الحجہ کے ختم پر طلباء کا امتحان ہوتا تھا، ایک دوسری جگہ اسی کتاب میں امتحان کے سالانہ ہونے کی بھی تصریح ہے لکھا ہے :-

"ہر سال امتحان می شد" (بحوالہ نظام تعلیم و تربیت ص ۱۴۱ ج اول)

مگر قیام دارالعلوم کے قریبی زمانہ میں یہ رواج متروک ہو چکا تھا اور مدارس عربیہ میں سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان کا طریقہ جو طالب علم کی استعداد و محنت و جانفشانی کے اندازہ کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ ہے مروج نہیں تھا طالب علم جب استاد سے ایک کتاب پڑھ چکتا تو اس سے مافوق دوسری کتاب بغیر امتحان لئے شروع کرا دی جاتی تھی، ظاہر ہے کہ اس میں طالب علم کی استعداد کے جانچنے اور پرکھنے کا کوئی موقع نہ تھا، اور بسا اوقات ناقابل طالب علم بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا تھا، دارالعلوم نے اس نقص کو محسوس کرتے ہوئے اس طریقہ کو ختم کر کے سہ ماہی ششماہی اور سالانہ امتحان کو لازمی قرار دے دیا۔

دارالعلوم میں امتحان کے سلسلہ میں جو قواعد مروج ہیں وہ فی الجملہ یونیورسٹیوں کے امتحانات سے زیادہ سخت ہیں یونیورسٹی کے امتحان میں ایک مضمون سے متعلق متعدد سوالات ہوتے ہیں، اور ہر سوال کے نمبر متعین ہوتے ہیں، نیز طالب علم کو اس کا حق بھی ہوتا ہے کہ جواب کے لئے ان میں سے اپنی مرضی کے مطابق سوالات کا انتخاب کرے، پورے سوالات کے جوابات دینے لازمی نہیں ہوتے، لیکن دارالعلوم کے امتحان میں ہر کتاب سے متعلق ۳ سوال ہوتے ہیں اور ہر پرچہ میں تینوں کا حل کرنا اس لئے لازمی ہوتا ہے کہ تینوں کے نمبر مشترکہ ہوتے ہیں اگر ایک سوال بھی چھوڑ دیا جائے تو طالب علم فیل ہو جاتا ہے، کامیابی

کے نمبروں کا معیار ۸۰ فی صدر رکھا گیا ہے جو یونیورسٹیوں کے ۳۳ فی صد سے کہیں زیادہ ہے البتہ اگر کسی کتاب میں اس معیار سے کم نمبر مل سکے ہوں تو اس صورت میں طالب علم کو مافوق کتاب پڑھنے کی اس شرط کے ساتھ اجازت مل جاتی ہے کہ اس کتاب میں مکرر ساونہ امتحان دے کر کامیابی حاصل کرتی ہوگی، گویا یونیورسٹی کی موجودہ اصطلاح میں اس کو کمپارٹمنٹ سمجھنا چاہئے۔

اس کے علاوہ یونیورسٹی کے امتحان کے پرچوں میں بعض کتابوں کے گروپ بھی مقرر کردئے جاتے ہیں مثلاً دو مضمون کی کتابیں ساتھ ساتھ ایک گروپ میں شامل کردی جاتی ہیں اور دونوں میں مجموعی طور پر کامیابی کے نمبر حاصل کرنے ہوتے ہیں جو کم از کم ۳۳ فی صد ہونے چاہئیں، اب خواہ دونوں میں نمبر برابر ہوں یا کم و بیش، مثلاً ایک میں ۲۰ اور دوسری میں ۱۳ تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا، اس میں یہ سہولت ہے کہ طالب علم کو دونوں کتابوں میں سے اگر کسی ایک کتاب سے بھی مناسبت ہے تو دوسری میں معمولی شُد بُد سے بھی کام نکل جاتا ہے

مادری زبان میں تعلیم | دارالعلوم کی ایک اور خصوصیت جو قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ یہاں درس و تعلیم کی زبان اردو قرار دی گئی ہے جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، کتابیں عربی زبان میں ہیں، مگر اساتذہ کی تقریریں اردو میں ہوتی ہیں علوم و فنون کی تعلیم میں مادری زبان کو جو اہمیت حاصل ہے اس کو یونیورسٹی کے نظام تعلیم میں بڑی مدت کے بعد سمجھا جا سکا ہے یہ حقیقت ہے کہ علمی مسائل جس آسانی سے مادری زبان میں سمجھ میں آتے ہیں اور حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں وہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے، مگر انگریزی اقتدار کے غلبہ نے قوم کے دماغوں کو اس قدر متاثر اور مغلوب کر دیا تھا کہ وہ ایک عرصہ تک اس حقیقت کا سراغ نہ پا سکی ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن اور جامعہ ملیہ دہلی نے محسوس کیا اور اس پر عمل درآمد شروع کر دیا جس میں دونوں جگہ نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، اور انھوں نے دوسری یونیورسٹیوں کے لئے ایک قابلِ تقلید

مثال پیش کردی ہے، اور اب تو ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی جانب سے یہ مطالبہ عام ہوتا جا رہا ہے کہ ان میں ذریعۂ تعلیم مادری زبان قرار دی جائے، عثمانیہ یونیورسٹی نے اس سلسلہ میں دار الترجمہ قائم کرکے انگریزی اور عربی وفارسی کی بہت سی کتابوں کے ترجمے کراکر اردو کے علمی سرمایہ میں بیش قرار اضافہ کر دیا ہے اسی طرح جامعہ ملیہ نے بھی اس سلسلہ میں قابل تعریف کام انجام دیا ہے۔

بہر حال اس سلسلہ میں اولیت کا سہرا دار العلوم ہی کے سر ہے، ہمارے اکابر کی دوررس نظروں نے جس چیز کو سو سال پہلے سمجھ لیا تھا بیسویں صدی کے ماہرین تعلیم بھی بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہوئے ہیں،

اردو کی اشاعت و ترویج | یہ تو اس مسئلہ کا تعلیمی پہلو تھا، لیکن اس کے علاوہ اس کا ایک لسانی پہلو بھی ہے وہ یہ کہ دار العلوم میں اردو کے درسی زبان ہونے سے اردو کو جو عظیم الشان فائدہ پہنچا ہے گو اس پر اردو کے ترقی واشاعت کے حلقوں کی ابھی تک نظر نہیں گئی ہے تاہم اس کے نتائج وثمرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ ہے کہ دار العلوم چونکہ عالم اسلامی کے مسلمانوں کی مرکزی درسگاہ ہے اور اس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علاوہ مختلف ممالک کے طلباء تحصیلِ علم کی غرض سے آتے ہیں جو اپنے دورانِ قیام میں خاصی اردو سیکھ جاتے ہیں، چنانچہ چند سال کی بات ہے کہ ایک صاحب جنہوں نے مختلف ممالک کی سیاحت کی تھی دار العلوم میں آئے تھے وہ کہتے تھے کہ "میں جب بخارا پہنچا جو وسط ایشیا کا مشہور مقام ہے تو وہاں ایک ایسے شخص سے میری ملاقات ہوئی جس نے مجھے ہندوستانی سمجھ کر ہمدردانہ لہجہ میں اردو میں مجھ سے گفتگو کی، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستان سے اس قدر دور اتنی صاف اردو اس کو کیوں کر آئی ہوگی، میرے دریافت کرنے پر اس نے تبلایا کہ "یہ دار العلوم کا فیض ہے،" اور میں ہی نہیں بلکہ یہاں کا علمی حلقہ بالعموم اردو سمجھتا اور بولتا ہے اس شخص نے نہایت اخلاق اور محبت سے مجھے اپنے یہاں مہمان ٹھہرایا اور میرے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دی، جس کی یہ خصوصیت

میں کبھی نہیں بھولوں گا کہ اس میں جس نے بھی تقریر کی وہ میری خاطر سے اردو میں کی۔"

غرض کہ اس طرح دارالعلوم نے اردو کے دائرہ کو اپنے طلباء کے ذریعہ دنیا کے تقریباً تمام ایشیائی ممالک تک وسیع کر دیا ہے،

تربیت اخلاق دارالعلوم کی یہ خصوصیت بھی اسے دوسری درسگاہوں سے ممتاز کرتی ہے کہ وہ محض ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں ہے جس میں صرف قوت ادراک کو تیز کر دینے پر اکتفا کیا جاتا ہو، بلکہ وہ اسلامی آداب و اخلاق، ذہن و فکر، تہذیب نفس اور تعمیر سیرت کی ایسی تربیت گاہ بھی ہے جس میں رہ کر طالب علم اسلامی تہذیب و معاشرت سے قریب تر اور اس کا خوگر ہو جاتا ہے، اور صرف دارالعلوم سے علمی ہی استفادہ نہیں کرتا بلکہ اساتذہ کے پاکیزہ اخلاق اور ان کی روحانیت سے بھی اثر پذیر ہوتا ہے نیز زندگی کی جد و جہد میں ایثار و قربانی، تحمل و جفاکشی، خود اعتمادی، امانت و دیانت کی عادت مخلوق الٰہی کی خدمت اور بڑے سے بڑے مصائب کو برداشت کرنے کا عادی بن جاتا ہے، تاکہ اپنی مخصوص صلاحیتوں سے اس مقصد کو پورا کر سکے جو علماء کے لئے نہایت ضروری ہے، فضلائے دارالعلوم کی یہ وہ خصوصیت ہے جس کو دیکھنے والا ان میں محسوس کر سکتا ہے!

مصارف کا حل اس موقع پر دارالعلوم کی اس خصوصیت کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ دارالعلوم کے اس تعلیمی نظام کو چلانے کے لئے سب سے بڑا اور اہم مرحلہ اس کے مصارف کا مسئلہ تھا سلاطین و امراء جو دارالعلوم کے قیام سے پہلے درس گاہوں کی سرپرستی کیا کرتے تھے ان کا دور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ختم ہو چکا تھا، اور امراء کا جو گروہ باقی رہ گیا تھا اس کا موجودہ حکومت کے زیر اثر ہونا لازمی تھا، ادھر دارالعلوم کو حکومت کے اثرات سے بچانا ناگزیر تھا اور امراء کی شرکت سے حکومت کے اثرات کے نفوذ کا قوی اندیشہ تھا، ایسے مایوس کن اور ہمت شکن حالات میں اکابر دارالعلوم کی دُور بین و دوررس نگاہوں نے بروقت اس نزاکت کا احساس انگیز جائزہ لیا اور انھوں نے امراء کے بجائے جن پر اب تک ایسے کاموں کا مدار تھا عوام کی جانب ہاتھ بڑھایا اور

"قطرہ قطرہ بہم شود دریا" کی عملی مثال قایم کردی، اس سے قبل "اجتماعی اصول پر" مدارس و انجمن قایم کرنے، چندہ جمع کرنے، سالانہ رودادیں شائع کرتے اور عوام کو بصورت جلسہ جمع کرکے عملی نتائج دکھلانے کے طریقے سے لوگ واقف نہ تھے، دارالعلوم نے یہ مثالیں پیش کرکے ملک اور قوم کے لئے ایک نئی زندگی کا آغاز کر دیا،

واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم کی اس مثال نے ملک کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیا، حصولِ سرمایہ کے لئے ہندوستان میں یہ پہلا تخیل تھا جو عملاً کامیاب ثابت ہوا، اس نسخہ کیمیا کا ہاتھ آنا تھا کہ جا بجا اس کے اتباع و تقلید میں مدارس جاری ہونے شروع ہو گئے چنانچہ قیام دارالعلوم (سنہ ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۷ء) کے چھ سات ماہ بعد سہارنپور میں مظاہر علوم اسی اصول پر قایم ہوا، اور پھر رفتہ رفتہ جگہ جگہ مدارس جاری ہو گئے، عام قومی چندے کی یہ کامیاب ترکیب ایسی عمدہ اور سہل تھی کہ ہر جگہ اس پر عمل کیا جا سکتا تھا چنانچہ آگے چل کر یہ طریقہ اس قدر کامیاب اور مقبول ثابت ہوا کہ چند ہی سالوں میں مدارس عربیہ سے متجاوز ہو کر اسکولوں، کالجوں، انجمنوں اور دوسرے اداروں تک عام ہو گیا دارالعلوم کے قیام کے آٹھ نو سال بعد ۱۸۷۵ء میں علی گڈھ کالج بھی اسی اصول پر قایم ہوا، اور پھر جوں جوں اس نظریہ کا تجربہ عام ہوتا گیا، لوگوں کی ہمتیں بڑھتی گئیں، اور آج بے شمار قومی اداروں کی اساس اسی نظریہ پر قایم ہے، حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم کے اس تخیل کی کامیابی نے آج قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں ایک انقلابِ عظیم برپا کر دیا ہے، اس بارے میں تمام ادارے جو عام چندوں پر قایم ہیں دارالعلوم ہی کے مرہونِ احسان ہیں،

دارالعلوم نے چندہ کا جو نظام قایم کیا وہ نہایت آسان اور سہل تھا، چنانچہ سال اول جو روداد شائع کی گئی اس میں چندہ کے بارہ میں یہ تصریح کر دی گئی تھی کہ "چندہ کی کوئی حد نہیں ہے (یعنی ایک پیسہ کا بھی چندہ دیا جا سکتا ہے) اور نہ چندہ میں مذہب و ملت کی کوئی خصوصیت ہے" چندہ کے لئے نقد ہونا بھی ضروری نہ تھا بلکہ غیر منقود اشیاء، کھانا، کپڑا، کتابیں وغیرہ دوسری چیزیں بھی دی جا سکتی تھیں، چندہ میں یہ توسیع بہت مفید، کارآمد

نذازہ سے بڑھ کر تحیر خیز ثابت ہوئی، اس سہولت کے ماتحت جو لوگ نقد چندہ دینے کی گنجائش نہ رکھتے تھے ان کو بھی کسی نہ کسی طرح شرکت کا موقع مل گیا، جو دارالعلوم کے لئے بہرحال مفید ثابت ہوا۔

چندہ دہندگان کے اس اطمینان کے لئے کہ اُن کے چندہ کا مصرف کیا ہے اور اس سے کیا عملی نتائج برآمد ہو رہے ہیں اس امر کے اظہار و اطلاع کے لئے دارالعلوم نے ابتداء قیام سے سالانہ روداد کی اشاعت کو ضروری قرار دیا ہے، جو پورے التزام کے ساتھ ہر سال شائع کی جاتی ہے بیک شبہ کا ازالہ خواجہ الطاف حسین صاحب حالی نے حیات جاوید میں مدارس عربیہ کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "جوں جوں "تہذیب الاخلاق" مدرسۃ العلوم (علی گڑھ کالج) کی طرف لوگوں کو بلاتا تھا اور جس قدر وہ انگریزی تعلیم کی ضرورتیں اُن کے ذہن نشین کرتا تھا اسی قدر مدارس اسلامیہ قایم کرنے کا جوش مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا چنانچہ اُسی کی تحریک سے بے شمار اسلامی مدرسے ہندوستان میں قایم ہو گئے اور برابر ہوتے چلے جاتے ہیں"

خواجہ صاحب نے مدارس عربیہ کے قیام کا یہ ذکر "تہذیب الاخلاق" کے نتائج کے عنوان کے تحت کچھ اس انداز سے کیا ہے جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ مدارس عربیہ کے قیام کا باعث "تہذیب الاخلاق" کی دعوت کا ردعمل تھا، وہ جوں جوں قوم کو انگریزی تعلیم کی طرف بلاتا تھا، لوگوں میں مدارس عربیہ کے قایم کرنے کا جوش بڑھتا جاتا تھا، یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟ اس کے لئے مدارس عربیہ کے قیام" اور تہذیب الاخلاق" کے جاری ہونے کی تاریخ کا جان لینا کافی ہوگا، حیات جاوید میں خود خواجہ صاحب نے لکھا ہے

یکم شوال ۱۲۸۷ھ مطابق ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو اُس کا تہذیب الاخلاق، نمبر اول شائع ہوا، اور پہلی بار شوال ۱۲۸۷ھ سے رمضان ۱۲۹۳ھ تک یعنی پورے چھ سال برابر نکلتا رہا، (حیات جاوید ص ۱۳۳ حصہ اول)

دارالعلوم ۱۵ر محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء میں قایم ہوا اس کے منتہی چھ ماہ کے بعد سہارنپور میں مظاہر علوم کا قیام عمل میں آیا، اور چند ہی سال میں دیوبند اور سہارنپور کے علاوہ مقامات میں ... میرٹھ، امروہہ، مرادآباد، لکھنؤ اور گلاوٹھی وغیرہ مقامات میں مدارس عربیہ قائم ہو گئے اور پھر رفتہ رفتہ تقریباً سارے ہندوستان میں دیوبند کی تقلید میں عربی کے مدارس جاری ہو گئے۔

ادبیات

"انسان اور ذرّے"

(ایک مشاہدہ)

(جناب شمس نوید صاحب)

مہر کی کرنوں نے جھانکا روزنِ دیوار سے
روشنی کی لاٹ پہ ہونے لگی ذروں کی جنگ
ایک اک افتاں و خیزاں وحشیانہ جست میں
کر رہا تھا دوسرے کی وسعتِ پرواز تنگ
سب کی خواہش تھی کہ ان کرنوں کا مرکز دیکھ لیں
راستوں کے فرق سے لیکن ما نظروں کو تنگ
ایک بڑھتا تھا تو پیچھے پھینک دیتا تھا کوئی
یک جہت ہونے کا پہلو بن گیا میدانِ جنگ
کوششِ منزل رسی تھی حائلِ منزل رسی
ایسی گمراہی کہ خود گمراہیوں کی عقل دنگ
کاش میں کہتا کہ نادانو! خبر بھی ہے تمہیں؟
خود تمہارا خوابِ منزل کھا گئی اندھی ترنگ!
دیکھتے تو ہو کے روشندانِ آب و گل کے پار
سامنے منزل ہے — سورج مرکزِ صد نور و رنگ

کس طرح کہتا مگر بالکل یونہی انسان بھی
لڑ رہے ہیں جب "اتو ہی نور" پہ ذروں کی جنگ!

تبصرے

تجدید تصوف و سلوک از مولانا عبدالباری صاحب ندوی تقطیع متوسط ضخامت ۴۹۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد صہ، ملنے کا پتہ:۔ مولوی سعید الباری شبستان قدم رسول ہارڈنگ روڈ لکھنؤ۔

حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سلسلۂ دیوبند کے اکابر علماء و مشائخ میں سے تھے۔ مولانا کی ذات شریعت وطریقت کی جامع علوم ظاہریہ و باطنیہ کی حامل اور شریعت و تصوف کے اسرار و رموز اور حکم و مصالح کی مبصر تھی اور اس حیثیت سے جہاں تک اصل دین کی تنقیح و توضیح اور مسلمانوں کی فکری و عملی اصلاح کا تعلق ہے جتنا فیض آپ سے پہنچا غالباً اس عہد میں اتنا کسی سے نہیں پہنچ سکا حضرت مرحوم کے قلم سے شریعت وطریقت کے غوامض و اسرار اور دینی مسائل واحکام پر سینکڑوں کتابیں نکلیں اور گھر گھر پھیلیں علاوہ مستقل تصنیفات کے آپ کے ملفوظات وارشادات بھی خود ایک مستقل درسِ حکمت و اخلاق ہوتے تھے غرض کہ مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی و عملی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو حضرت مرحوم کی بناضی و حکمت اندوزی کے فیض سے محروم رہ گیا ہو۔ ان کتابوں کو پڑھ کر اور حضرت کے فیض صحبت سے مستفید ہو کر ہزاروں مسلمان مرد وعورت بدعات و رسوم سے تائب ہوگئے سیکڑوں نے تصفیہ قلب و تزکیہ باطن کی دولت پائی اور ایک کثیر تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو فلسفہ جدیدہ اور دوسرے مغربی علوم کی تعلیم اور ان میں غلو کے باعث سرے سے خدا اور مذہب سے ہی منکر تھے وہ بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دامن سے وابستہ ہو کر خالص اہل سنت والجماعت کے عقاید کے پابند ہوگئے ان خصوصیات کے باعث امت مرحومہ نے آپ کو حکیم الامۃ کا لقب دیا تھا اور مولانا پورے طور پر اس کے مستحق تھے جیسا کہ عرض کیا گیا۔ دینی عقائد وافکار۔ اخلاق و معاشرت، تعلیم وارشاد، سلوک و تصوف ان میں سے اسلامی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر مبصرانہ تحقیق و تنقید کے ساتھ مولانا

نے گفتگو فرمائی ہو۔ اور رسوم و بدعات کے جو تو بہ تو حجابات ان کی اصل حقیقت پر پڑ گئے تھے
ان کو اٹھا کر امر حق کی نقاب کشائی نہ کی ہو لیکن چونکہ مولانا کا انداز بیان ایک بڑی حد تک منطقیانہ
اور قدیم اسلوب تحریر کے مطابق تھا اور پھر یہ سب چیزیں مخلوط و مزدوج تھیں اس لئے ضرورت تھی
کہ مذاق حال کا کوئی صاحب قلم ان کو مہذب و مرتب کر کے مختلف عنوانات کے ماتحت ان کی تبویب
کر کے شائع کرتا بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس اہم دینی اور علمی کام کے لئے مولانا کے ہی ایک مرید
باصفا جناب مولانا عبدالباری ندوی نے کمر ہمت باندھی اور محنت شاقہ کے بعد اس سلسلہ میں
موصوف نے چار کتابیں مرتب کر ڈالیں حقیقت یہ ہے کہ اس کار بزرگ و اہم کے لئے موصوف
سے بڑھ کر کوئی دوسرا شخص موزوں و مناسب نہیں ہو سکتا تھا۔

زیر تبصرہ کتاب اس سلسلہ تصنیفات کی دوسری کڑی ہے جو بوجوہ چند اشاعت میں پہلی
کتاب سے مقدم ہو گئی ہے۔ اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے تصوف کی تعریف اس کی اصل
حقیقت اور اہمیت و ضرورت اور اس کے تمام نظری اور عملی پہلوؤں پر نہایت بسط و تفصیل سے
گفتگو کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ مختلف خارجی اسباب و علل اور غیر اسلامی اثرات کے باعث
اصل اسلامی تصوف میں کہاں کہاں رخنے پڑ گئے تھے اور حضرت مولانا نے کس طرح ان رخنوں کی
نشان دہی کر کے ان کی اصلاح و تجدید کی ہے اس کتاب کو پڑھ کر اصل اسلامی تصوف جس کو حدیث
میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی شکل و صورت منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے واقعہ یہ ہے کہ جامعیت
مباحث، معلومات اور پھر شگفتگی بیان و زبان کے اعتبار سے اردو میں تصوف و سلوک پر اب
تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی حق تعالیٰ فاضل مرتب کو ان کی سعی کا اجر جزیل عطا فرمائے کہ واقعی اس
دور ضلالت میں انھوں نے ایک اہم دینی خدمت اس کامیابی کے ساتھ انجام دی۔"

فاضل مرتب کا مولانا مرحوم کے متعلق مجدد بلکہ جامع المجددین ہونے کا بھی دعویٰ ہے لیکن
ہمارے نزدیک یہ صرف ایک لفظی اور عنوانی بحث ہے کیونکہ مولانا کی جو دینی خدمات ہیں وہ بجائے خود
مسلم ہیں پھر چونکہ اس حصہ میں مجدد کی تعریف کیا ہے؟ تجدید کا کیا مقام ہے؟ مجدد کے لئے کن

صفات کی ضرورت ہے ان چیزوں میں سے کسی پر کوئی گفتگو نہیں ہے اس لئے اس کتاب کے تبصرہ میں ہم بھی اس پر کوئی کلام کرنا نہیں چاہتے البتہ " جامع المجددین " نامی حصہ کے مطالعہ کے بعد اس پر گفتگو ہو سکتی ہے ۔ بہرحال یہ کتاب اسلامی تصوف و سلوک کی انسائیکلو پیڈیا ہے اور عوام و خواص ہر ایک کے مطالعہ کے لائق ہے ۔

نور الرحمٰن | تقطیع متوسط ضخامت ۲۰۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد تین روپئے پتہ :- اردو بک ڈپو بہجراؤں ضلع مرادآباد

مولانا شاہ عبدالرحمٰن صاحب موحد لکھنویؒ تیرھویں صدی ہجری کے مشہور صاحب حال و قال بزرگ تھے آپ کا خاندان عرب سے منتقل ہو کر سندھ میں آباد ہو گیا تھا مولانا شاہ عبدالرحمٰن صاحب طلب علم اور مزارات اولیائے کرام کی زیارت اور ان سے اکتساب فیض کے شوق میں وطن سے روانہ ہوتے اور آخر کار ہندوستان کے طول و عرض میں عرصہ دراز تک سیاحت کرنے کے بعد لکھنؤ میں آکر مقیم ہو گئے اور باطنی ارشاد و ہدایت کا فیضان عام کر دیا جس سے مسلمانوں کو عموماً اور بعض ہندوؤں کو بھی بڑا فائدہ پہنچا حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد آپ کے مرید خاص مولوی نور اللہ صاحب نے حضرت کے سوانح و حالات اور ملفوظات و ارشادات پر انوار الرحمٰن کے نام سے ایک کتاب فارسی زبان میں لکھی تھی لیکن چونکہ اب فارسی کا مذاق مفقود ہوتا جاتا ہے اور پھر اصل فارسی نسخہ عام طور پر دستیاب بھی نہیں ہوتا تھا اس لئے مولوی نور الرحمٰن صاحب بی۔اے (علیگ) نے جو غالباً اسی خانوادہ سے وابستہ ہیں افادہ عام کی غرض سے انوار الرحمٰن کا ملخص اردو ترجمہ خود اپنے نام سے بطور براعت استہلال کے شائع کر دیا ہے حضرت شاہ صاحب کے حالات سوانح ایک مستقل درس اخلاق و حکمت ہیں جن کے مطالعہ سے آنکھوں میں نور اور قلب میں سرور پیدا ہوتا ہے ۔ البتہ کلمہ طیبہ کی تشریح اور وحدت الوجود کی حقیقت کے متعلق حضرت شاہ صاحب کا جو بیان اس میں درج ہے وہ عوام کے کام کا ہرگز نہیں اور خواص میں بھی چند خاص اہل فن ہی اس کی نکتہ آرائی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ ترجمہ اس قدر صاف سلیس اور شگفتہ دلچسپ ہے

کہ کتاب شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر اسے ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا امید ہے کہ مسلمان عموماً اور ارباب ذوق خصوصاً اس کتاب کے مطالعہ سے جو ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے فائدہ اٹھائیں گے۔

مضامین سید سلیمان ندوی مرتبہ مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری | مولانا سید سلیمان ندوی

ہندوستان کے نامور محقق اور عالم اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جو اسلامیات کے علمی ذخیرہ میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں مولانا کا قلم تقریباً نصف صدی سے علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہے اس طویل مدت میں مستقل تصنیفات کے علاوہ آپ کے قلم سے سینکڑوں متفرق مقالات و مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں جو مختلف رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں ان مضامین کی علمی و ادبی اہمیت کا تقاضا تھا کہ ان کو بھی جمع کرکے یک جا شائع کیا جاتا۔ زیر ترتیب کتاب اسی سلسلہ کی ایک کوشش ہے جو بہر حال مستحسن ہے لیکن مولانا کے مقالات کی گوناگونی اور اہمیت اس امر کی مقتضی تھی کہ مقالات شبلی کی طرح ان مقالات کو بھی کتابت و طباعت کے زیادہ اہتمام کے ساتھ مختلف عنوانات کے ماتحت تقسیم کرکے شائع کیا جاتا اور یا مولانا کی مدت تصنیف کو چند ادوار پر تقسیم کرکے ہر دور کے مضامین کو الگ الگ حصوں میں چھاپا جاتا جس سے ایک ناقد کو یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ عمر اور تجربہ کی ترقی کے ساتھ خود صاحب تصنیف کے مذاق تحریر۔ اور دوسرے تصنیفی مضامین میں کیا کیا ترقی ہوتی گئی ہے علاوہ مقالات کے خود معارف کے شذرات ہی اگر مرتب کرکے شائع کئے جائیں تو کئی ضخیم جلدوں میں آئیں گے لیکن یہ بہت فرصت طلب اور اطمینان سے کرنے کا کام ہے موجودہ حالات میں یہ جو کچھ ہو گیا ہے با غنیمت ہے۔

REGISTERED No. D148.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسنِ خاص: جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپے یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے۔ ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین: جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے، نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ برہان بلا کسی معاوضہ کے پیش کیا جائیگا۔

۳۔ معاونین: جو حضرات اٹھارہ روپے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائیگا۔

۴۔ احبّاء: نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبّاء میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا۔ اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائینگی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لیے ہے۔

قواعد رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دے دیں ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب امور کے لیے ۲ آنے کے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ [illegible]

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

[illegible] اسلام میں غلامی کی حقیقت :۔ جدید اڈیشن
جس میں ضروری اضافے کئے گئے ہیں۔ [illegible] مجلد [illegible]

تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔ اسلام کے اخلاقی اور
روحانی نظام کا دلپذیر خاکہ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

سوشلزم کی بنیادی حقیقت :۔ اشتراکیت کے متعلق پروفیسر
کارل ڈیل کی آٹھ تقریروں کا ترجمہ۔ [illegible] مجلد [illegible]

ہندوستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ [illegible]

[illegible] نبی عربی صلعم :۔ تاریخ ملت کا حصہ اول جس
میں سیرت سرورِ کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک
خاص ترتیب سے یکجا کیا گیا ہے جدید ایڈیشن جس میں
اخلاق نبوی کے اہم باب کا اضافہ ہے۔ [illegible]

فہم قرآن جدید اڈیشن۔ جس میں بہت سے اہم اضافے
کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے اس
موضوع پر اپنے رنگ کی بے مثل کتاب۔ [illegible] مجلد [illegible]

غلامانِ اسلام۔ اسّی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے
کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی
بیان جدید ایڈیشن۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط
محققانہ کتاب جدید اڈیشن جس میں حک و فک کے بعد
اضافے کئے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دلنشین
بنایا گیا ہے۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

[illegible] قصص القرآن حصہ اول :۔ جدید ایڈیشن حضرت آدمؑ
سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات تک [illegible] مجلد [illegible]

وحی الٰہی۔ مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب۔ [illegible] مجلد [illegible]

بین الاقوامی سیاسی معلومات۔ یہ کتاب ہر لائبریری میں رہنے
کے لائق ہے جدید اڈیشن جس میں نہایت اہم تازہ ترین اضافے
کئے گئے ہیں حجم پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے اور [illegible] تک کی
تمام بین الاقوامی معلومات آگئی ہیں۔ پانچ روپئے۔

تاریخ انقلاب روس۔ ٹراٹسکی کی کتاب کا مستند اور
مکمل خلاصہ جدید ایڈیشن دو روپئے

[illegible] قصص القرآن حصہ دوم، حضرت یوشعؑ سے حضرت
یحییٰؑ کے حالات تک۔ [illegible] مجلد [illegible]

اسلام کا اقتصادی نظام :۔ وقت کی اہم ترین کتاب
جس میں اسلام کے نظامِ اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش
کیا گیا ہے۔ تیسرا اڈیشن [illegible] مجلد [illegible]

مسلمانوں کا عروج اور زوال۔ جدید ایڈیشن [illegible] مجلد [illegible]

برہان

جلد بست و پنجم — شمارہ (۲)

اگست ۱۹۵۰ء مطابق شوال المکرم ۱۳۶۹ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

نہرو لیاقت معاہدہ کے بعد سے اب تک اگرچہ بھارت اور پاکستان میں کہیں کوئی بڑا واقعہ سننے میں نہیں آیا اور اس معاہدے کے بہت سے خوشگوار نتائج کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ کہنا دوپہر کے چمکتے سورج سے انکار کرنا ہوگا کہ اس سے دونوں ملکوں کی اقلیت میں اطمینان و اعتماد پیدا ہو گیا ہے اور اب ان میں خوف و ہراس یا مستقبل کی طرف سے بے چینی و مایوسی کا احساس نہیں رہا ہے جیسا کہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے دونوں ملکوں میں آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری ہے کسی دن آنے والے کم ہوتے ہیں اور کسی دن جانے والے اور یہ تعداد سینکڑوں کی نہیں بلکہ روزانہ ہزاروں تک کی ہوتی ہے پھر اس بات کو بھی فراموش نہ کیجئے کہ اب جو ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں اقلیتی فرقے کے لوگ پہنچ رہے ہیں وہ ہنگامی حالات کی وجہ سے ایسا نہیں کر رہے ہیں کیونکہ اب یہ ہنگامی حالات ہیں ہی نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر اور آخری فیصلہ کر کے بلکہ ان میں بہت سے وہ ہوں گے جنھوں نے دوسرے ملک میں جہاں وہ آ رہے ہیں پہلے سے اپنی رہائش اور معاش کا انتظام کر لیا ہوگا اس بنا پر زمانۂ امن میں اقلیت کی ایک ملک سے دوسرے ملک میں حرکت زمانۂ فساد کی نقل و حرکت سے بھی کہیں زیادہ خطرناک اور تشویش انگیز ہے اور اگر دن رات یہی رہے تو دونوں حکومتیں مانیں یا نہ مانیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عملاً خود بخود آبادی کا تبادلہ ہو جائے گا۔ اور دونوں ملک دو مستقل دشمن کیمپوں میں منتقل ہو جائیں گے۔

خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا ہو لیکن اگر ایسا ہوا تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس چھوٹے سے براعظم کا حشر وہی نہ ہوگا جو آج کوریا کا ہو رہا ہے۔ یہ ملک بھی ایک ہی تھا جنگ عظیم دوم کے اثرات نے اس کو جنوبی کوریا اور شمالی کوریا کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ تقسیم کا طبعی نتیجہ منافرت و عداوت باہمی ہوتا ہی ہے چنانچہ ملک کے دونوں منقسم حصوں کے لوگوں میں بدمزگی، تلخی اور دشمنی پیدا ہو جانے

کی وجہ سے آئے دن جھڑپیں ہونے لگیں اور شدہ شدہ ان کا یہ انجام ہوا کہ دونوں فریق ایک دوسرے
سے میدانِ جنگ میں دست و گریباں ہوگئے اب سوچئے کہ بھلا کس کا ہوا؟ تو واقعہ یہ ہے کہ ان
میں سے بھلا کسی کا بھی نہیں ہوا بلکہ دونوں نے اپنے اوپر تباہی اور بربادی کو مسلط کر لیا ہے۔ جیت
اگر ہوگی تو روس کی یا امریکہ کی ہوگی۔ کوریا کا حال تو یہ ہے کہ ایک مہینے کے اندر اندر پچاس لاکھ سے
زائد انسان گھر سے بے گھر ہوکر ایک وقت کی روٹی تک کو محتاج ہوگئے ہیں۔ ہزاروں خاندان بے چشم
و چراغ ہوگئے۔ صنعتی و حرفتی ادارے دم کے دم میں کھنڈر بن گئے اور ہری بھری آبادیاں چشم زدن
میں ویرانوں میں تبدیل ہوگئیں۔ بس جو اسباب کوریا کی تباہی کے تھے وہ بھی ہندوستان میں پیدا ہو
رہے ہیں اور جن ہاتھوں نے لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دے کر ایک دوزخ بنا دیا
وہی ہاتھ یہاں بھی مصروفِ عمل ہیں۔

نہرو لیاقت معاہدہ جس جذبۂ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے اچھا ہونے
میں کلام نہیں لیکن سچ یہ ہے کہ اگر بھارت اور پاکستان کی حکومتیں فرض شناس اور صاف و سادہ
مطالباتِ فرض کی عملی تکمیل و تعمیل میں جری و بیباک ہوتیں تو اس معاہدہ کی چنداں ضرورت ہی نہ تھی
کیونکہ اعلان و دستور کے مطابق ہندو پاکستان کا اور مسلمان بھارت کا شہری ہے اور اس بنا پر
ہر حکومت کا فرض ہے کہ قطع نظر اس سے کہ دوسرے ملک میں کیا ہو رہا ہے وہ اپنے ملک کے
شہریوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے اگر ذرا باریک نگاہی سے غور کیجئے تو صاف
معلوم ہوگا یہ معاہدہ تو کھلی اس بات کی نشانی اور اس حقیقت کا کھلا ہوا اقرار ہے کہ دونوں حکومتیں
بحیثیت حکومت کے اپنا فرض ادا کرنے میں قاصر رہی ہیں اور اس نے معاہدہ کی آڑ لے کر دونوں
اپنے گناہوں کو چھپانا چاہتی ہیں۔ دو شخص ایک گناہ میں شریک ہوکر جس طرح ایک دوسرے کی پردہ پوشی
کرتے ہیں اسی طرح ان دونوں حکومتوں نے بالواسطہ اقرارِ جرم کرکے اپنے جرم کے لئے ایک عذر پیدا
کیا ہے۔

اس طرح خونِ ناحق کا تیز رنگ دونوں حکومتوں کے دامن پر پھیلا ہوا نہیں ہے تو اس کی صداقت

بیٹھے گی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ دونوں ملکوں کی اقلیتوں کی بے اعتمادی و بے چینی کے اسباب قطعاً نفسیاتی ہیں اور جب تک ان کا تدارک نہیں کیا جائے گا اعتماد بحال نہیں ہو سکتا ان اسباب کا تدارک اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا اور جس کا بار بار اعلان کیا گیا ہے ایمانداری اور پوری سچائی کے ساتھ اس پر عمل بھی کیا جائے اور دونوں کو صاف اور دماغ کو پاک کر کے ٹوٹتے ہوئے دلوں کو پھر سے جوڑنے کی مخلصانہ جدوجہد کی جائے جہاں تک اس عمل اور اس کی ضرورت کا تعلق ہے دونوں حکومتوں کا فرض یکساں اور برابر ہے لیکن ہمارے نزدیک پاکستان کا فرض اور اس معاملہ میں اس کی ذمہ داریاں بہ نسبت بھارت کے اور بھی کہیں زیادہ ہیں اور اس کے وجوہ یہ ہیں۔

---

(۱) ہندوستان کی تقسیم ارباب پاکستان کے مطالبہ اور ان کے اصرار پر ہوئی ہے اس لئے تقسیم سے جو خرابیاں بدمزگیاں اور تلخیاں پیدا ہوگئی ہیں پاکستان کا فرض اولین ہے کہ وہ ان کا تدارک اور ان کی اصلاح کرے

(۲) پاکستان میں ہندو صرف ایک کروڑ ہیں لیکن بھارت میں مسلمانوں کی تعداد ۴½ کروڑ ہے اگر ایک کروڑ وہاں برباد ہوئے تو یہاں ان سے ساڑھے تین گنا زیادہ برباد ہو جائیں گے۔

(۳) بھارت ایک وسیع اور زرخیز و آباد ملک ہے اس لئے ہندوؤں کو بھارت میں آکر آباد ہونا اس سے کہیں زیادہ آسان ہے جتنا کہ بھارت کے مسلمانوں کا پاکستان میں پہنچ کر آباد ہونا۔

(۴) پاکستان کو اسلامی حکومت کہا گیا ہے اس لئے ہندوؤں کا اس سے بدظن ہونا خصوصاً مولانا ... وغیرہ کے مطالبہ کے بعد۔ ایک بالکل نفسیاتی چیز ہے۔ اسلام بے شبہ ایک مکمل نظام عدل و انصاف ہے لیکن ایک غیر مسلم کے دل میں اس حقیقت کا اعتراف آپ اپنے عمل سے ہی جاگزیں کر سکتے ہیں۔

(۵) پاکستان کی تعمیر و قیام میں بھارت کے مسلمانوں کا بہت بڑا دخل ہے اس لئے پاکستان کا شرعی، اخلاقی اور انسانی فرض ہے کہ اگر کچھ اور نہیں تو کم از کم اس حق کی منت شناسی کے طور پر ہی وہ اپنے یہاں کے ہندوؤں کی ہر طرح دلجوئی کرے۔

(۶) پاکستان نے اپنے آپ کو اسلامی حکومت کہا ہے اس لئے اب اگر پاکستان میں کوئی جور و ظلم یا ناانصافی کا واقعہ پیش آتا ہے تو اس سے اللہ، اللہ کے رسول، دین حق کی بدنامی اور رسوائی ہوتی ہے اور یہ ناقابل معافی گناہ ہے جس کی پاداش کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

کہتے ہیں بدی سے بدی پیدا ہوتی ہے اگر یہ سچ ہے تو اس سے کہیں زیادہ سچ یہ ہے کہ نیکی سے نیکی پیدا ہوتی ہے پہلی چیز کا تجربہ کرتے ہوئے تین سال بیت گئے تو کیا اب ایک عظیم الشان اور نہایت ہولناک عالمگیر طوفان انقلاب کی آمد سے پہلے اپنی یکجائی حفاظت کے لئے یہ مناسب نہ ہوگا کہ دونوں حکومتیں نیکی سے نیکی کا بھی تجربہ کر دیکھیں۔

تدوین حدیث

(۷)
محاضرۂ چہارم

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن حجاز سے نکل کر جب عرب کے دوسرے علاقے اور قبائل میں پہنچا تو تلفظ و لہجہ اور اسی قسم کے لسانی اختلافات جن کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا، نمودار ہوئے۔ اس قسم کے غیر اصولی اختلافات میں ہر ایک دوسرے کے اختلاف کو برداشت کرنے کی اپنے اندر صلاحیت اور گنجائش پیدا کرے اس مسئلہ میں مسلمانوں کی عملی تربیت کا موقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہی اختلافات کی بدولت مل گیا جو قرآنی الفاظ کے تلفظ وغیرہ میں پیدا ہو گئے تھے، ایسے عجیب و غریب اور دلچسپ واقعات اس سلسلے میں پیش آئے قدرتی ناگزیر اختلافات کو ارادی مخالفت و مخاصمت[1] اور تفرقہ و جنگ کا ذریعہ بنا لیا اس بد عادت کے جاہل عرب میں عموماً عادی تھے معمولی ناقابل لحاظ اسی قسم کے غیر اہم اختلافات کی بدولت خدا جانے کتنی خونریزیاں ان میں ہو چکی تھیں، کسی قسم کا اختلاف جو ان کے لئے ناقابل برداشت تھا، بلکہ ان میں جو زیادہ ذکی الحس صاحب عزم و ارادہ ہوتے تھے وہی ان اختلافات کے قصوں کو آگے بڑھانے اور ان کی آگ کو ہوا دینے میں سب سے آگے آگے نظر آتے تھے۔ آج کل بھی جیسے دیکھا جاتا ہے کہ اسی قسم کے قدرتی اختلافات مثلاً رنگ و نسل کے اختلافات یا دوسری مادی بنیادوں پر جو اختلافات جیسے ہیں مثلاً وطن اور زبان کے اختلافات ان میں سب سے زیادہ

ظاہر ہے کہ چہروں پر کسی کی کھال کا رنگین یا بے رنگ ہونا یا کسی شخص کا بجائے دوسرے کے فلاں خاندان میں پیدا ہو جانا یہ اس کے اختیار کی بات نہیں ہوتی اسی طرح زمین کا کرہ جو واقع میں ایک ہے اس کی ملکوں اور اقلیموں میں تقسیم صرف ایک زمینی اور وہمی تقسیم ہے، کسی دریا پہاڑ یا اسی قسم کی چیز کو (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

حسب لینے والے اور فتنہ و فساد کی آگ کا ایندھن ان ہی معصوم اختلافات کی لکڑیوں کو بنانے والے زیادہ تر دہی ہوتے ہیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کے قومی احساسات زیادہ بیدار اور زندہ ہیں، وہی قوم کے لیڈر بن کر قوم کو جنگ و جدال قتل و قتال کی جہنم میں جھونکتے رہتے ہیں۔

خیر ہوا یہ کہ جب قرآن کے پڑھنے میں اس قسم کے اختلافات عہد نبوت میں رونما ہوئے تو شروع میں بڑی گڑبڑ پیدا ہوئی۔ اسی سلسلہ میں خود حضرت عمرؓ بعد کو اپنا یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ

ہشام بن حکیم نماز میں سورۂ فرقان پڑھ رہے تھے میں نے جو کان لگایا تو دیکھا کہ بہت سے حروف کو وہ اس طریقہ سے ادا کر رہے ہیں جس طریقہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھایا تھا، اس حال کو دیکھ کر میرا جی تو چاہا کہ نماز ہی میں اچھل کر اس شخص کو دبوچ لوں، لیکن پھر ٹھہر گیا (یعنی نماز میں مشغولیت کی وجہ سے اتنی دیر کے لئے ٹھہر گیا) جب ہشام نے سلام پھیرا تو میں نے معاً اپنی چادر اس کے گلے میں ڈالی اور پوچھنے لگا کہ تجھے اس طریقہ سے قرآن کس نے پڑھایا ہے جو اس وقت تم کو میں نے پڑھتے سنا ہشام نے جواب میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پڑھایا ہے۔

میں نے ہشام سے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے بھی یہی سورہ پڑھی ہے آپ نے قطعاً اس طریقہ سے مجھے نہیں پڑھایا جس طرح تم پڑھ رہے تھے۔ یہ گفتگو تو ان دونوں کے درمیان ہوئی حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سرحد قرار دے کر فرض کر لیا جاتا ہے کہ زمین کا جو حصہ اس پہاڑ یا دریا کے اس پار ہے وہ اس حصہ سے جدا ہو گیا اور جو اس پار ہے پہاڑ یا دریا کا وجود تو واقعی ہوتا ہے لیکن یہ کہنا کہ اسی پر فلاں ملک ختم ہو جاتا ہے ایک فرضی بات کے سوا اور کیا ہے اسی طرح الفاظ اور معانی میں کھلی ہوئی بات ہے کہ کوئی واقعی تعلق نہیں ہوتا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ پانی کو پانی کہا جائے لیکن فرض کیجئے کہ اسی پانی کا نام کوئی آگ رکھ دے تو واقعہ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے بلکہ بہت سے لوگ ٹھنڈک پہنچانے والے پانی کو آب بھی کہتے ہیں مگر لوگوں نے ان ہی مفروضہ اصطلاحات کو اس زمانہ میں شدید قومی کشتیوں اور عداوتوں کی بنیاد بنا کر جو کچھ کیا وہ ہمارے اور آپ کے سامنے ہی ہوا

ے میں نے یہ ترجمہ حضرت عمرؓ کے الفاظ کلدت ان اساورہ کا کیا ہے۔ دیکھو جمع الفوائد صفحہ ۱۹ ج ۲

میں نے اسی حال میں کھینچتے ہوئے اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر کیا اور عرض کرنے لگا کہ یا رسول اللہ میں نے سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے اس شخص کو پایا۔ ایسے حروف کے ساتھ یہ پڑھ رہا تھا جن کے ساتھ آپ نے یہی سورہ مجھے نہیں پڑھائی ہے،

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری گفتگو سن کر پہلے تو مجھے حکم دیا کہ ارسلہ (تم اس کو یعنی ہشام کو چھوڑ دو) اس کے بعد ہشام کی طرف خطاب کر کے فرمانے لگے کہ

"ہشام تم سناؤ کیا پڑھ رہے تھے"

حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ جس طریقہ سے نماز میں ہشام اس سورہ کو پڑھ رہے تھے، ان ہی حروف کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنانا شروع کیا جب ان کا پڑھنا ختم ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہشام کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے ہیں۔

هكذا انزلت — اسی طرح یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔

پھر میری طرف (یعنی حضرت عمرؓ کی طرف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ

"عمر! اب تم پڑھو"

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حسب ارشاد میں نے بھی ان ہی حروف کے ساتھ جن کے ساتھ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا تھا پڑھنا شروع کیا جب میرا پڑھنا ختم ہو گیا تو دیکھا کہ میری قراۃ کی طرف بھی اشارہ کر کے فرما رہے ہیں۔

هكذا انزلت — اسی طرح یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد فرمایا کہ

ان هذا القرآن انزل على سبعة احرف فاقرؤا ما تيسر منه — یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے تو جاہیے کہ تمہارے لئے جو آسان ہو ان ہی حروف کے ساتھ اس کو پڑھو

یہ روایت صحاح ستہ کی کل کتابوں میں پائی جاتی ہے، شارحین حدیث نے "سبعۃ احرف" کی شرح میں جو کچھ لکھا ہے علاوہ اس کے میرے خیال میں بات وہی تھی کہ ایک ہی زبان کے بولنے والے اس زبان کے الفاظ کو مختلف لہجوں میں ادا کرتے ہیں اور بھی اسی قسم کے اختلافات ہر زبان میں ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ جس کی زبان جس تلفظ اور جس طریقے کی عادی ہے اسی کے ساتھ قرآن کو پڑھے میرے نزدیک ان نبوی کلمات کے اس باب میں بالکل صحیح ہے کہ "سبعۃ" (سات) کے عربی لفظ سے خاص سات کا عدد مقصود نہیں ہے بلکہ عربی محاورہ

میں کثرت کے اظہار کا یہ عام طریقہ تھا، جیسے اردو میں "بیسیوں" وغیرہ کے الفاظ سے مبینہ
خاص عدد ہونے والے کا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ کثرت کا اظہار اس سے کیا جاتا ہے اور عربی
زبان کا یہ ایک عام محاورہ ہے۔ خیر اس وقت میرے سامنے اس حدیث کی شرح ہے بھی نہیں
بلکہ دکھانا یہ چاہتا تھا کہ عرب جو اس قسم کے اختلافات کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتے تھے۔
آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس برداشت کی صلاحیت پیدا کرنے کا موقعہ قرآن کے ان ہی
قرأتی اختلافات کی وجہ سے مل گیا۔ کبھی کبھی یہ دکھانے کے لئے کہ قریشی لہجہ کے سوا دوسرے لہجہ اور
الفاظ کے تلفظ کے دوسرے طریقے اسی طرح صحیح ہیں جیسے قریشی لہجہ و تلفظ صحیح ہے، باوجود قریشی
ہونے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن کو دوسرے قبائل کے لہجہ میں پڑھ دیا کرتے تھے مثلاً
روایتوں میں آیا ہے کہ سورہ رحمٰن کی آیت "علی رفرف خضر وعبقری حسان" کی جو آیت ہے
خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا گیا کہ اسی کو "علی رفارف خضر وعباقری حسان" کی شکل
میں ادا کر رہے ہیں، یہ وہی صورت ہے کہ "عمیا" کو کعب احبار "عموا" اور "عمیا" کو "عمیھا"
"غلفا" کو "مغلوفا" کے لہجہ میں ادا کرتے تھے۔

بہر حال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذکورہ بالا قصہ اگرچہ ایک شخصی واقعہ ہے لیکن قدرتی
غیر ارادی اختلافات کو ارادی و اختیاری مخالفت و مخاصمت کے قالب میں ڈھال دینے کی عادت
عربوں میں کتنی راسخ تھی اسی عام عادت کی یہ کتنی اچھی مثال ہے خیال تو کیجئے کہ نماز ہی میں اچھل کر
دبوچ لینے کا ارادہ کرنا، نماز کے بعد گردن میں ہشام بیچارے کے چادر ڈال کر کھینچتے ہوئے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لانا اور سب سے زیادہ اور بڑی بات یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے ایک صحابی کو محض اس اختلاف کی وجہ سے بے دھڑک "کذبت" تم جھوٹ بولتے ہو یا

ام المومنین خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہشام کے والد حکیم بن حزام کی حقیقی پھوپھی تھیں اس لئے بھی ان کا
صحابہ میں خاص مقام تھا، سوا اس کے قریش مکہ کے بھی ممتاز گھرانے سے ان کا تعلق تھا لیکن حضرت عمرؓ میں اس
وقت تک اختلافات کے برداشت کرنے کی اتنی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی تھی کہ اتنے بڑے معزز قرشی گھرانے کے
ساتھ کسی قسم کی رو رعایت روا رکھیں۔

لہذا یہاں اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ان اختلافات کے باب میں عرب کے جذبات کس حد تک نازک تھے، مگر پیغمبر کی تربیت نے ان ہی عربوں میں کس رنگ کو پیدا کیا ؟ یہی حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمر کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ جب کوئی ناگوار اور بری بات کی خبر آپ کو ملتی تو فرماتے کہ

ما بقیت انا وهشام فلا یکون ذلک — جب تک میں اور ہشام دونوں آدمی باقی یعنی زندہ ہیں اس وقت تک، تو ایسا نہ ہوگا،

اسد الغابہ ج ۵ ص ۶۱

جس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس طریقہ کار کا اعلان ہوا کہ باوجود اختلاف رہنے کے آپس میں ایک کا دوسرے سے جدا ہوجانا یا مخالف ہوجانا ضروری ہے بلکہ اختلاف کے ساتھ اتفاق کو بہر حال باقی رکھنا چاہئے جب قرانی قرأت کے ذریعہ آپ نے صحابہ کی عملی تربیت اس سلسلہ میں شروع کی تو ابتداء میں بعض خطرناک واقعات بھی پیش آتے جن میں سب سے زیادہ اہم حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے صحابہ میں ان کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھی جاتی تھی کہ ان میں وہ اقرءھم تھے یعنی قران کے پڑھنے والوں میں یہ سب سے اچھے تھے اس اقرء ہونے کی یعنی سب سے اچھا قرآن پڑھنے والے اس کی سند بارگاہ نبوت سے ان کو ملی تھی، قران کے ساتھ ان کی خصوصیت کا ذکر مختلف طریقوں سے کتابوں میں کیا گیا ہے، بہر حال ان کے ساتھ بھی ایک دفعہ یہی صورت پیش آئی کہ مسجد نبوی میں دو صاحبوں کو نماز میں قران کو اس طریقے سے پڑھتے ہوئے انھوں نے سنا جو ان کی قرأت کے مطابق نہ تھا اور خود ان دونوں کی قرأتوں میں بھی اختلاف تھا حضرت اُبی ان دونوں کو ساتھ لئے ہوئے دربار رسالت پناہی میں حاضر ہوئے اور جو واقعہ تھا اس کا اظہار حضرت اُبی نے کیا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو حکم دیا کہ جو کچھ تم نے پڑھا تھا مجھے سناؤ جب دونوں سنا چکے تو حضرت اُبی کہتے ہیں کہ فحسن شانھما دونوں ہی کی قرأۃ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سراہا اور کہا کہ خوب پڑھتے ہو، حضرت اُبی جن کا خیال تھا کہ قرأۃ قران میں تمام صحابہ میں میں سند سمجھا جاتا ہوں، اپنے نزدیک خیال رکھتے تھے کہ جس قرأۃ کو میں

سے ناپسند کیا ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کو ناپسند کریں گے، لیکن ناپسند تو کیا کرتے تعریف کی اور پھر ایسی دو قراتوں کو آپ نے سراہا جن میں خود بھی ہر ایک کی قرآت دوسرے کی قرآت سے مختلف تھی یہ حالات ایسے تھے کہ ابی جیسے راسخ الاعتقاد مومن کا بیان ہے کہ فسقط فی نفسی من التکذیب ولا اذکنت فی الجاھلیۃ

فسقط فی نفسی من التکذیب ولا اذکنت فی الجاھلیۃ

سمجھا آپ نے کیا مطلب؟ حضرت ابی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قراۃ کے ان قدرتی اختلافات میں سے ہر ایک کے لئے گنجائش پیدا کرنا بلکہ دو مختلف باتوں کی تحسین و تعریف ان کی اس فطرت کے لئے جس میں سرے سے اختلافات ہی کی برداشت کی صلاحیت نہ تھی اسی فطرت کو قرآن کے متعلق مرج حیں اختلافی شکلوں کے برداشت کر لینے پر آمادہ کرنا ایک ایسی بات تھی کہ مسلمان ہونے کے باوجود کہتے ہیں کہ العیاذ باللہ پیغمبر کی نبوت اور رسالت ہی کے متعلق شک نہیں بلکہ جیسا کہ وہی کہتے ہیں تکذیب کا شعلہ بھڑک اٹھا، اور کیسا شعلہ، کہتے ہیں کہ ایام جاہلیت یعنی اسلام لانے سے پہلے تکذیب کی جو کیفیت قلب میں تھی اس کو اس تکذیب سے کیا نسبت ؟ گویا ایمان و اسلام کا سارا سرمایہ اس حسی ذکاوت پر قریب تھا کہ قربان ہو جائے جو موروثی طور پر ان میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے پہلے موجود تھا اور قریب تھا کیا معنی؟ وہ تو کہتے ہیں کہ سب کچھ کھو چکا تھا سارا سرمایہ ایمان کا اسی آگ کے شعلوں میں بھسم ہو چکا تھا وہ تو خدا کی مہربانی تھی کہ یہ فوری کیفیت ان میں اس وقت پیدا ہوئی جب العالمین کی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وہ کھڑے ہوئے تھے حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابی کا قصہ گویا یوں سمجھئے کہ اسی وقت ختم ہو چکا تھا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس کیفیت کو تاڑ لیا یا کشفاً آپ پر ان کے قلب کی حالت کھل گئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے کسی فہمائش کے جو آپ کا عام قاعدہ تھا محسوس فرمایا کہ اس وقت

لے یہ مطلب حدیث کے معانی حدیث کے سب سے بڑے مستند شارح علامہ طیبی کے خیال کے مطابق بیان کیا ہے بعض لوگ جو عربی محاورات سے ناواقف ہیں زبردستی ان الفاظ کے معانی کو توڑنے مروڑنے کی کوشش انھوں نے اس لئے کی ہے تاکہ حضرت ابی کا دامن ایسے سخت الزام سے پاک رہے حالانکہ وہ عربی محاورے کی رو سے درست نہیں ہے نیز اس قصہ سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس کو بھی ان کا مطلب مشتبہ کر دیتا ہے حضرت ابی کا جب وہ حال باقی نہ رہا تو اب ان پر الزام ہی کیا رہ جاتا ہے کتنے صحابی ہیں جو کفر کی بدترین حالتوں سے نجات یاب ہوئے کیا اس لئے کہ وہ صحابی ہیں ان واقعات کا انکار کر دیا جائے۔

اس بے چارے کا کام فہمائش سے نہ چلے گا اور آخری اقتداری تدبیر جو پیغمبروں کو قدرت کی طرف سے مرحمت ہوتی ہے اسی اقتداری تدبیر سے آپ نے کام لیا ضروری خیال کیا، حضرت ابی کہتے ہیں کہ میرے اس حال کو محسوس کرکے

ضرب فی صدری — دو تین مرتبہ میرے سینہ پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مارا۔

یہ روحانی تربیت کے سلسلہ میں توجہ کی ایک شکل ہے[1] توجہ اور وہ بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کارگر نہ ہوتی تو اور ہوتا کیا۔ ابی کہتے ہیں

ففضت عرقا وکانما انظر الی اللہ تعالیٰ فرقا (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم وغیرہ) — میں اس توجہ کے بعد پسینے سے شرابور ہوگیا اور لگا ایسا معلوم ہوا کہ خوف سے میں خدا کو دیکھ رہا ہوں

ایک شر تھا جس سے حضرت ابی کے لئے ایک ایسا خیر پیدا ہوا کہ شاید اگر یہ حالت ان پر طاری نہ ہوتی تو اس کا موقعہ ان کو مشکل ہی سے میسر آسکتا تھا، پیغمبر کی توجہ نے خدا کو ان کے سامنے بے حجاب کردیا، سارے مقامات طے ہوگئے۔

کچھ بھی ہو میں تو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ قرآن میں مسلمانوں کو باہمی اختلاف سے جو منع کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب سمجھ لینا کہ جو اختلافات قدرتی واقعات کے لازمی نتائج ہیں ان اختلافات سے مسلمانوں کو روکا گیا تھا صحیح نہیں ہے بلکہ میں جہاں تک سمجھتا ہوں ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کا ذریعہ

---

[1] فتوحات مکیہ میں شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے "توجہ" کی مختلف قسموں کو بتلاتے ہوئے "توجہ بالید" یعنی ہاتھ سے توجہ کا اس کو بھی توجہ کی ایک قسم قرار دی ہے ابی بن کعب کی اس روایت کے سوا حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس واقعہ کا حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہے کہ گھوڑے کی پیٹھ پر جم کر وہ بیٹھ نہیں سکتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی اس کمزوری کا اظہار کیا کہتے ہیں کہ اس وقت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ بالید ہی سے کام لیا یعنی ان کی پیٹھ کو دونوں ہاتھوں سے آپ نے ٹھونک کر فرمایا کہ اب بیٹھو بیان کیا گیا ہے کہ اس نبوی توجہ کے بعد گھوڑے پر سوار ہونے کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پیٹھ پر کوئی میخ ٹھونک دی گئی

ان اختلافات کا بنانا اس کا انسداد مقصود تھا اور اسی کا مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہی آدم کے اختیار میں ہے ورنہ غیر اختیاری امور کے مطالبہ کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں اور اگر یہ مطلب نہیں ہے تو قرآن کی ان آیتوں کے پڑھنے والے اس کا کیا جواب سوچا کرتے ہیں جب ان کے سامنے ابتدار سے آخر تک مسلمانوں کی ساری تاریخ جس میں عہد صحابہ بھی شریک ہے اور اختلافات سے معمور اور بھری نظر آتی ہے کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اول سے آخر تک بہرے اور اندھے بن کر سارے مسلمان قرآن کے ایک ایسے قانون کو مسلسل انتہائی لاپروائیوں کے ساتھ توڑتے رہے جس کا بار بار مختلف الفاظ میں اس کتاب میں اعادہ کیا گیا ہے۔ مالکم کیف تحکمون۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرانی قرأت کے اختلافات کی ایک ایسی قدرتی صورت پیدا ہو گئی کہ مسئلہ اختلاف میں جو مطلوب تھا اس کو غیر مطلوب سے الگ کر کے دکھانے کا موقعہ عملاً آپ کو مل گیا اور اس کا عملی درس مختلف شکلوں میں صحابہ کو دیتے رہے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہتے ہیں کہ میرے ساتھ بھی ایک دفعہ یہی صورت پیش آئی کہ ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ وہ قران کو کچھ ایسے طریقہ سے پڑھ رہا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے پڑھتے ہوئے نہیں سنا تھا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے جو کچھ اس نے کیا تھا بیان کیا، ابن مسعود کہتے ہیں کہ جس وقت اس قصہ کو خدمت مبارک میں عرض کر رہا تھا، میں نے آں حضرت کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کے آثار محسوس کئے اسی مکدر چہرے کے ساتھ آپ نے ہم دونوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ

اقرا کلاکما محسن — دونوں جس طرح پڑھتے ہو پڑھتے رہو، تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو

ابن مسعود کی اس روایت کے آخر میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ

ولا تختلفوا فان من کان قبلکم اختلفوا فھلکوا (جمع الفوائد) — آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف مت کیا کرو تم سے پہلے بھی لوگوں نے اختلاف کیا تب تباہ ہوئے

آپ دیکھ رہے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کو دیکھ رہے ہیں، دونوں کی قرأتوں میں جو اختلافات تھے ان کو باقی رکھتے ہوئے، دونوں کو سراہتے ہوئے ہر ایک کی تحسین کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں کہ "آپس میں اختلاف نہ کیا کرو" کیا یہ سوچنے کی بات نہ تھی کہ اختلاف کو باقی رکھتے ہوئے اس حکم کی تعمیل کی یعنی ولا تختلفوا (آپس میں اختلاف نہ کیا کرو) کی تعمیل کی ممکنہ شکل کیا ہو سکتی ہے؟ ممکن ہے کہ لکھنے والوں نے نہ لکھا ہو لیکن بحمد اللہ عملاً پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء مبارک کو مسلمان ہمیشہ سمجھتے چلے آتے ہیں اور سمجھانے والے مسلمانوں کو اس سلسلہ میں جو اصل واقعہ ہے اس کو سمجھاتے رہے ہیں۔

میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ ذکر کر رہا تھا کہ "تدوین حدیث" کی تاریخ میں ان کی تیسری اہم خدمت یہی تھی کہ اختصاصی راہوں سے حدیثوں کا جو ذخیرہ مختلف افراد میں پھیلا ہوا تھا، ان کی وجہ سے علم و عدم علم کی اختلاف کا جو ایک بڑا خطرناک پہلو پیدا ہو سکتا تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں جہاں تک میرا خیال ہے قرآنی اختلافات کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو عملی نمونے ان کے سامنے پیش ہوتے تھے ان ہی کو پیش نظر رکھ کر اختلاف کے اس خطرے کے انسداد کی پوری کوشش کی۔

ہوا یہ جیسا کہ ہونا چاہئے تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان دونوں راہوں سے یعنی خبر آحاد کے معلومات میں کمی و بیشی یا ان کے متعلق علم و عدم علم کی وجہ سے نیز رہتی دنیا تک تعلق کی راہ دینی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے جو کھولی گئی تھی اس راہ میں نتائج و نظریات کے اختلاف کی وجہ سے قدرتی اختلافات کی جن شکلوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا، ان کی پیدائش کا سلسلہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے زمانے میں شروع ہو گیا میں تو سمجھتا ہوں کہ ابن ابی ملیکہ کے حوالے سے الذہبی نے جو یہ روایت نقل کی ہے کہ

ان الصدیق جمع الناس بعد وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال	حضرت ابوبکر صدیق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا

انکم تحدثون عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احادیث تختلفون فیہا والناس بعدکم اشد اختلافا فلا تحدثوا عن رسول اللہ شیئا فمن سألکم فقولوا بیننا وبینکم کتاب اللہ فاستحلوا حلالہ وحرموا حرامہ (تذکرۃ الحفاظ الذہبی ج ۱)

تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کیا کرتے ہو جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہوجائیں گے پس چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے کوئی بات نہ بیان کیا کرو، پھر تم سے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اشتراک کا نقطہ اللہ کی کتاب ہے پس چاہئے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ان کو حلال قرار دو اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تدوین حدیث کی تاریخ میں عہد صدیقی کا یہ وثیقہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے خصوصاً اس کی اہمیت اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ یہ حکم کسی وقتی تاثر کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ روایت کے الفاظ سے جیسا کہ معلوم ہو رہا ہے صدیق اکبر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی باضابطہ ایک مجلس منعقد کی اور اس مجلس میں انھوں نے اپنی اس تجویز کو پیش کیا ہے لیکن اس کا کیا مطلب ہے؟

مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ تجویز کے واقعی اگر یہی الفاظ تھے جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں تو پھر پڑھنے والوں سے اسی نتیجہ تک پہنچیں گا کہ حدیثوں کی روایت کے سلسلے کو حضرت ابوبکر چاہتے تھے کہ آئندہ ہمیشہ کے لئے روک دیا جائے۔

فلا تحدثوا عن رسول اللہ شیئا — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے کسی قسم کی کوئی بات نہ بیان کیا کرو

سے زیادہ واضح تعبیر اس مقصد کی اور کیا ہوسکتی ہے؟

مگر سوال یہ ہے کہ واقعی ان کا اگر یہی مطلب تھا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی اس تجویز کو مسلمانوں نے قطعی طور پر مسترد کر دیا نہ صرف پچھلے ہی زمانہ میں بلکہ صحابہ بھی ہمیشہ حدیثوں کی روایت میں مشغول رہے اور دوسروں کو کیا کیا جائے اس تجویز کا علم تو ہم تک ایک ہی روایت اور سند کی راہ سے پہنچا ہے لیکن بیسیوں روایتیں دلالت کرتی ہیں کہ ابو بکر صدیقؓ خود اپنی تجویز کی مخالفت کرتے رہے ازالۃ الخفا میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا تخمینہ ہے کہ

قریب یک صد و پنجاہ حدیث از مرویات او در دست محدثین باقی ماندہ است ص۲۲۔۔	تقریباً ایک سو پچاس حدیثیں حضرت ابو بکر کی روایت کی ہوئیں محدثین کے ہاتھوں میں باقی رہ گئی ہے۔

ابن جوزی نے (۱۴۲)، حدیثوں کا ذکر بقی بن مخلد کی مسند کے حوالہ سے کیا ہے (دیکھو تلقیح ص۱۸۵) کچھ بھی ہو مذکورہ بالا تجویز والی ایک روایت کے مقابلہ میں سو ڈیڑھ سو روایتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ خود حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ بلکہ متعدد روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دوسروں سے صدیق اکبر پوچھتے تھے کہ کوئی حدیث

ے شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ نے یہ سوال اٹھا کر کہ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طویل صحبت پیغمبر کے ساتھ ان کے گوناگوں تعلقات وغیرہ امور کے لحاظ سے مذکورہ بالا تعداد حدیثوں کی بہت تھوڑی معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ خود ہی جواب دیا ہے کہ حدیثوں کی روایت کا زیادہ تر موقعہ صحابیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ملا۔ بے چارے حضرت ابو بکر کو جوں کہ آں حضرت کے بعد دنیا میں رہنے ہی کا زیادہ موقعہ نہ ملا اور ابھی سو خلافت اور اس زمانہ کی سیاسی پیچیدگیوں کے نذر ہو گیا نیز ان کے زمانہ میں ایسے لوگ جن کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک میں حاضری کی سعادت میسر نہیں آئی تھی بہت کم مدینہ پہنچے تھے، صحابہ زیادہ تر ان ہی لوگوں سے حدیثوں کو بیان کرتے تھے، وہ جو خود شرف صحبت سے فیض یاب تھے محتاج نشدند بہ بیع از احادیث توسط وے بلکہ اکثر آں حدیث از زبان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شنیدہ بودند۔ ص۱۴۱ ج ۲۔ نیز ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ حدیثوں کے بیان کرنے کی ضرورت واقعات وحوادث کے پیش آنے کے وقت ہوتی تھی ابو بکر صدیق کو اتنی تھوڑی مدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملی کہ واقعات ان کے سامنے کم پیش آتے۔

پیش آنے والے واقعہ کے متعلق ان کو معلوم ہو تو بیان کریں مجھ ہی سے کچھ دیر پہلے یہ سن چکے کہ میراث جدہ میں حضرت ابو بکرؓ نے صحابیوں سے پوچھا کہ اس مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا علم کسی کے پاس ہو تو بیان کرے۔

سوال یہ ہے کہ پھر آخران کی اس تجویز کا واقعی مقصد کیا تھا قطع نظر ان باتوں کے کہ عام مسلمانوں نے ان کی تجویز سنی، اور نہ صحابیوں نے اور خود ان کا طرز عمل اس تجویز کے مخالف ہے اصولی سوال یہ ہوتا ہے کہ جس چیز سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو منع نہیں کیا تھا بلکہ گذر چکا کہ تکثیر سے روکتے ہوئے لوگوں کو اس پر آمادہ فرمایا تھا یعنی کثرت اشاعت سے روکتے ہوئے حدیثوں کی روایت کرنے والوں کی بہت افزائیاں کی گئی ہیں جن پر تفصیلی بحث گذر چکی

بہرحال میرا مطلب یہ ہے کہ کسی روایت کے چند الفاظ کو لے کر اس پر اس لئے اصرار کرنا کہ اپنی خواہش کی ان سے تائید ہوتی ہے، نہ یہ دین ہی کا اقتضا ہے، اور نہ علمی دیانت داری میں اس قسم کی خیانتوں کی گنجائش ہے حقیقت جوئی یا واقعہ کی تحقیق کا طریقہ یہ نہیں ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اپنے خود تراشیدہ اوہام یا من مانے خیالات کو دوسروں پر خواہ مخواہ مسلط کرنے کی یہ ایک غلط اور مجرمانہ تدبیر ہے۔

آیئے اب اس روایت کے سارے الفاظ کا مطالعہ دوسرے واقعات کی روشنی میں کیجئے پہلے اس کو دیکھئے کہ مجلس میں اپنی تجویز کو رکھنے سے پہلے تمہیدی تقریر حضرت ابو بکرؓ نے جو فرمائی تھی اس کے الفاظ کیا تھے

انکم تحدثون عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احادیث تختلفون فیہا والناس بعدکم اشد اختلافا	تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کیا کرتے ہو جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے۔

(باقی آئندہ)

دلائل القرآن

(۱)

(جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی)

مستشرقین یورپ کی اندھی تقلید میں بعض دوسرے لوگوں نے قرآن مجید کے متعلق یہ خیال بڑی قطعیت سے ظاہر کیا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ نبی کے الفاظ ہیں کیونکہ نبی اور خدا کے اسلوب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سطور ذیل میں اس مسئلہ پر ہم کسی قدر بحث کرنا چاہتے ہیں تاکہ غلط فہمی دور ہوجائے اور تصویر کا صحیح رخ سامنے آجائے۔ اصل بحث سے پہلے چند باتیں پیش ہیں۔

دو طلوع شعل قرآن | قرآن حکیم خدا کا ایسا کلام ہے جس کو نہایت کھلا اور آسان بھی کہہ سکتے ہیں اور نہایت چھپا اور مشکل بھی۔ اگر وہ ایک طرف معانی اور حکمتوں کا بے پایاں سمندر ہے تو دوسری طرف اس کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ عرب کے ان پڑھ بدو تک اس کو سن کر سیدھا سادا مطلب سمجھ جاتے تھے، خواص صحابہ جو اعلیٰ فہم و فراست اور گہرے علم کے مالک تھے اور جن کی زبان دانی مسلم اور تدبر مانا ہوا تھا اور جو اسلام کے زندہ نمونے کو دن رات دیکھتے رہتے تھے ان کو بھی ایک ایک سورہ کے مطالب پر برسوں غور کرنے کے بعد اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ وہ اس بحر ناپیدا کنار کے احاطہ سے عاجز ہیں اس کی وجہ یہی تھی کہ ان حضرات نے وہ امور جو دائرے فہم انسانی سے باہر تھے ان سے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور صرف آیات محکمات جو روح قرآنی کہی جاسکتی ہیں ان کے علم و فہم تفقہ اور تدبر پر قناعت کی اور دریا سے بقدر ضرورت لے لیا سارے دریا کو ناپنے کی فکر چھوڑ دی کیونکہ اگر قرآن عزیز کو سطح سے دیکھا جائے تو ایک نظر میں سب دیکھ سکتے ہیں اور اگر اس کی گہرائیوں کو تفصیل کے ساتھ ناپنا چاہیں تو جس قدر گہرائی میں جائیں گے اس سے آگے اور گہرائیاں ملتی جائیں گی "ودنیا ہمچناں باقی"

قرآن مجید کی عظمت و بلندی، الفاظ و معانی اور فصاحت و بلاغت پر نزول قرآن کے وقت
غیروں کی شہادت بڑا وزن رکھتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر یہ شہادتیں نہ ہوتیں تو خدانخواستہ
قرآن کی افادیت یا عظمت پر کوئی حرف آجاتا ایسا ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے۔

(۱) ورقہ بن نوفل حضرت خدیجہ کے ابن عم جو بہت بوڑھے نصرانی تھے اور جاہلیت میں ترک
سے تائب ہو چکے تھے جب قرآن کی پہلی پہل آیات سنیں تو کہا یہ کلام اسی طرز کا کلام ہے جیسے موسیٰ
پر اترا تھا۔ (بخاری)

(۲) ولید بن مغیرہ گو کافر رہا اور کفر ہی پر مرا لکتب ادب و تفاسیر میں اس کے یہ الفاظ منقول
ہیں ان اعلاہ لمثمر وان اسفلہ لمغدق اس کا اوپر کا حصہ پتے والا سر سبز ہے اور حصہ زیریں
وان لہ لحلاوۃ وان علیہ لطلاوۃ پھل والا ہے۔ اس میں ایک رونق پائی جاتی ہے
اور اس پر ایک شیرینی ہے۔

مکہ کی ۱۳ سالہ زندگی میں قرآن عزیز ہی سب سے بڑا ہتھیار تھا جس سے آنحضرت صلعم مقابلہ
کر رہے تھے اور مجبوراً معاندین کو سپر ڈال دینی پڑتی تھی۔ یہی ولید متفقہ رائے سے بھیجا گیا تھا کہ جاکر
قرآن اور صاحب قرآن کے اثر کو کم کرے مگر باوجود ان کوششوں کے قرآن کی سیادت اور کلام کی
جہانگیری رک نہ سکی۔ ولید قرآن کی حقیقت جاننے کے باوجود آخر تک ضد پر قایم رہا چنانچہ اسی
کے رد میں قرآن کی آیات ذیل نازل ہوئیں۔

"ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا" الیٰ آخر السورۃ۔

حواشی حضرت شیخ الہند میں ہے کہ ولید ایک بار آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے
قرآن پڑھکر سنایا جس سے کسی قدر متاثر ہوا مگر ابوجہل نے اس کو ورغلایا اور قریش میں چرچا ہونے
کہ اگر ولید مسلمان ہو گیا تو بڑی خرابی ہوگی غرض سب جمع ہوئے اور آپ کے بارہ میں گفتگو ہوئی کسی
نے شاعر کہا کسی نے کاہن بتلایا۔ ولید بولا کہ میں شعر میں خود بڑا ماہر ہوں اور کاہنوں کی باتیں بھی بہت
سنی ہیں قرآن نہ شعر ہے نہ کہانت۔ لوگوں نے کہا کہ آخر تیری کیا رائے ہے کہنے لگا کہ ذرا سوچنے دو

۱؎ فتح البیان

خر تیور بدل اور مُنہ بنا کر کہا کچھ نہیں جادو ہے جو بابل والوں سے نقل ہوتا چلا آتا ہے۔ حالانکہ پیشتر قرآن سن کر کہہ چکا تھا کہ یہ سحر بھی نہیں نہ دیوانے کی بڑ معلوم ہوتی ہے بلکہ اللہ کا کلام ہے مگر محض برادری کو خوش کرنے کے لئے اب یہ بات بنا دی سورۂ مدثر میں اسی کی جانب اشارہ ہے۔

(۳) اسی طرح قریش نے عتبہ بن ربیعہ کو آنحضرت صلعم کی خدمت میں بھیجا تاکہ جا کر صاحب قرآن کو مشورہ دے کہ دعوت قرآن ترک کر دی جائے۔ ہم لوگ اس کے صلہ میں محمد صلعم اور اس کو قریش کا سب سے بڑا مالدار وغیرہ بنا دیں گے چنانچہ عتبہ نے نہایت عجیب و غریب انداز میں گفتگو کی اور آپ غور سے سنتے رہے اس کے بعد آپ نے فرمایا میں بھی کچھ پڑھ رہا ہوں اسے بھی سن لے پھر آپ نے

حمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كِتَابٌ فُصِّلَتْ
آيَاتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا الخ سجدہ تک تلاوت فرما کر ایک لمبا سجدہ فرمایا اس کے بعد سر اٹھایا تو دیکھا کہ عتبہ کا رنگ فق ہے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ تو نے جو کچھ کہا میں نے سنا اور جو میں نے تلاوت کیا تو نے سن لیا بتا اب کیا رائے ہے؟

عتبہ خاموشی کے ساتھ چل پڑا۔ حیرت زدہ اور فکر میں ڈوبا ہوا۔ قریش نے دیکھ کر تاڑ لیا اور ایک دوسرے سے کہنے لگے "نحلف باللّٰہ لقد جاءکم ابو الولید بغیر الوجہ الذی ذہب بہ" قسم خدا کی ولید تمہارے پاس آ رہا ہے مگر وہ چہرہ مہرہ نہیں ہے جو لے کر گیا تھا چنانچہ آتے ہی بول اٹھے کہو عتبہ کیا بات ہے؟ قال ورائی انی سمعت قولا واللّٰہ ما سمعت مثلہ قط واللّٰہ ما ھو بالشعر، ولا بالسحر، ولا بالکھانۃ الخ . . . . . اور یہ مشورہ دیا کہ اے قریشیو میری بات مان لو اور محمد صلعم کا راستہ مت روکو میں نے خدا کی قسم ایک ایسی چیز سنی ہے جو بہت بڑی خبر دے رہی ہے اگر اس پر عرب غالب آ گئے تو تمہارا کام ہو گیا اور اگر وہ خود عرب پر غالب ہو گیا تو اس کا ملک تمہارا ملک ہو گا اور اس کی عزت عین تمہاری عزت متصور ہو گی اور تم اس کی نظروں میں بہترین انسان بن جاؤ گے ـــــ یہ تقریر سن کر قریش برہم ہو گئے اور افسوس کا اظہار کیا

اور محمد کہ واللہ یا ابا الولید بلسانہ " کہتے ہوئے ہٹ گئے۔ عتبہ نے کہا۔

ھذا لسانی فیکم فاصنعوا مابدالکم ۔ یہ میری رائے ہے تمہارے جی میں جو آئے کر گذرو "

(۴) نضر بن حارث مقیم حیرہ بڑا ذہین و فہیم شخص تھا۔ سیاحی کرتے ہوئے بلادِ فارس میں پہنچا اور فارسی زبان میں مہارت پیدا کی قریش نے اس کو اپنایا اور دعوتِ اسلام و تاثیر قرآن کے کم کرنے کے لئے یہ دوسرا قدم اٹھایا گیا چنانچہ نضر بن حارث نے معیارِ حسن کلام داستان گوئی قرار دے کر قیصر و کسریٰ اور رستم و اسفندیار کے قصوں کو کعبہ میں سنانا شروع کیا اور یہاں تک بول اٹھا کہ محمد (صلعم) کیا مجھ سے عمدہ بات لاتے ہیں؟

جواباً آں حضرت صلعم نے سورۃ (ن) کی آیات ذیل تلاوت فرمائیں

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۔ الیٰ آخر سورۃ القلم۔

عجیب بات کہ نضر لوگوں کو اپنے قصوں میں پھنساتے ہوتے تھا مگر لوگوں کے دل قرآن مجید سننے کے بعد اسی طرف متوجہ تھے اور روز بروز قرآن دلوں کی بستی آباد کرتا جا رہا تھا حسب تصریح حضرت عبداللہ بن عباسؓ نو آیتیں اسی نضر بن حارث کے بارے میں اتری ہیں اور جہاں کہیں قرآن میں " اساطیر الاولین " آیا ہے اس سے اسی کے قصوں کی جانب اشارہ ہے اسی طرح ایک اور طریقہ قرآن کے اثر کم کرنے اور نبی کی دعوت کو ناکامیاب بنانے کے لئے اختیار کیا گیا اور ایسے سوالات حسب تصریح ارباب سیر مکہ میں قریش نے یہود کے مشورہ سے کئے جو در حقیقت مشکل بھی اور قاصر الفہم بالجود معاندین کے لئے تو اللہ سوہان روح ہو سکتے ہیں مگر ایک نبی کے لئے جس کو ہر طرح کی تائید ایزدی حاصل ہو کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتے تھے، صحیحین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود مدینہ نے آں حضرت صلعم سے روح کے متعلق سوال کیا تھا اسی بناء پر آیت کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔

قرآن عزیز نے سورہ بنی اسرائیل میں یہود وغیرہ کے سوال کا جواب بڑی صفائی سے دیا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ	تجھ سے پوچھتے ہیں روح کو۔ کہدے روح ہے
مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ	میرے رب کے حکم سے اور تم کو تھوڑی سی
الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا	خبر دی ہے۔

ان مختصر اور جامع الفاظ کی تہ میں روح کے متعلق وہ بصیرت افروز حقائق مستور ہیں جو بڑے سے بڑے عالی دماغ نکتہ رس فلسفی اور ایک عارفِ کامل کی راہِ طلب و تحقیق میں چراغ ہدایت ہیں۔ یہود میں اس کی حقیقت و ماہیت کے سمجھنے کا حوصلہ نہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے کھول کر نہیں بتایا اور نہ پیغمبروں نے کبھی مخلوق سے ایسی باریک باتیں کہیں بس اتنا جاننا کافی ہے کہ اللہ کے حکم سے ایک چیز بدن میں آپڑی، وہ جی اٹھا، جب نکل گئی وہ مرگیا۔

روح کے سلسلہ میں اصحاب کہف اور ذو القرنین کے متعلق بھی سوالات تھے سورۃ الکہف میں بڑی تفصیل سے ان کا جواب دیا گیا اور قریش کا رد کیا گیا کہ پھر تردید اور جواب کی جرأت نہ ہوسکی اور سب متحیر ہو کر رہ گئے۔

(۵) ان تمام تدبیروں کے بعد قریش نے زبردستی لوگوں کو قرآن پڑھنے سے روکنا شروع کیا مگر چپکے سے پھر بھی سننے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ ابن اسحٰق نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک رات ابو سفیان، ابوجہل اور اخنس چپکے سے نکلے کہ آنحضرت صلعم راتوں کو جو قرآن تلاوت فرماتے ہیں اس کو سنا جائے غرض ہر ایک نے ایک جگہ بیٹھ کر الگ الگ سنے۔ اور پھر پوری رات قرآن مجید کے سننے میں گذار دی جب صبح ہونے لگی منتشر ہوئے۔ جب تمام اکٹھا ہوئے تو ملامت کرنے لگے کہ اب ایسا نہ کرنا چاہئے اگر عام لوگ دیکھ لیں گے تو نہ جانے کیا کیا خیالات اپنے دل میں قایم کرلیں گے۔ یہ قصہ تین راتیں مسلسل رہا صبح کو اخنس چھڑی لئے ابو سفیان کے گھر پہنچا اور پوچھا۔

اخبرنی یا ابا حنظلۃ عن رأیک فیما	اے ابو حنظلہ بتاؤ محمد سے جو تم نے سنا ہے اس
سمعت من محمد صلعم، فقال یا ابا	کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا اے
ثعلبۃ واللّٰہ لقد سمعت اشیاء	ابو ثعلبہ خدا کی قسم میں نے ایسی چیزیں سنی ہیں جن

اعرفها اعرف ما یراد بها وعرفت	کو میں سمجھتا ہوں اور اس کی مراد سے بھی واقف ہوں
اشیاء ما عرفت معناها ولا ما	اور بعض ایسی باتیں سنی ہیں جن کو نہیں نے سمجھا
یراد بها قال له الاخنس وانا	اور نہ اس کی مراد تک رسائی ہے جوابا اخنس نے
والذی حلفت به کذالک	اس سے کہا کہ میں بھی ایسا ہی حلفیہ کہتا ہوں۔

اس کے بعد ابوجہل کے پاس آئے اور یہی سوالات کئے اس نے لمبی تقریر کے بعد کہا۔

واللہ لا نؤمن بہ ابداً ولا نصدقہ	قسم خدا کی میں نہ کبھی اس پر ایمان لاؤں گا اور نہ اس
فقام عنہ الاخنس وترکہ	کی تصدیق ہی کروں گا۔

یہ بات سن کر اخنس کو برا معلوم ہوا تھا اور اس کو چھوڑ کر چل دیا۔

غرضیکہ قریش جس قدر قرآن کے اثر کم کرنے کی سعی کرتے اسی قدر قرآن لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا جاتا تھا۔ بجز عصبیت جاہلیہ اور اقتدار پرستی کے زعم باطل میں کہاں سے یہ طاقت آسکتی تھی جو قرآن کی دعوت و پکار کو دبا دیتی۔ قرآن تو ایک موثر اور دلربا طرز بیان اور دریا کا سا تموج لے کر آیا تھا ساتھ ہی اسالیب کلام کا تفنن اور شہنشاہانہ شان و شکوہ کا مالک تھا لذت و حلاوت کا یہ عالم تھا کہ بدترین دشمن اس کی فصاحت و بلاغت کے سامنے سپر ڈال دیتے تھے واقعات بالا شاہد ہیں صحابہ میں جو لوگ سلیم الفطرت تھے ان میں سے اکثر کا حلقہ بگوش اسلام ہونے کا واحد سبب صرف اس کلام مقدس کی آیات کا سننا اور اس سے عدد درجہ متاثر ہونا کتب احادیث و سیر میں ایک سے زاید واقعات موجود ہیں۔ مثلاً ابوذر غفاری، عثمان بن مظعون، ابوسلمہ، ارقم بن ارقم، طفیل بن عمرو الدوسی ابوعبیدہ، خالد الدوسی، نجاشی اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کا واقعہ تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں خلیفہ دوم نے اپنا واقعہ خود بیان فرمایا ہے کہ میں تمام لوگوں میں آنحضرت صلعم کا سب سے بڑا اور شدید دشمن تھا آخر میں میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ سارا قصہ ہی کیوں نہ پاک کر دیا جائے چنانچہ میں ایک روز اسی ارادہ سے شمشیر برہنہ لئے راستہ میں بعض لوگوں سے کہا کہ تم کو پتہ ہے گھر کے کو

۱؎ مادۃ من القرآن محمد صبیح المصری

بھی ہے تمہاری بہن دین آباء واجداد سے پھر گئی ہے چنانچہ میں لوٹ پڑا اور دروازہ پر دستک دی اندر سے آواز آئی کون۔ جواب دیا عمر۔ یہ لوگ ایک صحیفہ پڑھ رہے تھے فوراً ادھر ادھر ہٹ گئے اور چھپنے لگے اندر جاکر پھر پوری ادھم مچائی بہن اور بہنوئی کو خوب زدوکوب کیا جب ذرا طبیعت سنبھلی کہا کہ کیا پڑھا جارہا تھا ؟ سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی آیات ایک صحیفہ پر لکھی ہوئی تھیں (جو موٹے حروف میں لکھا جایا کرتا تھا آج کل کی طرح حروف چھوٹے اور شائستہ نہ تھے)۔ سنائی گئیں الخ پھر خود ہی فرماتے ہیں "فوقع الاسلام فی قلبی کل موقع" اس کے بعد اسلام میرے دل کے اندر پورے پورے طور پر اتر گیا یہ کون سی چیز تھی جس نے عمر جیسے ماہر کلام عرب اور عرب کے عکاظ کے میلے کی اکاڈیمی کے ممبر، ناقد اور بصیر اشعار عرب پر اثر کر گئی ؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جو زبان وحی الٰہی نے اختیار کی ہے ایسی ہی زبان اور ایسا ہی کلام تمام فصحاء عرب و بلغاء عدنان کے مخاطب کرنے کے لئے ضروری تھی جس وقت سے قرآن کے جمال جہاں آرا نے غیب کی نقاب الٹی اور اولاد آدم کو اپنے سے روشناس کیا اس کا برابر یہ ہی دعوے رہا کہ میں خدائے قدوس کا کلام ہوں اور جس طرح خدا کی زمین جیسی زمین، خدا کے سورج جیسا سورج اور خدا کے آسمان جیسا آسمان پیدا کرنے سے دنیا عاجز ہے ٹھیک اسی طرح خدا کے قرآن جیسا قرآن بنانے سے بھی دنیا عاجز رہے گی۔ قرآن میں وصول الی اللہ اور تنظیم و رفاہیت خلائق کے وہ تمام قوانین و طرق موجود ہیں جن سے آفرینش عالم کی غرض پوری ہوتی ہے اور جن کی ترتیب و تدوین کی ایک امی قوم کے امی فرد سے کبھی امید نہیں کی جاسکتی ہے ــــ اور تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

دس سال کا زمانہ گذر گیا مگر قریش اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے برابر قائم تھے بلکہ استہزاء اور مذاق پر اتر آتے اور ہر ممکن طریقہ سے قرآن کے اثر کو ختم کر رہے تھے۔ اس عصبیت جاہلیہ سے آپ تنگ آگئے اور طائف ہجرت فرمائی وہاں بھی اشرار نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ واپس تشریف لائے قیام مکہ ہی میں اور ادھر ادھر سے بہت سے وفود آتے رہتے آپ ان کے سامنے قرآن پیش فرماتے۔ انھیں لوگوں میں سے ایک شخص سوید بن الصامت تھا جو علم اور عقل میں کامل گنا جاتا تھا

قرآن سننے کے بعد کہا کہ میرے پاس بھی اسی طرح کی چیز ہے جو آپ کے پاس ہے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ کون سی چیز تیرے پاس ہے؟ سوید نے کہا لقمان کی حکیمانہ باتیں آپ نے فرمایا کہ پیش کرو

فقال لہ النبی اعرضھا علی فعرضھا	اس نے پیش کیا آپ نے فرمایا یہ کلام بھی اچھا ہے
علیہ فقال النبی ان ھذا الکلام	لیکن میرے پاس اس سے بہتر اور افضل کلام
حسن والذی معی افضل من	موجود ہے وہ قرآن کریم ہے جس کو خدائے تعالی
ھذا قرآن انزلہ اللہ تعالٰی	نے مجھ پر اتارا ہے وہ سراپا ہدایت اور نور ہے

علی ھو ھدی و نور

اس کے بعد چند آیات تلاوت فرمائیں جس کو سوید نے پورے دھیان اور توجہ سے سنا اور پھر یہ کہتا ہوا واپس چلا گیا کہ "یہ کلام بہت خوب ہے"

غرض وفود آکر متاثر واپس جاتے اور قرآن کی دعوت روز بروز بڑھتی جاتی تھی اس اثر کو اور زیادہ ترقی دینے کے لئے آنحضرت صلعم نے مصعب بن عمیرؓ کو قرآن کا پہلا معلم قرار دیا چنانچہ لوگوں میں آپ قرآن اور تعلیم اسلام پھیلاتے اور سکھاتے تھے اور بطور معلم "المقری" کے نام سے موسوم ہو گئے

قرآن مجید کا پہلا مدرسہ آنحضرت صلعم سے پہلے جتنی آسمانی کتابیں آئیں ان کی حفاظت ان کے علماء کے ذمہ تھی، اور وہ کتابت کا سلسلہ تھا قرآن عزیز کی حفاظت اللہ تعالٰی نے خود اپنے ذمہ رکھی اور اس کی صورت پیغمبر اسلام نے حفظ اور زبانی یاد تجویز فرمائی حالانکہ قرأت اور کتابت جاننے والوں کی فہرست میں اولین نام حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ و حضرت زبیرؓ کا موجود ہے۔ اور "کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ" سے ۴۲ اسماء کا تبین کا پتہ چل سکتا ہے

اسی طرح قرآن حکیم سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے قلب پر قرآن نازل ہوا اور آپ اس کے حفظ کے مکلف تھے اور ساتھ ہی آپ کا یہ بھی فریضہ تھا کہ آپ قرآن لوگوں کو یاد کرائیں، اس کے معانی و مطالب کی شرح و تبیین فرمائیں نہ یہ کہ محض کتابت، قرآن میں ہے کہ ”فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ“ (بقرہ)

(۳) نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۔ (الشعراء)

(۴) هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ (الجمعہ)

اس موقع پر ہم ایک بات صاف کر دینا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ کہ قرآن میں لفظ "صحیفہ" اور دوسرا لفظ "قرطاس" آیا ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کی بہن کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا اور قریش نے اقتصادی و اجتماعی کاروبار کے لئے جو تحریر کیا تھا وہ بھی صحیفہ ہی کہا جاتا تھا اس لیے شبہ ہو سکتا ہے کہ قرآن صحف اور قراطیس کی صورت میں نازل ہوا ہو۔ اصل یہ ہے کہ صحف جمع ہے صحیفہ کی جس کے معنی لکھے ہوئے اوراق کے بھی آتے ہیں اور اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو پھیلی ہوتی، اٹھانے میں ہلکی اور جس پر آسانی سے لکھا جا سکے یعنی آج کل کی کتابوں کی طرح نہ ہو۔ پس قرآن سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ قرآن نہ تو قرطاس میں نازل ہوا جیسے توریت اور نہ بطور حصر کے کہا جا سکتا ہے کہ تمام قرآن صحف اور قراطیس میں لکھا گیا تھا بلکہ قرآن تو صاف صاف اپنا بیان دے رہا ہے۔

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ۔ شرح اس کی یہ ہے کہ محمد صلعم نے کسی سے لکھا پڑھا نہیں بلکہ یہ وحی جو ان پر آئی ہمیشہ کو بن لکھے سینہ بسینہ جاری رہی اور رہے گی۔ اللہ کے فضل سے علماء اور حفاظ و قراء کے سینے اس کے الفاظ و معانی کی حفاظت کریں گے کیونکہ یہ صرف قرآن کا امتیازی وصف ہے اور کتابیں حفظ نہیں ہوتیں تحریف کا موقع مل گیا۔ یہ آیت کریمہ صاف دلالت کر رہی ہے کہ حفظ ہی اصل و اساس تھا اور ہے قرآن کے بقا و تحفظ کا۔ ولیست التلاوۃ من صحف مسطورۃ۔

حفظ قرآن عہد نبوی میں | قرآن مجید کے حفظ اور تعلیم کا جو طریقہ آج جاری پایا جاتا ہے آنحضرت صلعم کے زمانۂ باسعادت میں یہ نقشہ نہیں تھا حضرت ابو عبدالرحمٰن سلمیؓ صحابہ کرام کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلعم سے قرآن مجید کی دس دس آیات پڑھا کرتے تھے۔ الفاظ کے ساتھ عمل کا طریقہ بھی سیکھتے جاتے تھے جب ہم قرآن کا ایک حصہ ختم کرتے تو الفاظ و معانی کے ساتھ اس کے

طریق عمل سے بھی واقف ہوتے جاتے (ابن جریر) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں خدا کی قسم قرآن کی کوئی سورت ایسی نہیں جس کے متعلق مجھے یہ علم نہ ہو کہ کہاں اتری اور کس کے متعلق۔ اگر مجھ کو یہ علم ہو جائے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو قرآن کا علم ہے اور سواری وہاں تک پہنچ سکے تو یقیناً اس کے پاس جا کر علم قرآن حاصل کروں تمام صحابہ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ میں سب سے قرآن کی بابت زیادہ واقف ہوں حالانکہ میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ (صحاح) ابو ایوب انصاریؓ عبادہ بن الصامتؓ۔ ابی بن کعبؓ۔ معاذ بن جبلؓ۔ زید بن ثابتؓ۔ ابو زیدؓ۔ سالمؓ۔ ابو درداءؓ نے آنحضرت کی زندگی ہی میں قرآن حفظ کر لیا تھا موطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمر کا قصہ درج ہے کہ آپ نے بارگاہ رسالت میں ۸ سال تک سورہ بقرہ حفظ کی اور جب تک ایک ایک آیت کو خوب نہیں سمجھ لیتے آگے نہیں بڑھتے تھے مسند احمد میں حضرت انسؓ کا یہ قول موجود ہے "کان الرجل اذا قرء البقرۃ وآل عمران جد فی اعیننا" جب کوئی سورہ بقرہ اور آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نظروں میں اس کا مرتبہ زیادہ ہو جاتا۔ آنحضرت صلعم نے جس طرح مردوں کے لئے تعلیم قرآن کا اہتمام فرمایا اسی طرح عورتوں کی تعلیم کے لئے حضرت سیدہؓ کو مخصوص کر دیا تھا۔ کیونکہ آیات قرآنی واحادیث نبوی قرآن کی تلاوت اور حفظ پر کثرت سے وارد ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی بلا معنی سمجھے بھی تلاوت کرتا ہے اس کو بھی ثواب ہوتا ہے باقی یہ غلط منطق ہے کہ بلا سمجھے پڑھنا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اس خیال خام کی تردید کے لئے قرآن مجید کی ایک آیت جس کا ترجمہ یہ ہے "جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے رہتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ماندہ نہ ہوگی تاکہ ان کی اجرتیں بھی پوری پوری دیں اور ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ دیں بے شک وہ بڑے بخشنے والے قدردان ہیں (سورۂ فاطر)

اور ایک حدیث "خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ" (بخاری) "تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن کو سیکھے اور سکھائے پڑھے اور پڑھائے۔ درج کر دی گئی ہے۔ فتامل

انھیں آیات واحادیث کی بنا پر سلف اور خلف نے حفظِ قرآن پر کافی توجہ فرمائی چنانچہ کتب لغت و متونِ حدیث سے حفظِ قرآن کو لفظ جمع، حمل، وعی، ایعاء احکام، اظہار، استظہار اور حفاظِ قرآن کو آل القرآن، اہل القرآن، صاحب القرآن، جامع القرآن، داعی القرآن، ماہر، قاری در سفرہ سے تعبیر و موسوم کرتے رہے ہیں۔

قرآن کے لغوی و اصطلاحی معنی | اہل لغت نے حسب عادت لفظ "القرآن" پر مفصل کلام کیا ہے چند کو ذیل میں ہم درج کرتے ہیں۔

(۱) امام شافعیؒ کا خیال ہے کہ لفظ "القرآن" نہ تو مہموز ہے اور نہ مشتق ہے بلکہ علم ہے اور نام ہے اس کلام کا جو آنحضرتؐ پر نازل ہوا۔

(۲) قراء کا خیال ہے کہ یہ قرائن سے مشتق ہے کیونکہ بعض آیات بعض کی تصدیق کرتی ہیں

(۳) زجاج کا قول ہے کہ فعلان کے وزن پر یہ صفت ہے مہموز اور مشتق ہے لفظ قرء سے اہل عرب بولتے ہیں قرأت الماء فی الحوض اذا جمعتہ" اس لئے قرآن اس کلام کا نام ہوگا جو آنحضرت صلعم پر اترا اور تمام کتبِ سماویہ کا جامع ہے۔

(۴) لحیانی کہتا ہے کہ یہ لفظ مصدر ہے اور مہموز ہے غفران کے وزن پر پڑھنے کے معنی میں مگر بمعنی مفعول مستعمل ہو کر خدا کی کتاب کا نام ہوگیا ہے۔ اکثر لوگ اسی تحقیق پر ہیں۔ اب ہم ذیل میں چند آیات ایسی پیش کرتے ہیں جس سے قرآن کے معنی کی تعیین ہوتی ہے۔

(۱) لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ

نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان تاکہ جلدی اس کو سیکھ لے وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع کر دینا تیرے سینہ میں اور پڑھنا تیری زبان سے پھر جب ہم پڑھنے لگیں فرشتہ کی زبانی تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے (القیامہ)

آیت مذکورہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے ظاہر معنی اس موقع پر تلاوت اور قرأت کے ہیں اس آیت کے رو سے قرآن وہ کلام الٰہی ہے جو لوگ بار بار پڑھتے رہتے ہیں آیت سورہ قیامہ کے

معنی کی تائید سورۃ الاسراء کی اس مشہور آیت کریمہ سے ہوتی ہے۔

(۲) قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۔۔۔۔۔ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔

آیات بالا سے یہ بات پورے طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور جس کو لوگ پڑھتے ہیں۔ اس میں کوئی شرط نہیں کہ تلاوت لکھی ہوئی کتاب سے ہو۔

چند آیات اور ملاحظہ کی جائیں۔

(۳) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ۔ (بقرہ)

(۴) وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (حجر)

(۵) طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی (طٰہٰ)

(۶) وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ عَلِیْمٍ (نمل)

(۷) اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (واقعہ)

(۸) لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا (حشر)

(۹) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا (دہر)

(۱۰) وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ (احقاف)

مذکورہ بالا آیات سے اور بہت سی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے لفظ قرآن کا استعمال اس کلام پر کیا ہے جو بطریق وحی محمد صلعم پر اترا ہے ہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ قرآن صرف اسی کلام کا نام نہیں رکھا جائے گا جو بذریعہ وحی محمد صلعم پر نازل ہوا بلکہ اور بھی اس کے نام ہیں مثلاً صحف، الکتاب، الذکر، فرقان اور کلام اللہ۔

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن ہی وہ پہلی کتاب ہے جس نے اپنا تعارف کرا کے مہر ثبت کر دی کہ الفاظ اور نظم و ترتیب سب من جانب اللہ ہے۔ قرآن میں ہے

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ نَزَلَ اور یہ قرآن اتارا ہوا ہے پروردگار عالم کا لیکر اترا ہے

بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (الشعراء)

اس کو فرشتہ معتبر تیرے دل پر کہ تو ہو ڈر سنا دینے والا کھلی عربی زبان میں۔

لفظ مبین سے مراد اس کے لغوی معنی نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ بطور علَم کے ہے۔ کیونکہ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ اسی زبان کو کہا گیا ہے جو فصیح ترین اور شیریں ترین زبان ظہورِ اسلام کے وقت اہل عرب کی تھی اسی طرح لفظ کلام کا اطلاق بھی عرفِ عام میں لفظ و معنی اور نظم و ترتیب سب پر ہوتا ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ (التوبہ)

اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دے یہاں تک کہ وہ سن لے کلام اللہ کا

چنانچہ اسی لفظ کے ساتھ رسول اللہ صلعم نے بھی لوگوں سے قرآن کا تعارف کرایا ہے حدیث میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ موقف میں کھڑے ہو کر فرمایا کرتے۔

الا رجل یحملنی الی قومہ لا بلغ کلام ربی فان قریشا منعونی ان ابلغ کلام ربی

کیا ایسا کوئی شخص ہے جو اپنی قوم کی طرف مجھ کو لے چلے تاکہ میں اپنے رب کا کلام پہنچا دوں کیونکہ قریش نے تو مجھے اپنے رب کا کلام پہنچانے سے روک دیا ہے

دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جب "الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ" سنائی تو کفار قریش نے پوچھا یہ تمہارا کلام ہے یا تمہارے صاحب کا؟ آپ نے فرمایا اور جواب دیا۔

لیس بکلامی ولا بکلام صاحبی ولکنہ کلام اللہ

نہ یہ میرا کلام ہے نہ میرے صاحب کا بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

سورہ طٰہٰ میں آتا ہے۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ الخ

اور تو جلدی نہ کر قرآن کے لینے میں جب تک پورا ہو چکے اس کا اترنا۔

غور کرو یہ آیت تو دلالت کر رہی ہے کہ قرآن ان الفاظ و معنی ہی کا نام ہے جو وحی کی صورت میں اترا

ہے اور قلبِ نبوی ہی اس کا نشیمن ہے۔ قرآن ہی وحی ہے اور القصار وحی قرآن ہی کو کہا گیا ہے۔
لہٰذا وحی کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایک علم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محمد صلعم کی روح اور
قلب پر ایک ایسے مخفی طریقہ سے طاری کر دیا تھا جو تحصیل علم کے مشہور کسبی طریقوں سے مختلف
اور ان الہاموں سے بھی جدا ہے جو بعض خواص پر نازل ہوجایا کرتے ہیں۔

اب ہم سورہ طٰہٰ اور سورۃ قیامہ کی مذکورہ بالا آیات کی کچھ اور وضاحت کر رہے ہیں تاکہ قرآن مجید
کے دلائل خود قرآن ہی سے ہوجائیں۔

ابتدائے نبوت میں قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ جو لوگ قرآن مجید
کے مخاطب تھے اولاً تو ان کی استعداد خام تھی دوئم وہ نہایت بدشوق بلکہ قرآن سے بیزار تھے
ایسی حالت میں حکمتِ الٰہی کا تقاضہ یہی ہوا کہ ان کی تعلیم آہستگی تدریج اور نرمی کے ساتھ ہو۔ لیکن کبھی
کبھی جب فترۃ وحی کا زمانہ طویل ہوجاتا۔ آنحضرت صلعم کے لئے موجب تشویش ہوتا کیونکہ آپ کا
تمام تر سرمایۂ تسکین و اطمینان قرآن ہی تھا۔ اور آپ اپنی قوم کے ایمان کی بے پایاں آرزو رکھتے تھے
اور اس کا تمام تر ذریعہ وحی الٰہی تھی سو آپ کو تکمیل دین کی تمنا تھی اور تمنا قدرتاً مستعجل ہوتی ہے۔ ان
تمام باتوں کی وجہ سے نزولِ وحی کے وقت آپ کا جذبۂ شوق وطلب بے اندازہ ہوتا یہاں تک کہ آپ
وحی کو زبان سے دہراتے کہ کوئی بات یاد سے رہ نہ جائے۔ آں حضرت صلعم کی اس حالت پر لسانِ غیب
نے بار بار ٹوکا اور خداوندی امور میں مہلت اور تدریج کا جو معاملہ ہے اس کی حکمتیں بیان فرمائیں پس
سورہ طٰہٰ کی آیت "وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِن قَبْلِ أَن يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ" میں اجمال کے ساتھ تدریج
کی حکمت بیان فرما دی کہ یہ انسان کے ضعفِ عزم اور نااستواریٔ عہد کی وجہ سے ہے اگر یہ بات نہ ہوتی
تو وہ ایک ہی دفعہ میں سب کچھ پالیتا۔

اسی حقیقت کو سورہ قیامہ کی آیت لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ الخ میں بیان فرمایا گیا ہے
اس سورہ کی تفسیر میں ترجمان القرآن حضرت مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے جن حقائق و معارف کا
اظہار فرمایا ہے اس کے استقصا کا یہ موقع نہیں نظام القرآن سورۂ قیامہ ملاحظہ کرلی جائے۔

الغرض استاد امام کی خاص تحقیق ہم یہاں پر درج کرتے ہیں جس سے تین باتیں نہایت واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔

الاول ان القرآن یجمع فی عهد
النبی ویقرء علیه منسق ولمحل فانه
لو انجز هذا الوعد بعد عهد النبی
لم یامره باتباعه۔
والثانی ان النبی مامور بالقراءة
حسب هذه القراءة الثانیة التی
تکون بعد الجمع لیس للنبی ان یلقی
علیه شئ من الوحی ولا یبلغه
الامة عقلا ولما امره الله تعالیٰ
فی قوله
"یایها الرسول بلغ ما انزل الیك
من ربك وان لم تفعل فما بلغت
رسالته" اهل علما فلا بد ان علم
النبی الامة قراءة الاخیرة التی
علیه القرآن فی اللوح المحفوظ
فان العرضة الاخیرة لابد ان
تکون مطابقة بالاصل والثالث
ان بعد هذا الجمع والترتیب
بین ما شاء الله بیانه من تتمیم

(۱) قرآن آنحضرت صلعم کے عہد میں جمع ہوکر ایک خاص
ترتیب سے آپ کو سنا دیا جائے گا۔ اگر یہ وعدہ آپ
کی وفات کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس
قراءت کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا۔ (فاذا قرأنٰه فاتبع قرآنه)
(۲) آپ کو حکم تھا کہ جمع قرآن کے بعد دوبارہ جس طرح
آپ کو قرآن سنایا جائے اس طرح آپ پڑھیں اور
یہ بات عقلاً و نقلاً دونوں لحاظ سے غلط معلوم ہوتی ہے
کہ آپ پر کوئی بات بطریق وحی آئے اور آپ اس کو
امت کو نہ پہنچائیں عقلاً تو اس کی غلطی بالبداہت واضح ہے
نقلاً قرآن مجید میں فرمایا ہے یا ایها الرسول بلغ الخ
یہ ایک عام حکم ہے اس حکم عام کا تقاضہ ہے کہ آنحضرت
صلعم نے امت کو اس ترتیب کے مطابق قرآن سنایا
ہو جس ترتیب پر اس کی آخری قرآت ہوئی اور جو یقیناً
لوح محفوظ کی ترتیب ہے کیونکہ آخری قراءت کا اصل
کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہونا ضروری ہے۔ تیسری بات
یہ نکلتی ہے کہ اس جمع و ترتیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے
وہ باتیں بھی بیان فرما دیں جو تعمیم و تخصیص یا تخفیف
و تکمیل سے تعلق رکھتی تھیں۔

والتخصیص والتکمیل والتخفیف[1]

پھر فرماتے ہیں: "یہ باتیں قرآن مجید سے ثابت ہیں اور ان کی تائید روایات سے ہوتی ہے کہ یہ تمام باتیں ٹھیک ٹھیک پوری ہوئیں۔ چنانچہ آنحضرت صلعم قرآن مجید کی پوری پوری سورتیں لوگوں کو سناتے تھے اور یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ آپ کو وہ اس خاص ترتیب پر سنائی گئی ہوں اور صحابہ اسی ترتیب کے مطابق قرآن مجید کو سنتے اور محفوظ کرتے تھے۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ آپ خاص خاص آیتوں کو سورتوں میں خاص خاص مقامات میں لکھواتے تھے اور صحابہ اس کی پابندی بھی فرماتے تھے اور پھر جب کوئی تشریح کرنے والی آیت اترتی تو آپ اس کو بھی قرآن مجید میں لکھواتے اور ان کے لکھوانے میں دو طریقے ملحوظ تھے یا تو وہ ان آیات کے ساتھ ملادی جاتیں جن کی تشریح کرتیں یا سورہ کے آخر میں رکھ دی جاتیں اگر ان کا تعلق سورہ کے مجموعی مضمون سے ہوتا۔

ان تشریح کرنے والی آیتوں کی ایک اور نمایاں علامت بھی قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں خود اس طرح کے الفاظ موجود ہوتے ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ یہ تشریح و بیان کے لئے نازل ہوئی ہیں مثلاً اس طرح کی آیات کے ساتھ اکثر فرمایا گیا ہے "کذلک یبین اللہ آیاتہ للناس"۔

اس طرح جب قرآن نازل ہو چکا تو آخر میں حضرت جبرئیلؑ نے آپ کو پورا قرآن اس کی اصلی ترتیب کے مطابق سنا دیا یہ بات صحیح اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے اور اس سے نظام قرآن کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہوتی جا رہی ہیں۔"

قرآن مجید کی اس آیت لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ اور دوسری آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب الٰہی میں کسی کی بیشی اور تبدیلی کا امکان تک نہیں ہے۔ اور حضرت مولانا حمید الدین فراہی کی تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ قرآن عہد نبوی صلعم میں مدون و مرتب ہو چکا تھا اور صحابہ نے اس کو آنحضرت صلعم پر متعدد

---

[1] تفسیر سورۃ القیامہ من نظام القرآن ص ۱

بار پڑھا اور سنایا تھا یہ وہی قرآن مجید ہے جو بجنسہ آج ہمارے پاس محفوظ و موجود ہے۔ علامہ طبرسی جو امامیہ کے مسلم الثبوت امام ہیں مجمع البیان جلد اول میں لکھتے ہیں " ان القرآن کان علی عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم مجموعا مولفا علی ما ھو علیہ الان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وان جماعۃ من الصحابۃ ختموا القرآن علیہ عدۃ ختمات "۔ سید مرتضیٰ، شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسی نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔ محمد بن علی بن بابویہ قمی کہتے ہیں " ہمارا اعتقاد ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا وہ وہی ہے جو ما بین الدفتین امت کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ قرآن مجید اس سے زیادہ ایک حرف نہیں تھا جو شخص ہماری طرف منسوب کرتا ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس سے زیادہ ہونے کے قائل ہیں وہ جھوٹا ہے[1] "

اسی بنا پر علامہ ابن حزم کی ملل ونحل جلد دوم میں یہاں تک موجود ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی کی وفات ہو جانے پر ایک لاکھ قرآن مجید مصر، عراق، شام، یمن وغیرہ میں پھیل چکے تھے۔ لوگ اس کی تلاوت، تعلیم، تفسیر وغیرہ میں مصروف تھے۔

قرآن کریم اللہ حی وقیوم کا کلام ہے جس سے روح القدس جبرئیل امین علیہ السلام کا اس کے سوا کوئی تعلق نہیں کہ انھوں نے اسے عربی لفظوں کے ساتھ افق اعلیٰ کے آسمان سے لاکر اس زمین پر پہنچا دیا اور جس سے محمد رسول اللہ وخاتم النبیین صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلی آلہ کا تعلق اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ نے اسے لوگوں تک پہنچا دیا کہ اس سے ہدایت حاصل کریں۔ بس یہ قرآن اپنے لفظ ترتیب، اسلوب، علوم، ہدایت ہر لحاظ سے تمام مخلوق کے لئے معجزہ ہے خود محمد صلعم کی قدرت سے باہر تھا کہ اپنی کوشش، معلومات، فصاحت، بلاغت کے زور سے اس قرآن کی جیسی کوئی سورت پیش کر سکیں۔

صحیح حدیثوں میں آتا ہے کہ آنحضرت صلعم جب قرآن تلاوت فرماتے یا آپ پر قرآن پڑھا جاتا تو گریہ طاری ہو جاتا۔ صحاح میں حضرت ابن مسعودؓ کا سورۂ نسا کی آیت فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ

---

[1] اس کتاب کا قلمی نسخہ قصبہ سرائمیر اعظم گڈھ میں میری نظر سے گذرا ہے۔ کتب خانہ حکیم سید مہدی حسین صاحب مؤلف نظام القرآن

أَمَّيْتِ بِشَهِيْدٍ الخ کا پڑھنا بتانا ہے کہ آپ کی آنکھیں بہہ پڑیں اور آپ نے فرمایا حسبک الآن" اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں آپ کے الفاظ کو دخل نہیں اور نہ کبھی آپ اپنے الفاظ سے اس درجہ متاثر ہوتے یہ اللہ ہی کے کلام اور اس کے الفاظ و معنی کی خوبی و برکت ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ کے کلام ہی کا یہ جادو اور اثر تھا کہ قریش نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو منع کر دیا تھا کہ وہ مسجد حرام میں قرآن کو نہ پڑھا کریں کیونکہ اس سے لوگوں کے دل خود بخود مائل ہوتے اور کھنچے جاتے ہیں۔ کلام الٰہی کی جہانگیری ہی کا تو یہ عالم تھا کہ ولید بن مغیرہ کو یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی کہ قرآن ایک ایسا حق ہے جو غالب رہنے والا ہے اور اس پر کوئی اور چیز غالب نہیں ہو سکتی ہے اور قرآن ہر دوسری چیز کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دینے والا ہے۔

یہ اثر اور نفوذ الفاظ و معنی خداوندی کے خصائص میں سے ہے اور منجملہ بہت سی آیات کے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ سب سے بڑا قرینہ ہے کہ قرآن کا اصلی معلم اللہ تعالیٰ ہے گو فرشتہ کے توسط سے ہوا اور آں حضرت صلعم نے الفاظ و معنی کو تلقین فرما کر اسی کی تعلیم بھی دی کیونکہ یہ قرآن بلا شبہ وہی قرآن ہے جو ایک پوشیدہ کتاب میں لکھا ہوا تھا اور جو خدا کی طرف سے رمضان المبارک کی راتوں میں نازل ہوا تھا۔ قرآن خود شہادت دیتا ہے۔ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ۔ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کی زبان سے اعلان کرایا جا رہا ہے اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ یعنی یہ قرآن اپنے الفاظ و معنی کے ساتھ مجھ پر اترا ہے۔ تلاوت اور تبلیغ آیات جس طرح میرے فرائض میں ہے اسی طرح تعلیم اور تبیین آیات بھی ہے میں قرآن کو بجنسہٖ پہنچانے پر مامور اور مکلف ہوں اور جہاں کہیں ضرورت ہوتی ہے اس کی شرح و تفسیر بھی کر دیتا ہوں یہ شرح و تفسیر وحی غیر متلو ہے نہ کہ عین وحی الٰہی۔ اگر ایسا ہوتا کہ میں نے خداوندی مفہوم کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے تو کیا فصحائے عرب و عدنان ایک بات بھی جواباً پیش کرنے میں قاصر ہوتے اور قرآنی تحدی و چیلنج کے سامنے سپر ڈال دیتے؟

لہ الوحی المحمدی لرشید رضا مرحوم

(باقی آئندہ)

وزیر مامون احمد بن یوسف

از

ڈاکٹر خورشید احمد فارق ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی

(۳)

احمد کس طرح ان ماحول میں رچی ہوئی عیش پرستیوں سے بچ سکتا تھا پھر بھی ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اپنی انفرادی زندگی میں وہ عام سطح سے کافی بلند تھا اور اس کا خاص سبب اس کی تربیت اور اس کے گھر کے روایات تھے اس کا باپ یوسف اور اس کا دادا قاسم اپنی اپنی زندگیوں میں کافی معتدل تھے اس کے دادا کی بابت تو یہ تصریح موجود ہے کہ اس نے اپنی ماں کی فہمائش پر شراب پینی چھوڑ دی تھی اور مرتے وقت تک پھر کبھی نہ پی اس ترک میں زیادہ تر خاندانی و اقتصادی مصلحتیں پوشیدہ تھیں، اس واقعہ کا راوی اس کا پوتا ہے وہ کہتا ہے: "میرا دادا جب (عباسی دفتر کے ساتھ کوفہ سے) بغداد آیا تو وہ دوست احباب کی صحبت میں خوب پینے پلانے لگا ایک دن اس کی ماں نے کہا "بیٹے تمہیں معلوم ہے ہمارا کنبہ کتنا بڑا ہے اور تمہارے اوپر کتنا بار ہے۔ اگر تم نے شراب (نبیذ)[۱] نہ چھوڑی تو ہم برباد ہو جائیں گے اور دنیا میں تمہاری جو رسوائی اور آخرت میں تم کو جو سزا ملے گی وہ الگ ہے"[۲]۔ وہ شاعر تھے لیکن انھوں نے ہجو نہیں کی جس سے شاید ہی کوئی شعرگو بچا تھا اور ان کے جو حالات ہم کو معلوم ہوتے ہیں ان سے ان کی سنجیدگی اور سلامت روی کا پتہ چلتا ہے لیکن جس طرح تمدن کے جلوے اور عشرت کی رنگینیاں ترقی کرتی گئیں اسی طرح خاندان کے ہر موسس کی امت بھی خوبیاں کھوتی اور خرابیاں اختیار کرتی گئی قاسم کے مقابلہ میں یوسف اور یوسف کے مقابلہ میں احمد اور احمد کے مقابلہ میں اس کا لڑکا عبداللہ اس

---

[۱] ایک ہی لفظ سے اس دور کی شراب نوشی کی مبالغہ آمیز داستانوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے فی الحقیقت اس دور میں نبیذ نوشی اور شراب خواری میں بہت تفاوت تھا ملاحظہ ہو مقالہ معنوی (برہان ۳ صفحہ ۱۵۳)

سلامت روی میں کرتے گئے جن کے لئے قاسم ممتاز تھا۔

خطیب بغدادی ۲۱۲/۵ نے احمد کی ذہنی، ادبی اور فنی قابلیت کا تعارف ان الفاظ میں کیا ہے:

"احمد مامون کے قابل ترین، خوش فہم ترین، ذکی ترین اور زیادہ سے زیادہ خوبیوں والے سکریٹریوں میں تھا، اس کی گفتگو عمدہ ہوتی، اس کی زبان رواں تھی، اس کے الفاظ خوبصورت ہوتے، اس کا خط دیدہ زیب تھا، غزل، مدح، ہجو میں شعر کہتا تھا، اس کے قصے ابراہیم[1] بن مہدی، ابوالعتاہیہ، محمد بن وغیرہ کے ساتھ مشہور ہیں۔"

سابق سکریٹریوں کی ادبی لیاقت کے بارے میں عباسی سکریٹریوں کی ایک مجلس میں جب گفتگو ہوئی تو سب نے متفقہ طور پر شہادت دی کہ عباسی دور میں احمد اور ابراہیم بن عباس سے زیادہ ادیب اور بلیغ کاتب (سکریٹری) کوئی نہیں ہوا۔ نیز یہ کہ شعر گوئی میں اس عہد کے سکریٹری شعرا میں احمد کا نمبر چوتھا ہے (شروع کے تین ابراہیم بن عباس، عبدالملک زیات، اور حسن بن وھب ہیں)[2] عباسی دور کے ایک ناقد نے کہا: "ہم کہا کرتے تھے کہ محمد بن عبدالملک زیات (متوکل کا وزیر جس کو اس نے قتل کیا) سے پہلے کوئی وزیر احمد سے اچھا شاعر نہیں ہوا"[3] کتاب الاوراق کے مصنف صولی کے دادا نے (جو نہایت عمدہ شعر و سخن کا ذوق رکھتا تھا) یہ رائے دی: نثر و نظم یوسف کے لڑکوں میں بٹ گئی احمد نثر میں اور قاسم (اس کا بڑا بھائی جو جانوروں پر نہایت عمدہ شعر کہتا تھا) نظم میں سب سکریٹریوں سے بازی لے گئے[4]" کہا گیا ہے کہ دس شخص بلاغت میں بے مثال گذرے ہیں ان میں سے ایک احمد تھا۔[5]

صولی نے احمد کے دو صفحے کچھ اوپر شعر دیے ہیں، یہ چیدہ شعر ہیں اور سب کے قریب ان کی توقیعات (توقیع اس الفاظ میں مختصر معنی میں مفصل (یعنی بلیغ) حکم کو کہتے تھے جو وزیر یا خلیفہ سرکاری کاغذات پر ثبت کرتا تھا) خطوط اور بات چیت کے نمونے دئے ہیں ان میں سے پچاس شعر حذف ہے قبت

---

[1] ابراہیم خلیفہ مہدی کا لڑکا تھا، گانے بجانے کا ماہر تھا، شعر گوئی، موسیقی اور تفریح اس کے خاص مشاغل تھے جب مامون نے حضرت علی کے خاندان کے ایک فرد کو خلافت کے لئے نامزد کیا تو عباسی مانڈ بگڑ گئے اور مامون کی بیعت منسوخ کرکے ابراہیم کو خلیفہ بنا دیا، مامون اس وقت خراسان میں تھا اور مامون کے وزیر فضل کو قتل کرا دیا۔ [2] صولی ص۲۲ [3] صولی ص۲۲ [4] صولی ص۲۲ [5] اقتباس از مقدمہ رسائل البلغاء،

اور صنف نازک کے حسن جسمانی کے بارے میں ہیں، اثر نہیں ہجو یلیح یا پہیلیوں پر مشتمل ہیں یہ بڑی رائج الوقت صنف تھی اور بڑا موثر حربہ، پچیس فراق یار اور اسی قدر دوست کی کج ادائیوں پر ناراضی سے متعلق چند شعروں میں محبوب کے دئے ہوئے پھول کی صحبت میں شب باشی کا دل کش نقشہ پیش کیا ہے کچھ میں ان نفسیاتی و عضوی تاثرات کی عکاسی ہے جو اغیار کے سامنے محبوبہ کی ملاقات سے پیدا ہوتے ہیں متعدد اشعار گانے بجانے سے دلچسپی، امرد کا ہتوں سے دلچسپی کے مشعر ہیں۔

توقیعات چونکہ سرکاری احکامات ہیں، خطوط و کلام بھی چونکہ ایک ذمہ دار اور باوقار آدمی کے قلم اور زبان سے نکلے ہیں اس لئے وہ متانت و راستبازی کے مظہر ہیں۔

ہم یہاں ایسے اشعار کا ترجمہ پیش کرتے ہیں جن سے اس کی سیرت و ماحول پر روشنی پڑتی ہے

۱۔ جب مامون نے احمد کو وزیر مقرر کیا تو ایرانی عید نوروز کے موقع پر احمد نے دس لاکھ درہم یعنی پانچ لاکھ روپئے کا ایک تحفہ اس کو بھیجا اور چند شعر لکھے جن کا ترجمہ ذیل میں ہے نوروز یا مہرجان ان کسروی تہواروں میں ایک تھا جن کو عباسی حکومت نے اختیار کر لیا تھا۔ تحفے دینے کی رسم بھی ایران سے آئی تھی اور اس رسم سے بڑے بڑے بڑے ناجائز کام نکالے جاتے تھے۔ درحقیقت یہ ایک مہذب رشوت تھی جو بڑے لوگوں کو دی جاتی تھی۔ جو لوگ تحفے قبول کرتے ایک طرف تو ان کی حسِ برتری اور انانیت کو لطف آتا دوسری طرف اخلاقاً تحفے دینے والے کے ساتھ محابات و نرمی کرنے پر مجبور ہوتے۔ تحفہ دینے والا اگر افسر ہوتا تو سرخروئی اور خود غرضی کے نشہ میں تحفہ کی قیمت اکمیت اور کیفیت بڑھانے کے لئے ماتحتوں کو خوب کھسوٹتا اور یہ ماتحت ٹیکس دینے والوں کو ظلم، بے ایمانی فرائض سے بے توجہی اس کے نتائج تھے جس میں لونڈیاں گانے بجانے اور عشوہ طرازی میں ماہر خصی لڑکے خاص طور پر تحفے میں دئے جاتے خراسان کے گورنر نے بقول مصنف مروج الذہب (اقتباس از ضحی الاسلام ۱/۹) خلیفہ متوکل کو ایک سو نادر غلام اور سو لونڈیاں تحفہ میں بھیجی تھیں۔

غلام پر ایک حق ہے جو وہ ادا کر کے رہے گا چاہے آقا کتنا ہی ذی جلال اور پر عظمت کیوں نہ ہو

(۲)، کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم اللہ کو اس کا دیا ہوا مال تحفہ میں دیتے ہیں اگرچہ وہ سب بے نیاز ہے لیکن

قبول کرلیتا ہے۔ اگر شاہ کو اس کی قدر کے مطابق ہدیہ دینے کی کوشش کی جائے تو

مستعطی اپنی وسعت وظرف کے باوجود اس کا حق نہیں ادا کرسکے گا۔

(۲) ایک ہم عصر آدمی اسحاق بن سعید کی ہجو۔

مجھ سے قطع محبت کرکے مجھ سے دور ہو کر اور انحراف برت کر مجھ پہ احسان کرو اور جب

اپنے محبوب کو تنہائی میں پیار کرو تو خوب خوب میری برائی کرنا اور زانی کے لفظ سے کم

میرے لئے استعمال نہ کرنا، میں نے حد زنا سے تم کو امان دی۔[1]

(۳) محبوب کے ہاتھ کا پھول:۔

کل تم نے اپنے ہاتھ سے نرگس کا پھول دیا رات بھر وہ میرا ہم بستر اور مونس رہا۔ اللہ

نے رات کی تاریکی میں میرے لئے ایک مجلس نشاط فراہم کردی جب اس کی مہک آتی

میں کہتا میرے محبوب کی سانس ہے۔

(۴) ایک امرد کاتب محمد بن سعید کے بارے میں:۔

(۱) محمد بن سعید جو گردن موڑتے وقت سارے جہان سے زیادہ حسین ہو جاتا ہے مجھ

سے روٹھ گیا ہے۔ (۲) بغیر کسی قصور کے مجھ سے منحرف ہو گیا، اس کا سبب پندار حسن

کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

(۵) محمد بن سعید مذکور[2] احمد کے سامنے بیٹھ کر دفتر میں لکھا کرتا تھا ایک دن احمد نے دیکھا کہ اس کے چہرہ

پر داڑھی نمودار ہو گیا ہے اس نے ایک پرچہ پر یہ شعر لکھ کر محمد کے سامنے ڈال دیا:

اے ہالو، خدا تمہارا برا کرے تم نے اس کے چہرہ کو ماتمی لباس پہنا دیا۔

(۲) تم نے اس کے رخساروں کی سرخی پر حملہ کرکے کالا کر دیا۔

لڑکے نے پرچہ کے نیچے لکھ دیا: جناب کو خدا مجھ سے بہتر بدل عطا کرے[3]۔

(۶) فراق کا ایک سین:

---

[1] صولی ص۲۵ [2] دار شاد ۱۴۰/۱ محمد بن حمید، [3] صولی ص۲۱

جدائی سے پہلے جدائی آسان نظر آتی تھی پھر وہ زہر قاتل بن گئی۔

(۲) جدائی کے وقت آنسو اس کے رخسار پر اس طرح تھے جیسے اوس سرخ گلاب پر گر پڑی ہو۔

(۷) احمد مامون کی لونڈی مونسہ سے التفات برتتا تھا۔ مامون کسی بات پر اس سے رو ٹھ گیا اور بارادۂ سفر محل سے شماسیہ چلا گیا اور مونسہ کو ساتھ نہ لیا۔ مونسہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اس نے احمد کے پاس چارہ جوئی کے لئے قاصد بھیجا۔ احمد کو جب حقیقت کا علم ہوا تو گھوڑے پر سوار ہو کر شماسیہ گیا اور مامون کے دارو غہ سے کہلوا بھیجا کہ میں بحیثیت پیغامبر آیا ہوں۔ مامون نے اندر بلا کر پوچھا کیا پیغام ہے؟ اس نے اپنے یہ شعر مونسہ کی طرف سے پڑھ سنائے تا مامون کی ناراضی دور ہو گئی اور مونسہ کو اس نے شماسیہ بلا لیا:-

(۱) آپ کی خفگی پہلے پوشیدہ تھی آج جب کہ آپ مجھے چھوڑ کر شماسیہ چلے گئے، صاف صاف کھل گئی۔

(۲) دشمنوں کے دل کی آرزو پوری ہوتی یہ دیکھ کر میں رہ گئی آپ چلے گئے

(۳) مان لیجئے مجھ سے بھی زیادتی ہوئی لیکن آپ تو ہمیشہ زیادتی سہنے، درگذر کرنے اور مہربانی سے پیش آنے کے عادی رہے ہیں۔

(۸) احمد کو اپنے دفتر کے ایک حسین کاتب سے محبت تھی، کسی دوست نے اس کو ملامت کی تو اس نے یہ شعر کہا:-

وہ اگر میرا چہیتا ہے تو ملامت نہ کرو، کیونکہ ملامت دوست کے شایان شان نہیں

اس لڑکے کو احمد نے کئی دفعہ میں دس لاکھ درہم یعنی تقریباً پانچ لاکھ روپے انعام دئے تھے۔

مردہ پرستی کو مستند سنت کی حیثیت رشید کے جانشین امین نے عطا کی تھی اس کے بارے

۱؎ اصول صفحہ ۲۵۸ ۔ ۲؎ ارشاد الاریب جلد صفحہ ۲۵۷ ۔ ۳؎ ارشاد الاریب ۱۵۸/۱ ۔ ۴؎ بہتر ہوگا کہ اس قسم کی بے حیائی کی اس طرح کے عنوانات سے غیر معمولی مفتحت کا اظہار نہ کرتے۔ (رہبات)

میں طبری نے یہ الفاظ لکھے ہیں: جب محمد یعنی امین خلیفہ ہوا (سنہ ۱۹۳ھ) اور اپنے بھائی مامون کو اپنی خلافت تسلیم کرنے کے لئے لکھا اور اس نے تسلیم کر لی تو اس نے حسین خصی لڑکوں کے کھوج میں لگا بھیجے اور ان کو بڑی بڑی قیمتیں دے کر خریدا اور کھانے پینے امر و نہی (معاملات حکومت) کے سارے امور ان کے سپرد کر دئے اور ان کی ایک ملشیا تیار کی جس کا نام جرادیہ رکھا، دوسری ملشیا حبشی غلاموں کی بنائی اور اس کا نام غرابیہ رکھا اور آزاد عورتوں اور لونڈیوں کو نظر انداز کر دیا حتیٰ کہ ان کی عصمت ملحوظ ہو گئی۔ یہ سنت بمصداق الناس علی دین ملوکہم (لوگ اپنے بادشاہوں کے طور طریق پر چلتے ہیں) حرم خلافت سے نکل کر فروغ پانے لگی اور اس کا ایک فلسفہ تیار ہوا احمد بھی اس سنت کا مقتول تھا اور شاید اپنی خواہش کے علی الرغم۔ ماحول کی ہوائیں جو زہر سرایت کر گیا تھا اس کے اثر سے وہ کیونکر بچ سکتا تھا۔

خلافت عباسیہ

جلد اوّل

تاریخ ملت کا پانچواں حصہ جس میں نو عباسی خلفاء سفاح، منصور، مہدی، ہادی، ہارون امین، مامون، معتصم، اور واثق باللہ کے سوانح حیات ایک خاص اسلوب سے جمع کئے گئے ہیں خلافت عباسیہ کا یہی دور حقیقت میں دورِ عروج تھا اور اس دور میں عباسی خاندان کی قوت و اقتدار کا رعب تمام ہمسایہ سلطنتوں پر چھایا ہوا تھا کتاب کے اس حصہ میں آپ کو نہ صرف ان عظیم الشان خلافتوں کے جامع و مستند حالات و واقعات ملیں گے بلکہ ہر خلیفہ کے عہدِ حکومت اور اس کے علمی مذہبی، تمدنی، اور اصلاحی کارناموں پر دلپذیر تبصرہ بھی ملے گا جس سے مسلمانوں کی سب سے بڑی حکومت کے مرکز بغداد کی عظمت کا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے صفحات ۴۴۴ قیمت غیر مجلد

مجلد للعہ

ادب المفرد امام بخاری کی ایک گراں قدر شرح

از

(مولانا ابو محفوظ الکریم صاحب معصومی استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

امام الائمہ ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن مغیرہ جعفی بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض و برکات سے امت مسلمہ تا قیامت فیض یاب ہوتی رہے گی، دنیائے اسلام میں امام صاحب کی تصنیفات کو خاص اہمیت و مزیت حاصل ہے، الجامع الصحیح کے علاوہ آپ کی مختلف تصانیف[1] ہیں جن میں سے بعض شائع ہو چکی ہیں اور اکثر و بیشتر غیر مطبوع یا مفقود ہیں۔

---

[1] تصانیف کی فہرست مع اسماء رواۃ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ الادب المفرد : راوی احمد بن محمد الجلیل (بلجیم) البزار

۲۔ بر الوالدین : بروایت محمد بن دلویہ الوراق

۳۔ التاریخ الکبیر : یہ کتاب اٹھارہ برس کی عمر میں ضریح نبوی کے پاس چاندنی شب میں تصنیف کی گئی، اس کے دو راوی ابو احمد محمد بن سلیمان اور ابو الحسن محمد بن سہل مسوی قابل ذکر ہیں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔

۴۔ التاریخ الاوسط : بروایت عبداللہ بن احمد بن عبدالسلام الخفاف و زنجویہ بن محمد اللباد اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔

۵۔ التاریخ الصغیر : راوی عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن الاشقر (الہ آباد میں چھپی ہے)

۶۔ خلق أفعال العباد : امام بخاری اور محمد بن یحییٰ ذہلی المتوفی ۲۵۸ھ علی اصح الاقوال، کے درمیان ایک مباحثے سے متعلق رسالہ راوی یوسف بن ریحان بن عبدالصمد اور فربری (دہلی میں طبع ہوئی ہے)

۷۔ کتاب الضعفاء : راوی ابو بشر محمد بن احمد بن حماد دولابی، ابو جعفر مسبح بن سعید اور آدم بن موسیٰ خواری، ملکہ ولاکتابیں علامہ ابن حجر عسقلانی کے مرویات سے ہیں دوسری تصانیف کے نام ائمہ رجال نے ذکر کئے ہیں۔

۸۔ الجامع الکبیر : ابن طاہر نے اس کا ذکر کیا ہے۔

۹۔ المسند الکبیر :

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

امام صاحب کی وہ تصانیف جن کی طباعت ہو چکی ہے، ان میں سے ایک الادب المفرد ہے جس کا نام ابن الندیم نے کتاب الادب اور حاجی خلیفہ نے ادب المفردہ بتایا ہے، امام سیوطی نے اسی کتاب کے منتخب اجزاء کا نام المنتقیٰ من الادب المفرد رکھا تھا

الادب المفرد مصر سے چھپ کر نکلی ہے لیکن اس کی تصحیح و تسوید میں بہت کم اہتمام کیا گیا ہے بنابریں سخت ضرورت تھی کہ اس کی صحیح علمی خدمت کی جاتے، الحمد للہ کہ اس خدمت کا بار گراں ملک کے گرامی قدر فاضل مولانا شاہ فضل اللہ نزیل حیدرآباد دکن نے اپنے سر لیا اور ایک مدت کی پیہم سرگرمی کے بعد اس کی ایک محقق و متین شرح پیش کی ہے، کتاب کا نام "فضل اللہ الصمد فی توضیح الادب المفرد" ہے۔

شارح کی عرق ریزی، محنت شاقہ اور عالمانہ تحقیقات کا اندازہ اہل ذوق حضرات ہی کر سکتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) (۱۰) التفسیر الکبیر: اس کا ذکر ذہبی نے کیا ہے۔

(۱۱) کتاب الاشربۃ: دارقطنی نے المؤتلف والمختلف میں ذکر کیا ہے۔

(۱۲) کتاب الھبۃ: اس کا ذکر امام بخاری کے وراق محمد بن ابی حاتم نے کیا ہے

(۱۳) اسامی الصحابۃ: ابو القاسم ابن مندہ نے اس کا ذکر کیا ہے ابن مندہ نے اس کی روایت بطریق ابن فارس کی ہے، ابو القاسم بغوی نے معجم الصحابہ میں اور ابن مندہ نے کتاب المعرفۃ اور کتاب الوحدان میں اس سے مدد لی ہے

(۱۴) کتاب المبسوط: خلیلی نے کتاب الارشاد میں اس کا ذکر کیا ہے اور یہ بتایا کہ اس کے راوی مہیب بن سلیم ہیں۔

(۱۵) کتاب العلل: ابن مندہ نے اس کی روایت بطریق محمد بن عبداللہ بن حمدون عن ابی محمد عبداللہ بن الشرقی عن البخاری کی ہے

(۱۶) کتاب الکنیٰ: ابو احمد الحاکم نے اس کا ذکر کیا ہے۔

(۱۷) کتاب القراءۃ خلف الامام: راوی محمود بن اسحٰق الخزاعی

(۱۸) کتاب الفوائد: امام ترمذی نے کتاب المناقب میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(۱۹) رفع الیدین فی الصلاۃ: راوی الخزاعی مذکور۔

(۲۰) کتاب السنن فی الفقہ: فہرست ابن الندیم ص ۲۳۰ مصری۔

(۲۱) قضایا الصحابۃ والتابعین: التاریخ الکبیر سے پہلے کی تصنیف ہے، مقدمہ الفتح ص ۴۸۵، خطیب بغدادی ۲/۶

۱ الفہرست ص ۲۳۰ مصری، کشف الظنون ۱/۲۲۳، ذخیرۃ الصحیح نام الادب المفرد ہے چنانچہ منتقیٰ السیوطی کے سامنے یہی نام ہے

ہیں، یہ شرح ہند اور بیرونِ ہند کے اکابر علماء مثلاً مولینا سید یوسف بنوری علامہ مفتی عتیق الرحمن، علامہ عبدالعزیز میمن، سید سلیمان ندوی، سید مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر زاہد، اکرم اور دیگر حضرات بارزہ سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔

کتاب شروع سے آخر تک یکساں طور پر مبسوط تحقیقات سے آراستہ ہے، شارح نے تصحیح، تخریج احادیث، اور ایضاحِ مطالب کے ساتھ ہر حدیث کی سند اور متن پر حسب ضرورت محققانہ کلام کیا ہے جس سے معانی و مطالب کا ہر پہلو جھلک اٹھا ہے، رجال و سنن اور دیگر علم و فن کی مستند مطبوعہ و غیر مطبوعہ نادر کتابوں کے حوالے بکثرت دیتے ہیں ذیل میں شرح کے بعض اقتباسات بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں کہ ان کو بھی اس کی اہمیت و خصوصیت کا اندازہ ہو جائے۔

(الف) مبحث تقبیل الایدی والارجل: امام بخاریؒ نے الادب المفرد کے متفرق مقامات میں اس مبحث سے متعلق احادیث بیان کی ہیں شارح نے ان سب کو اور اس مضمون کی دوسری احادیث و آثار کو جو مختلف کتابوں میں مذکور ہیں یکجا کر دیا ہے، اور ہر حدیث و اثر پر سند و معنی نقادانہ کلام کیا ہے اس طرح اس مسئلہ کی پوری تنقیح و توضیح ہو گئی ہے۔ پوری بحث فل اسکیپ سائز کے اٹھائیس صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے، بہ قصد اختصار اس طویل بحث کا صرف ایک پیراگراف پیش کیا جاتا ہے۔

حدثنا قیس بن حفص قال حدثنا طالب بن حجیر العبدی قال حدثتنی هود بن عبداللہ بن سعد سمع جدہ مزیدۃ العبدی قال جاء الاشج یمشی حتی اخذ بید النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقبلها "الادب المفرد"

اس حدیث کی تخریج امام بخاری نے کتاب التاریخ (۴/۲/۳۱) میں بھی کی ہے کتاب التاریخ میں یہ الفاظ ہیں:-

اتینا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فنزلت الیہ فقبلت یدہ	(ہم لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو میں حضور کے قریب پہنچا اور آپ کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا۔

سند پر جرح | ابن القطان کا بیان ہے کہ مہود (ابن عبداللہ) مجہول الحال ہے، اسی طرح (مطالب) ابن حجر میں مجہول ہے، گویا ابن القطان نے ابن عبدالبر کی توثیق کی طرف دھیان نہیں دیا،

حدیث یزید بن الاسود | امام ترمذی نے یزید بن الاسود کی جس حدیث کی طرف[1] اشارہ کیا ہے وہ مختلف طرق[2] سے مسند امام احمد (۴ / ۱۶۰) میں موجود ہے، لیکن اس میں تقبیل کا ذکر نہیں ہے البتہ ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں :-

ثم ثار الناس یأخذون بیدہ ویمسحون بہا وجوہہم "	(پھر لوگ حضور کا دست مبارک تھامنے لگے اور اس کو اپنے چہروں پر ملنے لگے)

ایک اور روایت میں اسی کے ہم معنی الفاظ ہیں، ان دو کے علاوہ روایتیں اس مضمون سے خالی ہیں ابن الاسود کی روایت صرف ان کے لڑکے جابر سے مروی ہے، پھر جابر سے یعلیٰ بن عطاء کے سوا کسی نے اس کی روایت نہیں کی، جابر کی توثیق امام نسائی، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے کی ہے اسی طرح امام ترمذی نے جابر کی بعض روایات کو صحیح کہا ہے،

تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نسائی ایسے تابعی کی توثیق کرتے ہیں جس سے صرف ایک راوی نے روایت کی اور اس کی روایت کے شواہد و متابعات موجود ہوں، لیکن ایک دو حدیثیں اگر شاہد و متابع کی وجہ سے صحت کو پہنچیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ راوی کے ملکہ صدق و ضبط کی سند ہاتھ آگئی، اس لئے کہ جھوٹے کی روایت کبھی صحیح بھی ہو جاتی ہے اور مغفل کبھی مصیب بھی ہوتا ہے علاوہ بریں ایسے راوی کے متعلق یہ بھی احتمال ہے کہ اس کی ایسی منکر روایتیں بھی ہوں جن کا علم موثق کو نہیں ہوا۔ اگر ان کا علم موثق کو ہوتا تو کبھی اس راوی کی توثیق نہ کرتا، اس قسم کی توثیق سے ایک عامی کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ جب کسی امام جرح و تعدیل نے راوی کی توثیق، اس کی بعض صحیح روایات کی بنا پر کر دی تو اس کی دوسری روایتیں جن کی اطلاع اگرچہ موثق کو نہ ہوئی ہو، صحیح و صحیح بہ ہو گئیں

---

[1] باب قبلۃ الید والرجل ج ۲ ص ۹۰ (مجتبائی)، امام ترمذی نے صفوان بن عسال کی حدیث نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے وفی الباب عن یزید بن الاسود و ابن عمر و کعب بن مالک۔ [2] امام احمد نے ابن الاسود السوائی کی حدیث چھ طرق سے روایت کی ہے (۱) ہشیم (۲) عبدالرحمٰن بن مہدی (۳) یزید بن ہارون (۴) محمد بن جعفر

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

امام نسائی نے مذکورۂ بالا اصول ہی کے مطابق خالد بن سمیر، رافع بن اسحق، زہیر بن الاقمر، اور سوید بن قیس التجیبی وغیرہ کی توثیق کی ہے،

ابن خزیمہ توثیقِ رواۃ میں امام نسائی کے قریب ہیں، لیکن بہ نسبت امام نسائی کے زیادہ وسعت سے کام لیتے ہیں ابن حبان کا دائرۂ توثیق اتنا وسیع کہ تسامح کر جاتے ہیں، امام ترمذی نے تصحیح کی جو شرط مقرر کی ہے وہ بہت خفیف ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان موثقین کی توثیق کے باوجود، ابن المدینی، محمد بن یحیٰی، ابوحاتم، امام احمد جیسے اجلۂ کبار کے نزدیک جابر بن یزید مجہول ہے،

طبقات ائمۂ توثیق | بہتیرے ایسے ائمۂ توثیق ہیں جو صرف راوی کی روایات کا اعتبار کرتے ہیں، اگر کسی راوی کی روایتیں ایسی ہیں کہ ان کی تقویت شواہد و متابعات کے ذریعہ ہو جاتی ہے تو اس کی توثیق کرتے ہیں ان موثقین کے مختلف طبقات ہیں،

اعلیٰ و احوط طبقہ ان موثقین کا ہے جو راوی کی ایک دو حدیث کی صحت پر مطمئن نہیں ہوتے بلکہ اس کی متعدد روایات کے شواہد و متابعات کی تفتیش کرنے کے بعد جب راوی کا صدق و ضبط معلوم کر لیتے ہیں تو اس کی توثیق کرتے ہیں، ابوزرعہ کا شمار اسی طبقہ میں ہے۔

دوسرا طبقہ ان کا ہے جن کے نزدیک توثیقِ راوی کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ راوی کی ایک یا دو حدیث کی تقویت متابع و شاہد سے ہو جائے، اس طبقہ میں ابن معین اور امام نسائی ہیں۔

تیسرا طبقہ ان کا ہے جن کے نزدیک توثیق کے لئے متابع و شاہد کا وجود شرط نہیں بلکہ اتنا کافی ہے کہ حدیث کا مخالف موجود نہ ہو، ابن خزیمہ کا شمار اسی طبقہ میں ہو سکتا ہے، ابن حبان کا تعلق بھی اسی طبقہ سے ہے لیکن وہ ابن خزیمہ سے زیادہ سہولت برتتے ہیں، عجلی اس معاملہ میں اتنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان چاروں کی روایتیں مضمون مسح الید سے خالی ہیں (۵) اسود بن عامر وابی النضر، ان دونوں کے الفاظ شارح نے نقل کئے ہیں (۶) بہز کی روایت کے یہ الفاظ ہیں: فیما نہاہ انہاہم الناس حتی وصلت الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاخذت بیدہ فوضعتہا اما علی جبھتہ او صدرہ (مسند امام احمد ج ۴ ص ۴۲۳)

ڈھیلے ہیں کہ بعض ایسے تابعی کی بھی توثیق کر دیتے ہیں جو عند المحدثین مطعون ہوتا ہے،

(ب) ذیل میں باب ۲۲ فضل صلۃ الرحم، کی دوسری حدیث کی تخریج ملاحظہ فرمائیے، اس کی سند یہ ہے:-

"حدثنا اسمٰعیل بن ابی ادریس قال حدثنی اخی عن سلیمان بن بلال عن محمد بن ابی عتیق عن ابن شہاب الخ"

اس حدیث کی تخریج حاکم نے مذکورۂ بالا اسناد در مسند احمد کی سند ثنا بشر بن شعیب بن ابی حمزہ حدثنی ابی عن الزہری ج ۱ ص ۱۹۴) کے ساتھ ایضاً بطریق ابی الیمان عن شعیب (مستدرک ۴/ ۱۵۸) کی ہے اس کی روایت معاویہ بن یحییٰ صدفی نے بھی امام زہری سے کی ہے جیسا کہ ابن ابی حاتم کی کتاب میں ترجمہ " رداد " سے ظاہر ہے اس کی روایت مسند میں مندرج ذیل سند کے ساتھ کی ہے۔

" ثنا عبد الرزاق ابنا نا معمر عن الزہری حدثنی ابو سلمۃ بن عبد الرحمٰن أن ابا الرداد اللیثی اخبرہ عن عبد الرحمٰن بن عوف " اسی طریق سے محمد بن المتوکل بن ابی السری العسقلانی اور اسحٰق دبری کی روایتیں علی الترتیب ابو داؤد اور ابو عبد اللہ الحاکم (۴/ ۱۵۷) کے یہاں موجود ہیں، ان کے الفاظ " ان رداد اللیثی اخبرہ " ہیں، امام ترمذی فرماتے ہیں : وروی معمر ھذا الحدیث عن الزھری عن ابی سلمۃ عن رداد اللیثی عن عبد الرحمٰن بن عوف " ابن حبان ثقات التابعین میں کہتے ہیں " رداد اللیثی حفظہ معمر " ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ بعض نے " رداد " اور بعض نے " ابو الرداد " کہا ہے (کذا فی النسخۃ)

یہاں دو احتمالات ہیں، ایک یہ کہ معمر نے " رداد " کہا اور عبد الرزاق نے بھی اسی طرح روایت کی لیکن مسند احمد کے راوی ابو بکر احمد القطیعی سے تخلیط واقع ہوئی یا پھر یہ ابن المذہب کی تخلیط ہے

لہ ملاحظہ ہو مسند مطبوعہ ۱/ ۱۹۴ نسخۂ قلمیہ صفحہ نمبر (۱۰)، ایضاً اتحاف المہرۃ نمبر ۳۰۴ (شارح) (۲) سنن ابی داؤد کتاب الزکاۃ باب صلۃ الرحم ہندا مطبع ناجی تہ حاکم نے اس روایت کے بعد کہا ہے : ھذا ابو الرداد اللیثی الخ

جس نے قطعیت سے مسند کی روایت کی ہے، غرض عبدالرزاق کی روایت میں ان اباالرداد "ان میں سے کسی ایک کی تخلیط ہے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ معمر کی روایت کے الفاظ بعینہٖ وہی ہیں جو مسند میں واقع ہیں، لیکن محمد بن المتوکل وغیرہ نے جب عبدالرزاق سے سماع کیا تو انھوں نے "رداد" کہا ترمذی وابو حیان کا خیال ہے کہ یہاں پر خود معمر کو وہم ہوا ہے، بہرحال صحیح ابوالرداد ہے۔

اس کی روایت امام زہری سے سفیان بن عیینہ نے بھی کی ہے، ملاحظہ ہو مسند ج ۱ ص ۱۹۴) اس کے الفاظ یہ ہیں: ثنا سفیان عن الزھری عن ابی سلمۃ قال اشتکی ابو الرداد فعادہ عبدالرحمن بن عوف فقال ابو الرداد اخیرھم واوصلھم ما علمت ابا محمد فقال عبدالرحمن بن عوف الحدیث،

ابن عیینہ کی روایت ترمذی میں بطریق "ابی عمرو سعید بن عبدالرحمن قالا ثنا سفیان بن عیینہؒ . . . . " موجود ہے، حاکم نے مستدرک میں بطریق الحمیدی عن سفیان اور ابوداؤد نے بطریق مسدد وابی بکر بن ابی شیبہ قالا ثنا سفیان . . . . تخریج کی ہے، لیکن ابوداؤد کے سیاق میں قصہ مذکور نہیں بلکہ یہ ہے: قال عن ابی سلمۃ عن عبدالرحمن بن عوف قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم . . . . . .

ابن عیینۃ عن الزہری کی متابعت سفیان بن الحسین نے کی ہے ابن الحسین کی روایت مستدرک حاکم میں ان لفظوں میں موجود ہے: عن ابی سلمۃ قال عاد عبدالرحمن بن عوف ابا الرداد اللیثی فقال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول . . . .

ابن عیینۃ اور ابن الحسین کی روایتوں سے یہ صاف ہوگیا کہ صحیح "ابوالرداد" ہے اب اس روایت کے اتصال وانقطاع سے بحث ضروری ہے،

ابن ابی عتیق، شعیب بن ابی حمزہ، معمر، اور معاویہ بن یحیی الصدفی کی روایات کی بنا پر یہ

لہ عن الزہری عن ابی سلمۃ قال اشتکی ابوالدرداء فعادہ عبدالرحمن بن عوف الخ ترمذی ۲/۱۳/ طبع ہند، ترمذی کے ہندی نسخوں میں بجائے ابوالرداد کے ابوالدرداء لکھا ہے، یہ خطا طبعی ہے

حدیث متصل السند ہوگی اس طرح کہ ابوسلمہ نے ابوالرداد سے سماع کیا اور ابوالرداد نے عبدالرحمٰن بن عوف سے مرفوعاً روایت کی۔

ابن عیینہ اور سفیان بن الحسین کی روایات کی بنا پر منقطع السند ہوگی، اس لئے کہ ابوسلمہ جس واقعہ کی حکایت کررہے ہیں اس کا تعلق عبدالرحمٰن بن عوف اور ابوالرداد سے ہے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی وفات ابوسلمہ کی صغرسنی میں ہوئی لہذا براہ راست حضرت عبدالرحمٰن سے ابوسلمہ کی روایت ثابت نہیں ہوتی اسی طرح ابوداؤد کی روایت میں بھی انقطاع ہے،

یہاں پر ایک امر قابل توجہ یہ ہے کہ امام ترمذی سفیان بن عیینہ کی حدیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"وروی معمر هذا الحدیث عن الزهری عن ابی سلمة عن الرداد اللیثی عن عبد الرحمٰن ومعمر کذا یقول، قال محمد (البخاری) وحدیث معمر خطاء"	"معمر نے اس حدیث کی روایت بطریق زہری کا عن ابی سلمۃ عن رداد اللیثی عن عبدالرحمٰن کی ہے اور معمر اسی طرح کہتے ہیں، محمد (بخاری) کا بیان ہے کہ معمر کی حدیث صحیح نہیں"

اس عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ منشاء خطاء دونوں باتیں ہیں، یعنی رداد کہنا اور وصل سند، یا امام بخاری کا اشارہ صرف اس طرف ہے کہ "رداد کہنا صحیح نہیں، تہذیب میں حافظ ابن حجر، ترمذی کے اس بیان کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ابوحاتم رازی کا بھی یہی قول ہے کہ معروف "ابوسلمۃ عن عبدالرحمٰن" ہے، البتہ ابوالرداد" کا ذکر تصد میں ضرور ہے، اس سے پہلے ابن حجر نے ابن حبان کا قول نقل کیا ہے کہ:

وما احسب معمرا حفظه روی خلف اصحاب الزهری عن ابی سلمة عن عبد الرحمٰن بن عوف	"شاید معمر اس حدیث کو محفوظ نہ رکھ سکے اس کی روایت اصحاب زہری، بطریق ابی سلمہ عن عبدالرحمٰن کرتے ہیں۔

۱۔ ترمذی نے حدیث ابن عیینہ کو صحیح کہا ہے لیکن انقطاع کی بنا پر منذری نے ترمذی کی تصحیح کے متعلق کہا ہے سنظر (عون المعبود ۲/۶۰)

پھر حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ شعیب بن ابی حمزہ کی روایت سے روایت معمر کو تقویت ہوتی ہے لیکن معمر کا "رواۃ" کہنا خطاء ہے۔

ابن حبان نے زہری کے جن اصحاب کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سے ابن عیینہ اور سفیان بن الحسین کی روایتیں تو ہم پا سکے، ان دونوں کے ماسوا اصحاب زہری میں سے کسی اور کی روایت نہیں ملی، مستدرک حاکم میں بھی صرف ان دونوں کی روایتیں ہیں، حالانکہ حاکم ہر باب کی روایات بالاستیعاب ذکر کرنے کے خوگر ہیں، غرض معمر کے خلاف صرف دو راوی ہیں جن میں سے ابن عیینہ روایات زہری میں معمر کے ہم مرتبہ ہیں، ابن معین کے نزدیک معمر اثبت فی الزہری ہیں اگرچہ یحییٰ القطان کے نزدیک ابن عیینہ "احب" ہیں

علاوہ ازیں معمر کے متابع تین ہیں، شعیب جو اثبت الناس فی الزہری ہیں، محمد بن ابی عتیق جن کے متعلق محمد بن یحییٰ جیسے "اعلم الناس بحدیث الزہری" کی شہادت ہے کہ وہ "حسن الحدیث عن الزہری" ہیں، تیسرے متابع معاویہ بن یحییٰ الصدفی ہیں، یہ ضعیف ہیں البتہ ان کی وہ روایتیں جن کے راوی ہقل[1] ہیں قابل قبول ہیں لیکن اس حدیث کے متعلق خبر نہیں کہ ہقل کی روایت ہے یا کسی اور کی،

سفیان بن عیینہ کے متابع صرف سفیان بن حسین ہیں جو "ضعیف فی الزہری" ہیں، معمر اور ان کے متابعین کی روایتیں اگرچہ قوی و ثابت ہیں تاہم سفیان بن عیینہ کی طرف خطاء کی نسبت نہیں کی جا سکتی ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابو سلمہ نے کبھی تو صرف حدیث کو بیان کیا اور کبھی قصہ کی توضیح بھی کر دی لہٰذا زہری کی روایت میں کبھی قصہ بھی موجود ہے اور کبھی صرف حدیث ہے،

خلاصۃ المقال یہ کہ معمر کو خطاوار ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہے، اگرچہ اس قصہ کی وجہ سے پیچیدگیاں بڑھ گئی ہیں لیکن صرف قصہ کی بنا پر معمر اور ان کے متابعین کو خطاوار نہیں کہہ سکتے

---

[1] ہقل (بالکسر) بن زیاد بن عبید اللہ السکسکی، ہقل لقب نام محمد یا عبد اللہ ہے حفاظ متقنین میں سے ہیں سنہ ۱۷۹ھ یا سنہ ۱۸۱ھ تاریخ وفات ہے۔

ابن الجوزی کہتے ہیں کہ اس روایت میں سفیان بن الحسین کو وہم ہو گیا ہے کہ انھوں نے ابراہیم بن عبدالرحمن بن عوف کہا ہے۔ (تنقیح الفہوم ص ۳۱۲)

ج) مستند سطروں میں باب حسن الملک کی حدیث کی تصحیح و شرح تحریر ہوا ہے۔

حدثنا حفص بن عمر قال حدثنا عمر بن الفضل قال حدثنا نعیم بن یزید قال حدثنا علی ابن ابی طالب صلوات اللہ علیہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما ثقل قال یا علی ائتنی بطبق اکتب فیہ مالا تضل امتی بعدہ من بعدہ فخشیت ان تفوتنی نفسہ قال قلت انی احفظ من ذراعی الصحیفۃ وکان رأسہ بین ذراعی وعضدی یوصی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ وما ملکت ایمانکم وقال کذالک حتی فاضت نفسہ وأمرہ بشہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً عبدہ ورسولہ من شہد بہما حرم علی النار

واقعہ کا تجزیہ: اس حدیث میں جو واقعہ مذکور ہے وہ حضرت ابن عباسؓ کے ذکر کردہ واقعہ یوم الخمیس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے حسب ذیل وجوہ کی بنا پر:

(الف) واقعہ یوم الخمیس میں حضور اکرم روحی فداہ کا خطاب صحابہ کرام کی ایک جماعت سے ہے اور اس واقعہ میں صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ الشریف کو خطاب ہے، (ب) یوم الخمیس کے قصہ میں صحابہ کرام کا تنازع مذکور ہے اس واقعہ میں اس کا ذکر نہیں، (ج) اس واقعہ میں صحابہ کو تین باتوں کی وصیت ہے، ان میں سے دو باتیں ذکر کی گئی ہیں۔ اس واقعہ میں ان باتوں میں سے ایک بھی مذکور نہیں بلکہ ان سے دوسری باتوں کی وصیت ہے۔ (د) وہ واقعہ وفات سے چند روز پیشتر یوم پنجشنبہ کا ہے اور مذکورۃ بالا حدیث میں جو واقعہ ہے وہ عین وصال کے وقت کا ہے چنانچہ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ الشریف

لہ من ابن عباس رضی اللہ عنہ قال لما اشتد بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم وجعہ قال ائتونی بکتاب اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعدہ قال عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم غلبہ الوجع وعندنا کتاب اللہ حسبنا فاختلفوا وکثر اللغط قال قوموا عنی ولا ینبغی عندی التنازع فخرج ابن عباس یقول ان الرزیۃ کل الرزیۃ ما حال بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وبین کتابہ۔ البخاری ج ۱ ص ۲۲ (باب کتابۃ العلم) ایضاً ۲/۶۳۸ (باب قول المریض قوموا عنی)

فرماتے ہیں: "فخشیت ان یسبقنی .... وقال کذا حتی فاضت نفسه" سے ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ شاید یہی باتیں ہوں گی جن کو پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم تحریر کروانا چاہتے تھے

تصحیح متن | اس حدیث کی متن غور طلب ہے چنانچہ عبارت "انی لاحفظه ... الصحیفه
وکان رأسه بین ذراعه وعضدی" میں شاید ناسخین نے تخلیط کر دی ہے، اصل عبارت اس
طرح ہوگی "انی لاحفظه وکان رأسه بین ذراعه وعضدی" حاشیہ الاصل میں لفظ "الصحیفه"
کا مطلب " کی تفسیر ہوگی" اسی طرح لفظ "ذراعی" ذراعه کے عوض دوسرا نسخہ ہوگا لیکن ناسخ
نے دونوں نسخوں کو عبارت کا جزو سمجھ کر خلط کر دیا اور اس طرح اصل عبارت مسخ ہو گئی، تصحیح میں
مسند امام احمد کے ان لفظوں سے بھی مدد ملتی ہے: "فخشیت ان تفوتنی نفسه، قال قلت انی
احفظ واعی قال اوصی بالصلاة"

امر ارشادی | فرمان نبوی "ائتنی بکتاب" کا مطلب صرف یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا تو اپنے
خلفاء کی تصریح یا دین کے ضروری احکام لکھانا چاہتے تھے بہر حال یہ امر ارشادی تھا کیونکہ اس
لئے کہ اگر امر وجوبی تھا تو معاذ اللہ حضرت عمرؓ سے خلاف امر نبوی کرنے کی توقع کیسے ہو سکتی ہے یعنی
کے منع کرنے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں سکوت فرماتے علاوہ بریں یہ کہ اس واقعہ کے بعد
چند دنوں تک آپ بقید حیات رہے پس اگر کسی مصلحت کی بناء پر لکھانا ضروری ہوتا تو آپ یقیناً
ضرور لکھا دیتے کیونکہ ان ضروری ہدایات کی تحریر و تفصیل سے پہلے آپ کی وفات کیونکر ممکن ہو سکتی
ہے جن کے بغیر دین کا نظام ناتمام و ناکمل نہ ہو پائے جبکہ آپ پر نبوت ختم تھی، لہٰذا سمجھنا چاہیے کہ
کتابت ہی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مصلحت نظر آئی یا آپ کو خود ہی معلوم ہوا کہ لکھانا
کچھ ضروری نہیں، چنانچہ آپ کے قول "یأبی الله والمؤمنون الا ابا بکر" سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے
رہے احکام تو ان کے لیے استنباط و اجتہاد کا دروازہ شارع علیہ السلام نے کھلا رکھا ہے۔

بعضوں کا خیال ہے کہ حضور پرنور علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی
خلافت کا تحریری حکم نامہ چھوڑ جانا چاہتے تھے لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے خلاف کرنے

اور شدت مرض کے باعث صرف استخلاف فی الصلوٰۃ پر اکتفا فرمایا کہ یہی امامت کبریٰ کی روح اور اصلی جوہر ہے۔

علامہ قرطبی کا بیان ہے کہ اہل تشیع نے بہتیری احادیث حضرت علی کرم اللہ وجہہ الشریف کے وصی [illegible] ہونے کی گھڑلی تھی لیکن خود صحابہ کرام اور ان کے بعد تابعین نے ان کی تردید کی چنانچہ ایک دفعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مجلس میں یہ ذکر آیا تو آپ فرمائیں:

متى أوصى إليه وقد كنت مسندته إلى صدري فدعا بالطست فلقد انخنث في حجري فما شعرت أنه قد مات فمتى أوصى إليه	"پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کب ان کے متعلق وصیت فرمائی؟ جبکہ میں اپنے سینہ سے آپ کو لگائے تھی کہ آپ نے طشت طلب کیا اسی اثنا میں جسد مبارک میری گود میں آ رہا اور میں یہ نہ سمجھی کہ آپ جان بحق ہو چکے پھر کب آپ نے ان کو وصی بنایا۔"

خود حضرت علی نے اپنے وصی ہونے کا دعویٰ نہ تو زمانۂ خلافت سے پہلے اور نہ خلافت ہی کے زمانہ میں کیا، اسی طرح سقیفہ بنی ساعدۃ میں جبکہ صحابہ کرام کا اہم اجتماع ہوا تھا تو اس وقت بھی کسی صحابی نے حضرت علی کے وصی ہونے کا ذکر نہ کیا،

ابن ابی شیبہ اور ابن ماجہ نے بسند قوی حضرت ابن عباس سے ارقم بن شرحبیل کی یہ روایت نقل کی ہے۔

مات رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يوص	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کیا اور آپ نے وصیت نہ کی

حضرت عمرؓ کی روایت "الوفاۃ النبویہ" میں ہے کہ:

۱؎ کذا فی [illegible] مسند البزار (شارح) ۲؎ بخاری (کتاب الوصایا) ۱/ ۳۸۲ مجتبائی، ۳؎ طشت طلب کرنے کی حکایت ترمذی کی اس روایت سے واضح ہو جاتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: فدعا بالطست لیبول فیہ ثم بال فمات صلی اللہ علیہ وسلم (شمائل باب ما جاء فی وفاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ص۲۸ مجتبائی)

مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ ولم یستخلف۔ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور آپ نے کسی کو خلیفہ نامزد نہ کیا۔

بطریق اسود بن قیس عن عمرو بن ابی سفیان عن علی امام احمد اور بیہقی نے "الدلائل" میں تخریج کی ہے کہ حضرت علی جنگ جمل میں نمودار ہوئے تو آپ نے فرمایا:

"یا ایہا الناس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یعہد الینا فی ہذہ الامارۃ شیئا۔" — "اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس "امارت" کے بارے میں کسی قسم کا عہد نہیں لیا۔

وصیت غیر امور خلافت کے ماسوا دیگر امور کی وصیت روایات و سنن میں ثابت ہے، ان وصایا میں سے بعض کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔

امام احمد، ہناد بن السری (فی الزہد) ابن سعد (طبقات) اور ابن خزیمہ نے انفاق الذہبیۃ کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث نقل کی ہے۔ اس حدیث کے بعض طرق کے الفاظ یہ ہیں

"ابعثی بہا الی علی بن ابی طالب لیتصدق بہا" — اس کو علی بن ابی طالب کے پاس بھیج دو کہ وہ تصدق کر دیں"

وصیت کی ایک اور روایت مندرج ذیل ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین باتوں کی وصیت فرمائی (۱) دار ہین، رہاویین اور اشعرین میں سے ہر ایک کو ...... سو وسق خیبر کے دیئے جائیں (۲) جزیرۃ العرب میں دو دین باقی نہ رکھے جائیں۔ (۳) اسامہ اپنی مہم پر بھیجے جائیں"

مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ آنحضرت صلعم نے تین باتوں کی وصیت کی ایک یہ کہ "وفود" کو اسی طرح جوائز دیئے جائیں جس طرح میں دیتا تھا۔ ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ حضور نے کتاب اللہ کی

وصیت فرمائی، حضرت انسؓ فرماتے ہیں:۔

"وفات کے وقت آنحضرت صلعم کی عام وصیت نماز اور "ملک یمین" کی تھی، حضرت انسؓ کا بیان ہے: کہ حضور اکرم نے اس حال میں کہ زبان مبارک سے کوئی کلمہ مشکل سے نکل پاتا تھا، مجھے نماز اور "ملک یمین" کی وصیت فرمائی (اسی روایت کے الفاظ یہ بھی ہیں کہ)، الفاظ سینۂ اقدس میں گھومتے تھے لیکن زبان مبارک ان کو ادا نہ کرپاتی تھی"

مذکورۂ بالا حدیث پر حضرت علیؓ کی وہ روایت شاہد ہے جس کی تخریج ابوداؤد اور ابن ماجہ نے کی ہے، امام احمد و امام بخاری نے اس کتاب میں حضرت علیؓ کی روایت بطریق نعیم بن یزید بیان کی ہے، نعیم کی روایت میں "زکوٰۃ" کا لفظ زائد ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ نے مرض الموت میں فتنوں سے ڈرایا، اور لزوم جماعت وطاعت کی تاکید فرمائی، علاء بن عبدالرحمٰن مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ سرور کائنات صلعم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہ وصیت کی کہ جب میں مرجاؤں تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھو، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے مرض الموت میں حضور اکرم سے یہ درخواست کی کہ وصیت فرمائیں، تو حضور نے فرمایا: اوصیکم بالسابقین الاولین من المهاجرین وابنائهم بعدهم

"میں تم لوگوں کو مہاجرین سابقین اولین اور ان کی اولاد کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرتا ہوں"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے

اذا انا مت فاغسلونی بسبع قرب من بئری بئر غرس وکان یشرب منها

میں جب مرجاؤں بئر غرس کے سات مشک پانی سے مجھ کو غسل دو، یہ کنواں قباء میں تھا اس کا پانی پیا جاتا تھا۔

مسند بزار اور مستدرک حاکم میں آنحضرتؐ کی یہ وصیت بہ سند ضعیف منقول ہے کہ آپ کے جنازہ کی نماز بغیر امام کے" ادا کی جائے (فتح کتاب الوصایا، جلد ۵ صفحہ ۱۷۰) یہ بھی منقول ہے کہ:

لہ عن طلحۃ بن مصرف قال قلت لابن ابی اوفیٰ، اوصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قال لا، قلت وکیف کتب علی الوصیۃ وکیف امر الناس قال اوصی بکتاب اللہ، (حدیث صحیح حسن، ترمذی باب ماجاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوص، ۲/۲۳ مجتبائی)

"لا تجعل قبری وثناً" میری قبر کو بت کی طرح پوجنا شروع نہ کردو"

روایتوں میں آتا ہے کہ وفات کے وقت آپ نے مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ الآیۃ تلاوت کی، امام احمد کی تخریج میں مع الرفیق الاعلیٰ مع الذین انعم اللہ علیھم الآیۃ ہے ایک روایت میں اس طرح ہے:

اللھم اغفرلی وارحمنی والحقنی بالرفیق الاعلیٰ — اے اللہ مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما، اور رفیق اعلیٰ سے مجھے ملا"

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری کلمات "جلال ربی الرفیع" تھے

دفع تعارض: صحیح بخاری میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ روایت ہے

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر اچھی طرح مسواک کرتے کبھی نہیں دیکھی تھی آپ نے فارغ ہوتے ہی ہاتھ یا انگشت مبارک اوپر اٹھاکر فرمایا "فی الرفیق الاعلیٰ" پھر قضا کر گئے، حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں کہ جس وقت آپ کا وصال ہوا، سر اقدس میرے "حاقنہ" اور "ذاقنہ" کے درمیان تھا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے مذکورۂ بالا بیان کو حاکم اور ابن سعد کی تخریج کردہ حدیث کہ آنحضرت سیدنا علی بن ابی طالب کی گود میں واصل بحق ہوئے، سے تعارض ہے لیکن اس حدیث کے تمام طرق میں شیعی راوی موجود ہے لہذا یہ حدیث قابل التفات نہیں ہے، حافظ عینی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو صحیح ماننے پر بھی تعارض ختم نہیں ہو سکتا ہے، اس احتمال کی بناء پر کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اخیر لمحہ تک آنحضرت کے پاس رہے یہاں تک کہ آپ کا وصال ہو گیا اس کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سر اقدس کو اپنے سینہ سے لگائے رکھا

ابن سعد نے جابر بن عبداللہ انصاری سے تخریج کی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں کعب الاحبار نے یہ پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری کلمات کیا تھے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ علی سے پوچھو کعب نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا

تو آپ نے فرمایا:

اسندتہ الی صدری فوضع رأسہ علی منکبی فقال الصلاۃ الصلاۃ،	میں نے آنحضرت کو سہارا دیا اپنے سینہ سے تو آپ نے اپنا سر میرے مونڈھے پر رکھا پھر فرمایا نماز، نماز"

امید کہ اقتباسات باوجود اصل کتاب کے مختلف مباحث کے ترجمہ یا خلاصہ کی صورت میں پیش کئے گئے، شرح کے قیمتی مضامین اور شارح کی علمی و فنی تحقیقات اور ذہنی رجحانات کا ایک اجمالی نقشہ پیش کر دینے کے لئے کافی ہوں گے والحفنۃ تدل علی البیدر الکبیر۔

ادبیات

نغمۂ فطرت

(جناب الم مظفر نگری)

میں حسنِ ازل کا جلوہ ہوں ہر جلوے میں پوشیدہ ہوں
بیدار شبابِ گل میں ہوں اور تاروں میں خوابیدہ ہوں

میں بن کے ہنسی آجاتی ہوں پھولوں کے لبوں پر وقتِ سحر
اک جوشِ تکلم ہوتی ہوں خاموش فضاؤں کے اندر

کلیوں کی صبوحی میں رکھتی ہوں بادۂ رنگیں پوشیدہ
پھولوں کی رگوں میں دوڑاتی ہوں برقِ جمالِ نادیدہ

رقصاں ہوں بگولے جنگل میں یا شمع پہ لرزاں پروانے
میرے ہی اشارے ہیں مخفی یہ دشت و چمن کے ہنگامے

طوفانِ حوادث کی موجوں میں راہ نما بن جاتی ہوں
ہر ڈوبنے والی کشتی کو ساحل کی راہ دکھاتی ہوں

میں رازِ بقائے ہستی ہوں احکامِ فنا کے دامن میں
ذروں سے اگاتی ہوں لالے صحرا کو سجا کے گلشن میں

یہ پھولوں کے برگِ لرزاں کچھ ٹکڑے ہیں پیمانوں کے
کچھ آنسو شمعِ محفل کے کچھ داغِ جگر پروانوں کے

یہ کہنہ کھنڈر یہ ویرانے آثار کسی محفل کے ہیں
ہر موج رواں کے قطروں میں ذرے خاک ساحل کے ہیں
دستورِ نظامِ ہستی سے واقف ہی نہیں لیکن انساں
یہ اس کی نظر سے مخفی ہے تخریب میں ہو تعمیر نہاں

تغیر کا قانونِ ازلی ہے اس کی نگاہوں میں خطرا
محفوظ ہے اس کی روح مگر وہ موت سے ہے گھبرا جاتا
آ میری طرف غافل انساں گمراہ نہ ہو اس منزل میں
دکھلاؤں تجھے عینِ منزل ہر ذرۂ جادۂ باطل میں

قطرے کی نازک موجوں کے دامن میں دریا پنہاں ہے
ذرہ نہ سمجھ ہر ذرے کو خورشیدِ حقیقت تاباں ہے
ہو شام کہ صبحِ نورانی سب حسنِ ازل کے جلوے ہیں
معمور نواؤں سے اس کی سازِ ہستی کے پردے ہیں

جب ایک حقیقت کے پرتو ہیں دونوں جہاں کے نظارے
تمیزِ غلط کا مجرم تو ہوتا ہے جہاں میں کیوں پیارے

جذبات مائل

(جناب مائل انصاری خیرآبادی)

لے جاتے ہیں دل اہلِ وفا کے	کیسے بیٹھے ہو مٹی میں ملا کے
ڈراتے ہو انھیں خنجر دکھا کے	ازل سے منتظر ہیں جو قضا کے
وہ سچنے کر رہے ہیں عاشقوں کو	بہر انداز و غمزہ آزما کے
مسلماں کی نظر اللہ اکبر!	ذرا اٹھی کہ رخ بدلے ہوا کے

"بتوں کی بندگی" اور تجھ سے مائل!
مگر اللہ اللہ اے بندے خدا کے!

تبصرے

مرزا شوق لکھنوی از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی - دہلی یونیورسٹی تقطیع خورد ضخامت ۸۸ صفحات کتابت، طباعت، کاغذ نفیس قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کے پتے :- (۱) مکتبہ برہان، اردو بازار - جامع مسجد - دہلی ۶ (۲) محمد اسلم ۵۔ عمادالملک روڈ یونی ورسٹی) علی گڑھ (۳) علمی کتاب خانہ اردو بازار - دہلی ۶

نواب مرزا شوق لکھنوی اردو کے ان بدنام شاعروں میں سے ہیں جن کی کتابیں ایک عرصہ تک ممنوع الاشاعت رہیں اور ان کو پڑھنا معیوب سمجھا گیا لیکن عجیب لطیفہ ہے کہ اس "رندِ خراباتی" کے خلاف تعصبات کو دور کرنے میں جس نے پہل کی وہ اردو کا نامور نقاد اور صاحب طرز ادیب حالی تھا، جس کے "زاہد مناجاتی" ہونے میں شبہ نہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری کے یہ الفاظ دہرانے کے لائق ہیں۔

"نواب مرزا شوق نے جو . . . مثنویاں . . . لکھی ہیں ان کو میں روزمرہ اور محاورہ کی صفائی، قافیوں کی نشست، ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے تمام اردو کی موجودہ مثنویوں سے بہتر سمجھتا ہوں"

اس کے بعد مولانا عبدالماجد دریاآبادی مدیر صدق نے سہیل مرحوم میں ایک معرکۃ الآرا مضمون اردو کے ایک بدنام شاعر" کے عنوان سے لکھا اور ساری اردو دنیا کو شوق کی طرف متوجہ کر دیا، یہ بھی دراصل حالی کے قلم کی آواز بازگشت تھی جو عبدالماجد جیسے نقاد اور سنجیدہ ادیب کے لئے دلیل راہ بنی۔

لیکن یہ کوشش مختصر مضامین اور اشارات تک محدود رہیں مرزا شوق کی اہمیت اس

کی سفارشی تھی کسان کے نتائج فکر پر ایک علیحدہ اور مستقل کتاب لکھی جاتی جس سے ان کے کمالات کا اندازہ ہوتا اور جدید تنقید کا بھی پورا حق ادا ہو جاتا خصوصاً ان کی مثنوی بہارِ عشق کہ اس کی ذمہ بھی ابھی تک کسی صاحب ذوق ... قلم اور کے شانہ شفقت کی منت پذیر تھیں ہمیں خوشی ہے کہ خواجہ احمد فاروقی صاحب ایم۔ اے جیسے شگفتہ مزاج صاحب قلم نے ادھر توجہ کی، موصوف نے اس کی کوشش کی ہے کہ مرزا شوق کی مثنویوں کو ان کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ جانچیں اور ان کی صحیح قدر و قیمت متعین کریں۔

مرزا شوق کی مثنویاں زہر عشق اور بہار عشق، جان عالم واجد علی شاہ کے اس لکھنؤ سے متعلق ہیں جب بقول پروفیسر فاروقی۔ فیض نسیم اور جلوۂ گل کی کمی نہیں تھی۔ ہر منظر، جنت نگاہ اور ہر گوشہ بدامانِ باغباں بنا ہوا تھا۔ جہاں نظارۂ جمال بھی تھا اور شوقِ وصال بھی، جام بلور بھی تھا اور زہرۂ صبح بھی۔ صراحیِ مے ناب بھی تھی۔ اور سفینۂ غزل بھی۔ لوگ ماضی و مستقبل کو حال کی بد مستیوں اور رنگینیوں میں بھلا چکے تھے اور دست افشانی اور پاکوبی کا مفہوم صرف یہ رہ گیا تھا کہ۔

بیا تا یک امشب تماشا کنیم — چو فردا شود، فکرِ فردا کنیم

فاروقی صاحب نے جا بجا اس بات پر زور دیا ہے کہ ان مثنویوں کو انیسویں صدی کے اس طول سے جب کہ زندگی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کا سارا رس نچوڑ لیا گیا تھا الگ کر کے دیکھنا تاریخ اور تنقید دونوں کا خون کرنا ہے"

لیکن فاضل نقاد کی نظر صرف واجد علی شاہی لٹریچر کی منفی رنگینیوں میں الجھ کر نہیں رہ گئی ہے انھوں نے اس کے مثبت پہلوؤں پر بھی نظر ڈالی ہے۔

فاروقی صاحب نے مرزا شوق کی کردار نگاری، زبان و بیان اور آرٹ سے بھی مفصل بحث کی ہے اور مقام مسرت ہے کہ انھوں نے اس کاوش بنا کر اس کی پرستش نہیں کی بلکہ جہاں کہیں پہلو نظر آئے ہیں ان پر بے جھجک نکتہ چینی کی ہے۔

شوق کی زبان ایسی پاکیزہ ہے کہ دنیائے اردو اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔

یہ کمال معمولی نہیں ہے کہ اس نے اس میٹھی بول چال کے راگ اس وقت چھیڑے جب ناسخ کا طوطی بول رہا تھا۔ اور اہل دربار سے لے کر عوام تک سب اسی کی تقلید کو فخر سمجھتے تھے۔ شوق کی بالغ نظری کی داد دینی چاہئے کہ آج زبان کا کارواں اسی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

مؤلف کی زبان جرأت وجلال اور حسن وجمال کا آمیزہ ہے اور ان کی رائے میں بڑی حد تک توازن واعتدال ہے۔

سچ تو یہ ہے فاروقی صاحب کا ادب لطیف کے عطر میں مہکتا ہوا یہ شاہکار دیکھ کر اب سے چھتیس سینتیس سال پہلے کے عہدِ طفولیت کا نقشہ آنکھوں میں گھوم گیا اور زمانۂ شباب کے دھندلے دھندلے سائے امنڈتے نظر آنے لگے، یہ وہ زمانہ تھا کہ مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق کا گھر گھر چرچا تھا اس کی اشاعت ممنوع قرار دی جا چکی تھی اور زندہ دل یا یوں کہہ لیجئے کہ دھجا آفریں ادب کے دل دادہ اسے پوشیدہ خرید کر پڑھتے اور سر دُھنتے تھے،

ہمارے فارسی کے باکمال استاذ مولانا محمد یٰسین صاحب مرحوم خدمتِ درس کے ساتھ کتابوں کا کاروبار بھی کرتے تھے یہ کاروبار اپنی گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے بے حد دلچسپ تھا، موصوف کی عادت یہ تھی کہ ہر جمعرات کو ایسے لڑکوں کو اپنے قریب نصف دائرے کی شکل میں بٹھایا کرتے تھے جن کو کتابیں پڑھنے اور خریدنے کا شوق ہو خوش قسمتی سے میرا شمار بھی ایسے ہی طلبا میں تھا ہم سب ساتھی بے پناہ ادبی کتابیں خریدتے اور ایک ایک ناول بار بار پڑھتے تھے، شرر، راشد الخیری، پریم چند اور اس وقت کے تقریباً تمام مشہور ناول نویسوں کی کتابیں مطالعے میں رہتی تھیں موصوف کے پاس زہر عشق کا بھی خفیہ ذخیرہ رہتا تھا چنانچہ ہم نے یہ دل دوز مثنوی سب سے پہلے اپنے استاذ ہی سے خریدی اور اس کے بہت سے متفرق حصے حفظ یاد کر لئے، ۳۶ سال کے بعد یہ نظم کتاب سامنے آئی تو اس کے جستہ جستہ ٹکڑے بے ساختہ یاد آ گئے۔

بنا بریں لائق مؤلف کا مجھے شخصی طور پر بھی مرہونِ احسان ہونا چاہئے کہ ان کے رعایت میں ڈوبے ہوئے ادب پاروں کے دیکھنے سے ایک ایسے زمانہ کی یاد تازہ ہو گئی جسے دنیا کی اوقات

کا نام کہا گیا ہے اور جس میں فکر فردا کے گرد و غبار کا کہیں آس پاس بھی گذر نہیں ہوتا۔

آخر میں اس حقیقت کا قدرے استعجاب کے ساتھ اظہار کر دینا بھی شاید کچھ زیادہ نامناسب نہیں ہوگا کہ "قحط سالی" اور ہنگامہ خیزی کے اس دور میں ہمارے نہایت سنجیدہ پروفیسر نے عشق و محبت کے اس تاریخی سبق کو جو اچھے وقت میں بھی گھر کے گھر خالی کر دینے کا عادی ہے کیوں کر دہرانا پسند کیا شاعری بذاتہ گو اچھی بری نہیں ہوتی لیکن شاعری کی اخلاقیت Moral ہمہ قسم کی حدود سے آزاد نہیں ہو سکتی،

یہ گلدستۂ عشق و محبت جناب نیاز فتح پوری کے مفید مقدمہ اور جناب جوش ملیح آبادی کے دیباچہ کے ساتھ نگار بک ایجنسی سے شائع ہوا ہے۔　　ع۔س

رہنمائے انسانیت یعنی دین فطرت

از جناب صفوۃ الحق صاحب صابر مدیر الحق تقطیع کلاں کتابت وطباعت بہتر ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲؎ پتہ:۔ ادارہ الحق ڈیوڑھی شہریار جنگ محلہ سلطان شاہی ڈاکخانہ شاہ علی بنڈہ حیدرآباد دکن۔

مختلف اسباب و وجوہ سے مسلمانوں میں آج کل عقیدہ و عمل کی بہت سی گمراہیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کے باعث ان کا شیرازۂ ملی پراگندہ ہو کر رہ گیا ہے مثلاً کچھ لوگ ہیں جو وحدت ادیان کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ مروجہ مذاہب عالم میں سے کوئی شخص کسی بھی مذہب کی پیروی کرے اس کی نجات ہو جائے گی کسی حلقہ میں دین اور سیاست ان دونوں کو الگ الگ دو حقیقتیں تسلیم کیا جاتا ہے کہیں تصوف کے رموز عارفانہ کو اصل اسلام مانا جاتا ہے اور کہیں سرے سے مذہب کو ہی غیر ضروری چیز قرار دے دیا گیا ہے یا اور اس قسم کے بہت سے افکار و عقائد ہیں جن کی اس کتاب میں تردید کر کے اسلام کی اصل تعلیمات کی نشان دہی کی گئی ہے اس سلسلہ میں عبادات اور اسلامی اخلاق و فضائل کی تشریح و توضیح اور ان کے رموز و حکم پر بھی گفتگو ہوئی ہے اس اعتبار سے لائق مصنف کا مقصد بے شبہ نیک اور قابل داد ہے اور خود کتاب بھی بہت سی ایمان پرور معلومات پر مشتمل ہے لیکن مصنف کا عام طرز تحریر استدلالی و برہانی ہونے کے

بجائے محض خطابی اور جدلیاتی ہے اس بنا پر اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو پہلے سے مصنف کے ہم خیال ہوں علاوہ بریں کتاب افراط و تفریط سے بھی پاک نہیں ہے متعدد مقامات پر مصنف کا قلم اعتدال کے راستہ سے ہٹ گیا ہے مثلاً کفر، شرک اور نفاق کے جو وسیع معانی انھوں نے بیان کئے ہیں ان کے پیش نظر غور کرنا ہوگا کہ دنیا کے کروروں مسلمانوں میں سے اصل مسلمان کتنے سو یا کتنے ہزار ہیں۔ پھر بعض جگہ بعض حقائق کی تعبیر بھی غلط یا بالکل یک طرفہ ہے ملاحظہ ۳۵ پر سیاست کی یہ تعریف کرنا کہ "ہم رب و مولا کے عہد ملوک و محکوم بن کر اس کے نافرمان بندوں پر حکومت کریں" یا ملاحظہ ۲۱ پر لفظ سیاست کی یہ "نئی لغوی تحقیق کہ "خود آزاد رہ کر دوسروں کو اپنا محکوم و غلام بنانا" نہ صرف یہ کہ غلط اور بے بنیاد ہے بلکہ اسلام کی اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے ان الحکم الا للہ کے مطابق حاکمیت صرف اللہ کے لئے ہے۔ اسی طرح مصنف نے متعدد مقامات پر اسلام کی حقانیت پر زور دیتے ہوئے دوسرے مذاہب و ادیان کو بالکل باطل اور غلط کہا ہے۔ مصنف کا یہ دعویٰ بھی نہ مطلقاً صحیح ہے اور نہ قرآن کے ارشاد کے مطابق ہے۔ اگر سب مذاہب بالکل غلط ہیں تو آخر وہ کیا چیز ہے جس کی طرف قرآن غیر مسلموں کو تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم کہہ کر دعوت دے رہا ہے مصنف نے زور قلم میں بعض ایسے اہم مسائل کو بھی چھیڑ دیا ہے جو بظاہر ان کی بساط سے باہر ہیں مثلاً ملاحظہ پر عالم آخرت کے جسمانی اور روحانی ہونے کی بحث ایسی نہیں جو محض تحدی آمیز چند جملوں سے طے ہو جائے سلف میں بڑے بڑے علماء روحانی ہونے کے قائل ہیں۔ ملاحظہ ۲۲ سے لے کر ملاحظہ ۳۵ تک مصنف نے دو کالم بنائے ہیں جن میں سے پہلے کالم میں نمبروار باطل افکار اور دوسرے کالم میں ان کے مقابلہ میں الٰہی قرآنی تعلیمات بیان کی گئی ہیں اس حصہ میں بھی بعض چیزیں مثلاً نمبر ۴-۶-۸-۹ ایسی ہیں جن پر مفصل اور جامع گفتگو کی ضرورت تھی۔ چند سطروں سے ان مسائل کا حق ادا نہیں ہوتا اور گفتگو بالکل یک طرفہ ہو گئی ہے۔ ان چند خامیوں اور فروگزاشتوں سے قطع نظر کتاب بحیثیت مجموعی مطالعہ کے لائق اور مفید ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہیرو از محترمہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی۔ تقطیع خورد کتابت طباعت بہتر ضخامت ۱۱۲ صفحات قیمت عہ پتہ:۔ تکیہ مصنف علی گڈھ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جن مجاہدین وطن نے انگریزوں سے سرفروشانہ مقابلہ کیا تھا ان میں نواب واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل، جنرل بخت خاں اور جنرل محمود خاں بھی ہیں اس کتاب میں انھیں تینوں کے مختصر حالات مع ان کے کارناموں کے بیان کئے گئے ہیں اس ضمن میں خاندان اودھ کی مختصر تاریخ اور اس دور کے چند اور دوسرے مجاہدوں کے حالات کا تذکرہ بھی آگیا ہے، زبان و بیان صاف و سلیس اور شگفتہ و دلچسپ ہے۔ ایک سنجیدہ موضوع پر اور اس پیرایہ میں ایک خاتون کے قلم کی یہ کاوش بہرحال لائق تحسین و آفریں ہے۔ موجودہ دل شکستگی کے زمانہ میں مسلمانوں کے لئے اس کا مطالعہ حوصلہ و ولولہ پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔

خلافت عباسیہ

جلد دوم ۔ تاریخ ملت کا چھٹا حصہ جس میں اٹھائیس۲۸ حکمرانوں متوکل سے لے کر مستعصم تک کے تمام تاریخی حالات بڑی کاوش سے جمع کئے گئے ہیں اس حصے میں بھی پہلے حصے کی تمام خصوصیتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے واثق باللہ کے زمانے تک ایک صدی کو چھوڑ کر عباسی خلافت کے ۴۲۴ سال کے دور حکومت کی تاریخ آپ کو اس میں ملے گی جس سے اندازہ ہوگا کہ بغداد جو مسلمانوں کی عظمت و اقتدار کا گہوارہ اور مشرقی ملکوں کا سرتاج تھا کس طرح ویران و پراگندہ ہوکر ان منتشر جماعتوں کا مسکن ہوکر رہ گیا جو ہلاکو خاں کی فوج کے ساتھ آئی تھی سلاطین بویہ، سلاجقہ زنگی، ایوبی، علویین، باطنیہ وغیرہ ہم عصر دول اسلامیہ کے حالات کا جامع خلاصہ بھی آپ کو اس کتاب میں ملے گا کتاب کے آخر میں عباسی خلافت کے تمام دوروں پر ایک سیاسی اور تاریخی نظر ڈالی گئی ہے جو کم دلچسپ نہیں۔ یہ حصہ مشتمل ہے صفحات ۴۷۶ قیمت غیر مجلد چار روپیے بارہ آنے قیمت مجلد پانچ روپیے

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

خلافتِ راشدہ: تاریخ ملت کا دوسرا حصہ جدید ایڈیشن

قیمت ے مجلد ے مضبوط اور عمدہ جلد للعہ

سنہ: مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول

لغتِ قرآن پر بے مثل کتاب ے مجلد للعہ

سرمایہ: کارل مارکس کی کتاب کیپٹل کا ملخص شستہ

ورفتہ ترجمہ، جدید ایڈیشن قیمت عہ

اسلام کا نظامِ حکومت۔ اسلام کے ضابطہٴ حکومت

کے تمام شعبوں پر دفعات وار مکمل بحث ے مجلد عہ

خلافتِ بنی امیہ: تاریخ ملت کا تیسرا حصہ ے

مجلد ے مضبوط اور عمدہ جلد للعہ۔

سنہ: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت

جلد اول۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب للعہ مجلد صہ

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت

جلد ثانی للعہ مجلد صہ

قصص القرآن حصہ سوم انبیاء علیہم السلام

کے واقعات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی۔ للعہ مجلد صہ

مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد ثانی ے مجلد للعہ

سنہ: قرآن اور تصوف۔ حقیقی اسلامی تصوف

پر جدید اور محققانہ کتاب عہ مجلد ے

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا بیان صہ مجلد ے

انقلابِ روس۔ ے

سنہ: ترجمان السنہ:۔ ارشاداتِ نبوی کا جامع

اور مستند ذخیرہ جلد اول عہ مجلد

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد سوم

للعہ مجلد صہ

مسلمانوں کا نظمِ مملکت للعہ مجلد صہ

تحفۃ النظار یعنی خلاصہ سفرنامہ ابنِ بطوطہ

قسم اعلیٰ ے قسم دوم دو روپے آٹھ آنے۔

مارشل ٹیٹو: یوگوسلاویہ کی آزادی اور انقلاب پر

نتیجہ خیز اور دلچسپ کتاب۔ دو روپے۔

مفصل فہرستِ کتب دفتر سے طلب فرمائیے

اس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل

بھی معلوم ہوگی۔

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ

NADWATUL MUSANNEFIN

Urdu Bazar Jama Masjid Delhi.

Registered No. L. 4305.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دھلی

(۱) محسنِ خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچسو روپے یکشت مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

(۲) محسنین۔ جو حضرات پچیس روپے سال مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے، ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارہ کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

(۳) معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے سال پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالۂ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

(۴) احبا۔ نو روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے احبا میں داخل ہوں گے ان حضرات کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور ان کی طلب پر اس سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

قواعد

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ زبان وادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے، وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کیلئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے

مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان دہلی [illegible] سے شائع کیا۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین دہلی کی مذہبی اور تاریخی مطبوعات

ذیل میں ندوۃ المصنفین دہلی کی چند اہم دینی، اصلاحی اور تاریخی کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے
مفصل فہرست جس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی دفتر سے طلب فرمائیے۔

اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ جدید ایڈیشن جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں۔ قیمت [illegible]، مجلد [illegible]

سلسلہ تاریخ ملت۔ مختصر وقت میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ سلسلہ نہایت مفید ہے۔ اسلامی تاریخ کے یہ حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع بھی۔ انداز بیان نکھرا ہوا اور شگفتہ

نبی عربی صلعم تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دلنشیں انداز میں یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

خلافت راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ) عہد خلفائے راشدین کے حالات و واقعات کا دل پذیر بیان۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

خلافت بنی امیہ (تاریخ ملت کا تیسرا حصہ) قیمت [illegible] مجلد [illegible]

خلافت ہسپانیہ (تاریخ ملت کا چوتھا حصہ) قیمت [illegible] مجلد [illegible]

خلافت عباسیہ۔ جلد اول (تاریخ ملت کا پانچواں حصہ) قیمت [illegible] مجلد [illegible]

خلافت عباسیہ۔ جلد دوم (تاریخ ملت کا چھٹا حصہ) قیمت [illegible] مجلد [illegible]

خلافت مصر تاریخ ملت کا ساتواں حصہ سلاطین مصر کی مکمل تاریخ صفحات ۳۰۰ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

فہم قرآن۔ جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

غلامان اسلام اسی سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان۔ جدید ایڈیشن قیمت [illegible] مجلد [illegible]

اخلاق و فلسفہ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دل نشیں اور سہل کیا گیا ہے۔
قیمت [illegible] مجلد [illegible]

قصص القرآن جلد اول تیسرا ایڈیشن حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات و واقعات تک۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

قصص القرآن جلد دوم۔ حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ کے حالات تک تیسرا ایڈیشن۔
قیمت [illegible] مجلد [illegible]

قصص القرآن۔ جلد سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان۔
قیمت [illegible] مجلد [illegible]

برہان

جلد بست و پنجم شمارہ (۳)

ستمبر ۱۹۵۰ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۶۹ھ

فہرست مضامین

نظرات

افسوس ہے گذشتہ مہینہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے ۸۹ سال کی عمر میں وفات پائی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد جن اکابرِ علم و ادب نے اس ملک میں مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کا سرو سامان کیا تھا مولانا ان کے زمرہ میں ایک نوجوان رفیق کی حیثیت سے شامل تھے اس لئے انھوں نے اس دور کی بہار سامانیاں خود اپنی آنکھ سے دیکھی تھیں اور اپنی خداداد صلاحیت و قابلیت سے کام لے کر ان کی تعمیر ترقی میں خود بھی عملی حصہ لیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ندوۃ العلماء، دار المصنفین اعظم گڑھ، مسلم ایجوکیشن کانفرنس، دار العلوم دیوبند، حیدر آباد کا محکمہ امور مذہبی یہ سب ادارے مرحوم کی اصلاحی و تدبیری کاوشوں اور گوناگوں ہمدردانہ دلچسپیوں کے جولانگاہ تھے، دولتِ زر کی بہتات کے ساتھ دولتِ علم و فضل سے بھی مالامال تھے، مرحوم کا کتب خانہ ہندوستان کا ایک بہترین کتب خانہ تھا جہاں ریسرچ اسکالر آ کر مطالعہ و تحقیق کی تشنگی بجھاتے تھے کتابوں کی حفاظت و نگرانی اور ان کی ترتیب و فہرست سازی کا خاص اہتمام کرتے تھے ذوقِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ ضعف و نقاہت اور بیماری کے باوجود روزانہ چند گھنٹے کتابخانہ میں پابندی کے ساتھ بیٹھتے اور مطالعہ کرتے تھے متعدد کتابیں اور بہتیرے مقالات بھی ان کے قلم سے نکلے، اردو کے صاحب طرز ادیب تھے۔ فارسی اور عربی شعر و ادب کا شگفتہ ذوق رکھتے تھے دینداری اور مذہبی شعائر و آداب کا احترام ان کی فطرت تھی اخلاق و عادات، طور و اطوار کے لحاظ سے اب سے ڈھائی سو تین سو برس پہلے کی اسلامی تہذیب و شرافت کا زندہ نمونہ تھے خودداری کے ساتھ ملنساری، تمکنتِ عز و جاہ کے ساتھ اربابِ علم و ادب کے ساتھ انکساری ان کی طبیعت کا جوہر تھا انھوں نے اپنے علم و فضل سے بھی خلقِ خدا کو فیض پہنچایا اور دولت و ثروت سے بھی ان چند در چند خصوصیات و کمالات کے جامع ہونے کے اعتبار سے مرحوم مسلمانوں کے اس دورِ میمون و مبارک کی یادگار تھے جبکہ لوگ "صاحب السیادتین" ہوا کرتے تھے لیکن

ہوتے تھے اب جو اس چمن میں موسم خزاں کا دور دورہ اور باد صرصر کی تباہ کاریوں کا غلبہ ہے توقع نہیں کہ ایسے جامع کمالات بزرگ پھر کبھی دیکھنے میں آئیں گے۔ صد حیف کہ جو مسند خالی ہوتی جاتی ہے اسے پر کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا حق تعالیٰ اس مرحوم کو بیش از بیش رحمتوں سے نوازے اور مقربین و صلحا میں مقام نصیب فرمائے۔ آمین۔

اس سلسلہ میں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ بعض اخبارات نے اپنے تعزیتی نوٹ میں نواب صاحب مرحوم اور مولانا آزاد کے تعلقات کا بھی خاص اہتمام سے تذکرہ کیا ہے۔ گویا مولانا آزاد کا "صدیق حبیب" ہونا بھی ایک فضیلت ہے حالانکہ گستاخی معاف! مولانا مدظلہ کے دیرینہ نیاز کیشان محبت کا تجربہ تو یہ ہے کہ مولانا کا "صدیق" ہونا فضیلت نہیں بلکہ ایک لطیف قسم کا ابتلا ہے۔

جس کے تم دلبر ہو جس دل میں تمہاری یاد ہو وہ ہمیشہ خاک چھانے اور سدا برباد ہو

یاد ہوگا ۱۹۴۸ء کے آخر میں بھارت گورنمنٹ نے یونیورسٹی تعلیم کی اصلاح و تجدید کے لئے ایک کمیشن سر رادھا کرشن کی صدارت میں جو ملک کے مشہور فلسفی اور انگریزی زبان کے شعلہ بیان مقرر ہیں مقرر کیا تھا اس کمیشن نے جو یونیورسٹی کمیشن کے نام سے معروف ہے نو مہینہ کی محنت و جانکاہی کے بعد ایک نہایت ضخیم رپورٹ مرتب کی جس کی پہلی جلد جو بڑی ضخامت کے ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ہے گورنمنٹ کی طرف سے چند ماہ ہوئے شائع ہو چکی ہے کمیشن ہندوستان اور بیرونی ممالک کے نامور ماہرین تعلیم پر مشتمل تھا اس بنا پر رپورٹ بھی نہایت جامع اور کامل اور تعلیمی مسائل و مباحث پر ایک دقیق مبصرانہ تنقید و تجزیہ کی حامل ہے اس میں شبہ نہیں کہ وزارت تعلیم کا یہ کارنامہ بجائے خود صد درجہ قابل قدر و ستائش ہے ضرورت ہے کہ اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہوتا تاکہ اردو کا وہ طبقہ جو انگریزی نہیں جانتا وہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا۔

رپورٹ میں "ذریعہ تعلیم کون سی زبان ہونی چاہئے" اس موضوع پر ۲۲ صفحات میں بڑی سیر حاصل اور فاضلانہ بحث ہے جس میں بھارت کی ہر قابل ذکر زبان کی وسعت اور اس کی استعداد و صلاحیت پر گفتگو کی گئی ہے اس ضمن میں ایک مقام پر ہندی اور اردو کا تقابلی تذکرہ بھی آگیا ہے۔ ہم ذیل میں اس

ٹکڑہ کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

"ہندی اقلیت کی زبان ہے اگرچہ یہ ایک بڑی اقلیت ہے بدقسمتی سے ادبی اعتبار سے یا تاریخی لحاظ سے اس زبان کو دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلہ میں کوئی برتری حاصل نہیں ہے خلاً تامل پرانی زبان ہے اور ادبیات کا ایسا ذخیرہ رکھتی ہے جو سنسکرتی ادبیات کے ساتھ چشمک زنی کر سکتا ہے۔ مرہٹی زبان تیرھویں صدی سے رائج ہے اور بنگالی زبان نویں صدی سے اب تک مسلسل ترقی کرتے رہنے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ پندرھویں صدی میں اردو اور سولھویں صدی میں برج رائج تھی قرون وسطیٰ میں اردو اور برج پورے ملک اور قوم کی زبان تھی اس کے برخلاف اعلیٰ ہندی صرف ڈیڑھ سو سال کی پرانی ہے برج اور اردو دونوں نے بڑے بڑے قابل ادیب پیدا کئے اعلیٰ ہندی میں ان کی ٹکر کا کوئی ادیب پیدا نہیں ہو سکا۔ بنگالی میں ٹیگور پیدا ہوئے اور اردو میں اقبال۔ اعلیٰ ہندی میں اب تک ان جیسی کوئی شخصیت پیدا نہیں ہو سکی"

اردو کی نسبت کمیشن کا یہ بیان پڑھنے کے بعد اب ذرا اس برتاؤ کا جائزہ لیجئے جو اس کے ساتھ خاص اس کے وطن میں کیا جا رہا ہے تو آپ اس کے سوا اور کیا کہیں گے۔

ہندی بے ادبیات مگر خو بری نہیں

توقع کے مطابق ٹنڈن جی کانگرس کے صدر منتخب ہو گئے اگرچہ آچاریہ شنکر راؤ دیو جو گاندھی جی کے سچے سپردکار اور حقیقی معنی میں کانگرسی تھے ان کا شکستِ فاش کھا جانا انتہائی افسوسناک اور شرم انگیز ہے کہ اس ملک نے اپنے مہاتما اور ان کے اصولِ زندگی کو اس قدر جلد بھلا دیا تاہم جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انھیں خوش ہونا چاہیئے کہ اب تک عوام کی ذہنیت اور لیڈر شپ میں کشمکش کے باعث انھیں جو دشواریاں ہوتی تھیں اب ان کے پیش آنے کا احتمال کم ہو گیا ہے۔ اب جو کچھ ہوگا صفائی، سنجیدگی اور یکسانی کے ساتھ ہوگا۔

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!!

تدوین حدیث

محاضرۂ چہارم

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

(۸)

میرے خیال میں حضرت ابوبکرؓ کے یہ الفاظ معمولی الفاظ نہیں ہیں، بلکہ ناگزیر قدرتی اختلافات کو ذریعہ بنا کر مسلمانوں میں ارادی و اختیاری مخالفتوں کے طوفان جو اٹھائے گئے ان ہی اختلافات کی طویل تاریخ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ دوسرا حادثہ تھا جس سے مسلمان دوچار ہوئے تھے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پہلا حادثہ تو اس سلسلہ کا وہی تھا جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی قرآن کے قراتی اختلافات سے قریب تھا کہ پھوٹ پڑے، اور قریب تھا کیا معنی؟ جن واقعات کا ذکر کر چکا ہوں، ان کو دیکھتے ہوئے تو کہا جا سکتا ہے کہ فتنہ کی آگ بھڑک چکی تھی، اور آپ نے دیکھا کتنی بڑی بڑی ہستیاں اس مغالطہ کی شکار ہو چکی تھیں، بلکہ بعضوں کا تو ایمان ہی خطرے میں آچکا تھا، وہ تو نبوت کا مبارک عہد تھا، سر اٹھانے کے ساتھ ہی نبوت کی طاقت سے فساد کے شعلوں کو دبا دیا گیا میں تو سمجھتا ہوں کہ

انزل القرآن علی سبعة احرف	اتارا گیا ہے قرآن سات حرفوں پر نہیں ہے ان
لیس منها الا شاف کاف	حروف میں کوئی حرف مگر سب کے سب شفا
(مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد مسند والنسائی)	بخش اور کافی ہیں۔

کے مسلسل اعلانات کے ساتھ ساتھ عملی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرأتِ قرآن کے قدرتی اختلافات کی برداشت کرنے کی صلاحیت و عادت صحابہ میں اگر پیدا نہ کر دیتے، تو

مسلمانوں کی ارادی مخالفتوں کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت شاید یہی اختلاف حاصل کر لیتا کیوں کہ براہِ راست اس کا تعلق قرآن سے تھا، جھگڑالو اختلاف پسند طبائع کے لئے قرآن کا لفظ ایک ایسی طاقت کی حیثیت رکھتا تھا کہ چاہنے والے جتنا چاہتے اسے بڑھا سکتے تھے، لیکن فتنہ کی اس آگ کو چوں کہ ابتدا ہی میں نبوت کی قوت بجھا چکی تھی کریدنے والوں نے گو پچھلی صدیوں میں کرید کرید کر اس کو بھڑکانے کی کوششیں کیں لیکن رائے عامہ نے ان اغوائی کوششوں کی طرف کبھی توجہ نہ کی، کم از کم میں نہیں جانتا کہ قرآتِ قرآن کے قدرتی اختلافات نے کسی اسلامی ملک میں کسی زمانے میں کسی اجتماعی فتنہ کی شکل اختیار کی ہو[1]۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قرآتی اختلاف کے مذکورہ بالا حادثہ کے بعد

---

[1] اور چاہنے والوں نے اس سلسلہ میں کمی کیا کی؟ جن لوگوں نے قرآنی الفاظ کے خاص تلفظ اور خاص لہجوں کی مشق کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے، اور "القرا" کا لفظ جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں عام علماء کے مفہوم کو ادا کرتا تھا، بتدریج عام علماء سے ہٹتے ہوئے خاص ان ہی پیشہ وروں کے لئے مختص ہو گیا، یعنی خاص تلفظ اور خاص لہجہ میں قرآن پڑھنے کی مشق جن لوگوں نے حاصل کی ہے ان ہی کا نام "قرار" ہو گیا خواہ اس مشق کے سوا اسلامی علوم میں سے کسی علم کا ایک حرف بھی ان کو نہ آتا ہو اس میں شک نہیں کہ عرب جس طریقہ سے عربی الفاظ کا تلفظ کرتے ہیں، اسی تلفظ کے ساتھ قرآنی الفاظ کو ادا کرنا ایک اچھی بات ہے اور میرے نزدیک تو ایسے لہجہ میں قرآن کا پڑھنا جس سے اس کی تاثیری کیفیت میں اضافہ بھی ہو، یہ بھی کوئی بری بات نہیں ہے اگرچہ بعض لوگوں کو اس سے اختلاف ہے، بہرحال بجائے خود تلفظ اور لہجہ کے متعلق "القرار" کی کوششیں محمود کوششیں ہیں۔ لیکن یہ کتنی بڑی دیدہ دلیری ہے کہ جس پر قرآن نازل ہوا، اس نے تو قولاً و فعلاً بار بار اس پر اصرار کیا کہ تلفظ کے قدرتی اختلافات کو ارادی مخالفتوں کا ذریعہ نہ بنایا جائے اور جس سے جس طرح بن آتے اسی طرح قرآن پڑھنے کی اسے اجازت دی جائے۔ عربی لہجہ یا تلفظ میں قرآن پڑھنے والوں کو ان بے چاروں کے تلفظ اور لہجہ کو برداشت کرنا چاہیئے جو خالص عربی تلفظ کے ساتھ قرآنی الفاظ کو ادا نہیں کر سکتے ہیں حضرت جابر بن عبداللہ سے ابوداؤد وغیرہ صحاح کی کتابوں میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ ہم لوگ قرآن پڑھ رہے تھے وفینا الاعرابی والاعجمی یعنی ان پڑھنے والوں میں بعض لوگ عربی (عرب کے باشندے) تھے اور بعض عجمی (غیر عربی ممالک) کے بھی لوگ تھے آگے ہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو خطاب کر کے فرمایا" اقرءوا فکل حسن" پڑھے جاؤ سب ٹھیک ہے، صحاح ہی کی مختلف

مسلمانوں کی ارادی مخالفتوں کی تاریخ میں یہ دوسرا حادثہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافتِ صدیقی کے زمانہ میں رونما ہوا جیسا کہ صدیق اکبرؓ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ باہمی مخالفت کی اس شکل نے ان ہی حدیثوں کی راہ سے سر اٹھایا تھا جن کا علم کئی ہزار صحابہ میں بکھرا ہوا تھا، اور جیسا کہ عرض کیا گیا ان حدیثوں کے پہنچانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خاص طریقہ اختیار کیا تھا، یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا یعنی عام طور پر ان حدیثوں کے متعلقہ معلومات کے علم میں لوگوں کی حالت متفاوت اور مختلف تھی اختیار تو کیا گیا تھا یہ طریقہ اس لئے کہ مسلمانوں کی زندگی میں اس سے سہولت پیدا ہوگی پڑھنے والوں کے لئے بڑھنے کی راہیں کھلی رکھی گئی تھیں لیکن اسی کے ساتھ مجرم ہونے سے ان لوگوں کو بچالینا مقصود

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کتابوں مثلاً ترمذی میں ہے کہ اس کی بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے جو ملی کہ قرآن سات حرفوں میں نازل ہوا ہے اور سب کافی اور شفا بخش ہے تو بارگاہِ الٰہی میں یا اس درخواست کے جواب میں بشارت ملی تھی جو حضور نے یہ کہتے ہوئے پیش کی کہ میری امت میں بوڑھے مرد بھی ہیں بوڑھی عورتیں بھی ہیں جوان لڑکے اور لڑکیاں بھی ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں کہ لم یقرؤا کتابا قط جس نے کوئی کتاب نہیں پڑھی یعنی ناخواندہ لوگ بھی ہیں میں پوچھتا ہوں کہ ایسی صورت میں ایک عجمی مسلمان پر اس لئے طعن کرنا کہ وہ بے چارا ضاد کے حرف کو اس مخرج سے ادا کرنے پر قادر نہیں ہے جس سے عرب اس لفظ کو نکالتے ہیں، کس حد تک صحیح ہوسکتا ہے السیوطی نے اتقان میں امام ابوشامہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ بعض کم علم لوگوں نے پھیلا دیا ہے کہ حدیث میں "سبعۃ احرف" کے الفاظ جو آئے ہیں ان سے مراد قرأت کے مشہور سات مکاتب ہیں، انھوں نے بعض لوگوں کی اس جرأت کی شکایت کی ہے جو کہتے ہیں کہ "مقررہ" قرأت کے طریقوں سے جو قرآن نہیں پڑھتا وہ خطاکار ہے بلکہ بعضوں نے تو کفر تک کا فتویٰ صادر کر دیا دیکھو اتقان صفحہ ۱۲۔ پھر بھی جہاں عام طور پر بحمد اللہ مسلمانوں پر پیغمبر کی تعلیم ہی کا یہ اثر ہے کہ ان پیشہ ور قاریوں نے جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ کفر تک بات پہنچائی ہے لیکن محض اس لئے کہ ان کے طریقے سے قرآن پڑھنا چونکہ نہیں آتا اس لئے قرآن کی تلاوت کسی نے ترک نہیں کی ہے میرا خیال ہے کہ وقت اور موقع ہو تو پیشہ ور قاریوں سے آدمی مزید مشورہ لے لے لیکن قرآن کی تلاوت کو ان کے مشورے پر موقوف نہ رکھے۔

تھا جو آگے بڑھنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں رکھتے۔

مگر جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس قسم کی حدیثوں کا یا اختلاف اور تفقہ کے جس دروازے کو قیامت تک پیش آنے والی دینی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے کھلا رکھا گیا تھا جس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ہر شخص کا شرعی کلیات و نصوص کی روشنی میں ایک ہی نتیجہ تک پہنچنا ضروری نہ تھا ناگزیر اختلافات کی یہ دونوں شکلیں ایسی تھیں کہ ہلکی سی لغزش سے یہ آتش فشاں پہاڑوں کی شکل اختیار کر سکتے تھے۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان اس کی ایک تاریخی شہادت ہے کہ سابق الذکر یعنی حدیثوں والے اختلاف سے ارادی مخالفت کی پیدائش کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی ان کے زمانہ میں شروع ہو چکا تھا۔ اسی لئے "تدوین حدیث" کی تاریخ میں ان کی تمہیدی تقریر کے ان الفاظ کو ایک خطرناک منزل کا نشان سمجھتا ہوں ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ طیبہ میں جن بزرگوں کی تربیت ہوئی تھی خصوصاً قرآنی قرأت کے اختلافات کے ذریعہ سے اس قسم کے اختلافات کی برداشت کرنے کی صلاحیت جن لوگوں میں آپ پیدا کر چکے تھے جب ان ہی میں حدیثوں کے اس اختلاف نے یہ رنگ اختیار کرنا شروع کیا تھا تو آئندہ اختلاف کی اس شکل میں کتنی شدت پیدا ہو جائے گی، حضرت ابوبکر سے زیادہ اس کی پیش بینی اور کون کر سکتا تھا، انھوں نے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا اسی لئے باضابطہ صحابہ کی ایک مجلس کو انھوں نے مدعو کیا ان کی پیش بینی نے جس خطرے کو ان کے سامنے بے نقاب کیا تھا مجلس کے سامنے اسی کو واضح کرتے ہوئے اس خطرے کے انسداد کی جو تدبیر ان کی سمجھ میں آئی تھی، اسی کو ایک تجویز کی شکل میں ان لوگوں کے سامنے آپ نے رکھا میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تمہیدی تقریر کے مطلب کو سمجھ لینے کے بعد ان کی انسدادی تدبیر کے سمجھنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی، کیوں کہ جس خطرے کے پیش آجانے کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ دے رہے ہیں اس خطرے

سے تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً دوچار ہونا پڑا ہے، حتیٰ کہ ابھی کچھ دن پہلے اسی سرزمین ہند میں مسلمانوں کی حکومت کا اقتدار جس وقت ختم ہوا خواہ بجائے خود اسلام و اسلامی قوانین سے اس حکومت کے تعلق کی نوعیت کچھ بھی ہو لیکن اتنا تو بہرحال ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ کسی نئی بات کو چھیڑ کر مسلمانوں میں اختلاف و افتراق کی آگ کا بھڑکانا آسان نہیں ہے لیکن حکومت کے اس دباؤ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی جائز یا ناجائز مزاحمتوں کا اندیشہ دلوں سے نکل گیا۔ اور خواہ نیک نیتی سے ہو یا بدنیتی سے طرح طرح کے مشورے مسلمانوں کو ملنے لگے اسی سلسلہ میں جو کچھ ہوا، یا ہو رہا ہے یہاں سب سے مجھے بحث نہیں ہے، ملکان احباب سے معافی چاہتے ہوئے جن کے دل کے آبگینوں کو ٹھیس لگاتے ہوئے مجھے خود تکلیف محسوس ہو رہی ہے مگر کیا کروں، واقعہ کے اظہار کے بغیر شاید صحیح طور پر میں اس چیز کے سمجھانے میں کامیاب بھی نہیں ہو سکتا جس کے سمجھانے کے لئے اس تازہ تاریخی مثال کا میں نے انتخاب کیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس تاریخی مثال کے جو اعاظم رجال و اکابر ابطال تھے اب وہ بے چارے تو دنیا میں موجود بھی نہیں ہیں پھر بھی بچے کھچے ان کے نام لیواؤں کا خیال آہی جاتا ہے، جو اپنے گذرے ہوئے ان ہی بزرگوں کے نشان سرمزار کی حیثیت سے اس طویل و عریض ملک کے بعض گوشوں میں زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں، اب کچھ بھی ہو کہنا یہ چاہتا ہوں کہ احیاء سنت و قمع بدعت اور خدا جانے کن کن الفاظ کن کن ارادوں کن کن نیتوں کے ساتھ کچھ دن پہلے اسی ملک ہندوستان میں اٹھنے والے یہ کہتے ہوئے جو اٹھے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی زندگی جس کے صدیوں سے وہ پابند چلے آرہے ہیں غیر مسنون زندگی ہے، پھر اس غیر مسنون زندگی کو مسنون زندگی بنانے کے لئے اسی خبر الواحد، یا خبر الواحد بعد الواحد والی حدیثوں کے ذخیروں سے ان بزرگوں نے چن چن کر ان ہی حدیثوں کا انتخاب کیا جو ابتداء اسلام ہی سے ناگزیر قدرتی اختلافات کے رنگ سے رنگین تھے، وہ خود بھی جانتے تھے یا ان کو جاننا چاہئے تھا کہ اختلافات کی یہ صورت کوئی نئی بات نہیں ہے، نیز

اٹھا کرنے والے ہر زمانہ میں جیسے مسلمانوں کو اٹھا کرتے چلے آئے تھے ہندوستانی مسلمانوں پر بھی جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا تھا جس میں ان کو چونکانے والے یہ کہہ کہہ کر نہ چونکاتے رہے ہوں کہ ان اختلافات کی حیثیت وہ حیثیت نہیں ہے جو کفر و اسلام بلکہ طاعت و عصیان کے اختلافات کی ہوتی ہے خود حضرت شاہ ولی اللہ نور اللہ ضریحہٗ جن کی طرف منسوب کرنے والے یہ چاہتے ہیں کہ اس غلط تحریک کی قیادت اور اولیت کو منسوب کر دیں وہی ایک جگہ نہیں بلکہ اپنی مختلف کتابوں میں صاف صاف لفظوں میں یہ اعلان کر چکے تھے کہ ان اختلافات کی ہر صورت اور ہر شکل صحیح اور درست ہے صرف ان ہی مسائل اور نتائج کی حد تک شاہ صاحب کا یہ فیصلہ محدود نہ تھا، جن کا تعلق تفقہ اور اجتہاد سے تھا میں نے اپنی کتاب "تدوین فقہ" میں فقہی و اجتہادی اختلافات کے متعلق شاہ صاحب کے اقوال مختلف کتابوں سے نقل کر کے ایک جگہ جمع کر دئے ہیں، اور صحیح محل ان کے ذکر کا وہی کتاب تھی بھی، بہرحال ان ہی اجتہادی مسائل کی حد تک نہیں بلکہ خبر احاد والی حدیثوں کی بنیاد پر جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، ان کے متعلق بھی شاہ ولی اللہ اس قسم کی عبارتیں چھوڑ کر دنیا سے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ روانہ ہوئے تھے مجھے خیال آتا ہے کہ اسی کتاب میں کسی موقع پر شاہ صاحب کے اس قول کو ان کی کتاب الانصاف سے میں نقل کر چکا ہوں جس کا حاصل یہ کہ

"ایسے اختلافی مسائل جن میں صحابہ کے اقوال ہر پہلو کی تائید میں ملتے ہیں مثلاً عیدین و تشریق کی تکبیریں محرم کا (بحالت احرام حج) نکاح کرنے کا حکم، یا تشہد (التحیات) کے کلمات جو ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں یا آمین یا بسم اللہ کو آہستہ یا زور سے پکار کر کہنا یا نماز کی اقامت میں بجائے دو دو دفعہ کے ایک ایک دفعہ اقامت کے کلمات کو ادا کرنا یہ اور اس قسم کی ساری باتوں میں اختلاف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی صورت یہ سمجھی جاتی ہے کہ شریعت کے مطابق ہے اور اس کی مخالف شکل غیر شرعی شکل ہے بلکہ سلف کا اختلاف اگر تھا بھی تو اس میں تھا کہ ان دو مختلف صورتوں میں اولیٰ اور بہتر شکل کیا ہے ورنہ دونوں شکلوں کو شرعی شکل قرار دینے

پر سب ہی متفق تھے۔ (انصاف ص۳)

اسی موقع پر شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہی وجہ تو ہے کہ ہر مسلک کے فقیہوں کے فتووں اور ہر مسلک کے قاضیوں کے فیصلوں کی سب ہی تصحیح کرتے ہیں، بہ ضرورت ایک امام کے مسلک کو ترک کر کے دوسرے امام کے مسلک کے اختیار کرنے کی مسلمانوں کو جو اجازت دی گئی ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ فقہ کے سارے اختلافی مسائل کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ شریعت کے دائرہ سے کوئی باہر نہیں ہے۔

اور ایک شاہ ولی اللہ صاحب کیا؟ اسلام کے جلیل القدر ائمہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی امام احمد بن حنبل ان سارے بزرگوں کے اقوال اسی نقطۂ نظر کی تائید میں کتابوں میں موجود ہیں ان ائمہ سے پہلے تبع تابعین تابعین بھی ہمیشہ مسلمانوں کو یہی سمجھاتے رہے چونکہ زیادہ تر ان اقوال کا تعلق ان اختلافات سے ہے جن کا اجتہاد و تفقہ کے نتائج سے تعلق ہے اس لئے بجائے تدوین حدیث کے جیسا کہ میں نے عرض کیا ان کے ذکر کا موزوں مقام وہی کتاب تھی۔ لیکن خبر آحاد کی حدیثوں سے اختلافات کے متعلق یہی شاہ ولی اللہ تنہا آدمی نہیں ہیں ان سے پہلے بھی علماء اور ائمہ نے اسی نقطۂ نظر کا اظہار ان اختلافات کے متعلق کیا ہے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ان مسائل میں بہتر شکل کیا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے زیادہ مطابق صورت اس مسئلہ میں کیا ہو سکتی ہے؟ ابوبکر الجصاص حنفی خبر الواحد بعد الواحد کے اختلافات کا تذکرہ کر کے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ان حدیثوں کی بنیاد پر مسائل کی جتنی شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔

"مسلمانوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ ان میں جس شکل کو چاہیں اختیار کریں فقہا اور ائمہ میں یہ اختلاف صرف اس میں ہے کہ ان شکلوں میں افضل و بہتر شکل کیا ہے (تفسیر جصاص ج۱ ص۲۰۳)

بلکہ الجصاص اور ان کے سوا معتبر علماء کا ایک گروہ وہ بھی ہے جو خبر آحاد کی ان اختلافی روایتوں کے متعلق ایک خیال یہ بھی رکھتا ہے کہ

"مختلف روایتوں کا یہ مطلب سمجھا جائے گا کہ یہ بتانے کے لئے کہ مسلمان ان شکلوں اور پہلوؤں میں سے جس شکل اور جس پہلو کو چاہیں اختیار کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب ہی کر کے دکھایا ہو تاکہ معلوم رہے کہ ساری صورتیں جائز ہیں (تفسیر جصاص ص۱۰۵ ج۱)

ائمہ میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان ان اختلافی آثار و روایات کے متعلق زیادہ تر یہی تھا جس کی تفصیل تدوین فقہ میں ملے گی کیونکہ امام کی اہمیت فقہ کے باب میں زیادہ تر ان کے اسی رجحان کی وجہ سے ہے)

یہی نہیں بلکہ براہ راست جن لوگوں کی دینی و علمی تربیت صحابہ کرام کے زیر سایہ ہوئی تھی اپنے زمانہ میں ان کی طرف سے بھی بار بار اسی نقطۂ نظر کا اعلان ہوتا رہا، ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھائی محمد بن ابی بکر کے صاحبزادے قاسم بن محمد کا شمار مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ میں ہے وہ بچپن ہی میں اپنی پھوپھی ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے آغوشِ تربیت میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے آگئے تھے اجتہادی مسائل کے اختلافات کے متعلق ان کے اور عمر بن عبدالعزیز کے جو اقوال کتابوں میں پائے جاتے ہیں ان دونوں حضرات میں جو گفتگو ان اختلافات کے متعلق ہوئی اور آخر میں دونوں نے ان اختلافات کے ہر پہلو کے جواز پر جو اتفاق فرمایا، بقدر ضرورت ان سارے قصوں کو اپنی کتاب "تدوین فقہ" میں نسبتاً زیادہ تفصیل سے میں نے بیان کیا ہے[1]۔

یہی نہیں کہ صرف اجتہادی و فقہی نتائج ہی کی حد تک ان بزرگوں کا یہی نقطۂ نظر تھا بلکہ خبر آحاد والی حدیثیں

---

[1] حافظ ابو عمرو بن عبدالبر نے اپنی متصل سند کے ساتھ عبداللہ بن حنبل کے حوالے سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز خلیفہ اور قاسم بن محمد دونوں حضرات جمع ہوئے اور حدیثوں کا تذکرہ شروع ہوا۔ عمر بن عبدالعزیز کو دیکھا جا رہا تھا کہ قاسم جس حدیث کا تذکرہ کرتے عمر بن عبدالعزیز اس کے مقابلہ میں ایسی روایت پیش کر دیتے جس کا مفہوم قاسم کی پیش کردہ روایت کے خلاف ہوتا۔ تو دیر تک جب گفتگو اسی رنگ میں ہوتی رہی تو عمر بن عبدالعزیز نے محسوس کیا کہ قاسم بن محمد کے طرز گفتار سے کچھ گرانی محسوس کر رہے ہیں یہ دیکھ کر عمر بن عبدالعزیز نے قاسم سے کہا خیر کیا آپ اس کی گرانی کیوں محسوس کر رہے ہیں؟ کہ میں جوان کا خیال تھا ان مسئلہ میں وہ اس کو ظاہر فرمانے لگے۔

"صحابہ کی روایتوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں ہم یہی کہتا ہوں کہ ان اختلافات کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

سے جو اختلافات پیدا ہوئے ہیں ان کے متعلق بھی اس کا اندازہ حافظ ابو عمرو بن عبدالبر کی اس روایت سے ہو سکتا ہے جس کا ذکر اپنی کتاب جامع بیان العلم میں متصل سند کے ساتھ انھوں نے کیا ہے یعنی اسامہ بن زید کہتے ہیں

سألت القاسم بن محمد عن القراءة	میں نے قاسم بن محمد سے پوچھا کہ جن فرض
خلف الامام فیما لم یجهر فیه فقال	نمازوں میں زور سے قرأت نہیں کی جاتی ان میں
ان قرأت فلك في رجال من	پیچھے پڑھنے کا (یعنی سورۂ فاتحہ کے پڑھنے)
اصحاب رسول الله صلی الله	کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اس پر قاسم بن
علیه وسلم اسوة واذا لم تقرء	محمد نے فرمایا کہ اگر تم پڑھو تو رسول اللہ صلی اللہ
فلك في رجال من اصحاب رسول	علیہ وسلم کے صحابیوں میں تمہارے لئے نمونہ
الله صلی الله علیه وسلم اسوة	ہے اور نہ پڑھو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
(جامع ص ۸۰ ج ۲)	کے صحابیوں میں بھی تمہارے لئے نمونہ ہے،

جاننے والے جانتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کی قراۃ کے مسئلہ میں جو اختلافات ہیں ان اختلافات کا تعلق تفقہ و اجتہاد سے نہیں بلکہ خبر آحاد کی حدیثوں کے اسی ذخیرے سے ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)
معاوضہ میں سرخ اونٹوں سے میں اتنا خوش نہیں ہو سکتا جتنا کہ ان اختلافی روایات سے خوش ہوا۔ "سرخ اونٹ" ایک عربی محاورہ تھا اتول جس کی قیمت کا مقابلہ کوئی دوسری چیز نہ کر سکے اسے عرب "سرخ اونٹ" کہتے تھے کیونکہ سرخ اونٹ سے زیادہ قیمتی چیز عربوں کے نگاہ میں کوئی دوسری چیز نہ تھی بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عمر بن عبدالعزیز کی اسی گفتگو ہی کا شاید نتیجہ تھا کہ بعد کو قاسم بن محمد مختلف جلسوں میں اس کا اظہار کرتے تھے کہ

عمر بن عبدالعزیز کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں روایات کا اختلاف اگر نہ ہوتا تو میرے نزدیک یہ کوئی خوشگوار بات نہ ہوتی۔ آج ان ہی اختلافات کا نتیجہ ہے کہ لوگ اس تنگی میں نہیں ہیں جو ایک ہی قول یا روایت کی وجہ سے پیدا ہو جاتی اب تو آزادی سے ان بزرگوں کے مختلف اقوال میں سے جس قول پر بھی عمل میسر آ جائے وہ کامیاب ہے ص ۸۰ جامع بیان العلم

جس میں امام کے پیچھے پڑھنے اور نہ پڑھنے دونوں طرح کی ایسی حدیثیں ملتی ہیں جنھیں روایت کرنے والوں نے قولاً و فعلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے، بلکہ اگر میں یہ دعویٰ کروں تو اس کی مشکل ہی سے تردید ہو سکتی ہے کہ خبر آحاد کی روایتوں سے جتنے اختلافات پیدا ہوئے ہیں، ان میں قرأت خلف الامام کا مسئلہ غالباً سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے نہ صرف پچھلی صدیوں میں بلکہ عہد صحابہ میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ خصوصی طور پر بحث و تحیص کا مرکز یہ مسئلہ بنا ہوا تھا مگر اس سلسلہ میں ایسے شدید خلافیات کے متعلق بھی ہمارے پاس اتنا واضح اور صاف تاریخی فیصلہ جب موجود ہے تو نسبتاً ان ہی حدیثوں کی بنیاد پر جن اختلافات کی اہمیت بہت کم ہے ان کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ حدیثوں ہی کی بنیاد پر سہی، جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی نوعیت ایسے حلال و حرام امور کی ہے جن پر حرمت و حلت کا حکم شریعت کے اس حصہ کے نصوص پر مبنی ہے جس کی تعبیر قرآن نے "البینات" سے کی ہے۔ امام مصر لیث بن سعد جن کے حالات کا تذکرہ کسی موقعہ پر گذر چکا ہے، ان کے حوالہ سے یحییٰ بن سعید القطان نے یہ کتنی پختہ بات نقل کی ہے یعنی لیث کہا کرتے تھے۔

مابرح اُولو الفتویٰ یفتون فیحل هٰذا و یحرم هٰذا فلا یری المحرم ان المحل هلک لتحلیه ولا یری المحل ان المحرم هلک لتحریمه (جامع بیان العلم ص۸۴)	فتویٰ دینے والے لوگ ہمیشہ سے فتویٰ دیتے ہوئے اگر چہ کسی چیز کو حلال اور کسی چیز کو حرام ٹھیراتے چلے آرہے ہیں، لیکن ان فتویٰ دینے والوں میں سے کسی کو نہیں پایا گیا کہ حرام قرار دینے والے یہ سمجھتے ہوں کہ حلال ٹھہرانے والے تباہ ہو گئے (یعنی دین سے خارج ہو کر نجات سے محروم ہو گئے) اسی طرح حلال ٹھہرانے والو نے کبھی یہ نہ سمجھا کہ اسی مسئلہ کے متعلق حرمت کا

فتوے دینے والے ہلاک و تباہ ہوگئے۔

اور سچ پوچھئے تو کتابوں میں اگرچہ اس قسم کے اختلافی نتائج پر بھی حلال و حرام کے الفاظ کا اطلاق کر دیا جاتا ہے لیکن یہ صرف خطرناک قسم کی غلطی ہی نہیں بلکہ میرے نزدیک تو بڑی جسارت ہوگی، اگر حرام و حلال کے الفاظ کا وہی مطلب یہاں بھی سمجھا جائے جو شریعت کے "بیناتی" حصہ میں حلال و حرام کے الفاظ کا مطلب ہوتا ہے، آخر اتنی بات تو تقریباً ہر عامی مسلمان بھی جانتا ہوگا کہ جس چیز کو "البینات" کے نصوص صریحہ میں مثلاً حرام قرار دیا گیا ہے اس کی حرمت کا انکار کر کے جو اس کے حلال ہونے کا فتویٰ دے گا، یا برعکس اس کے "بینات" میں جو چیزیں حلال ٹھہرائی گئی ہیں ان کو حرام قرار دینے والا دونوں کا اسلام سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا وہ گناہ کے نہیں بلکہ جرم بغاوت کے مجرم بن جاتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے منکر کا جو انجام ہوگا وہی انجام اس قسم کے باغیوں کے سامنے بھی آئے گا۔

پھر کیا کسی حدیث کی بنیاد پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اگر کسی چیز کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے، اور حنفی مذہب میں بجائے حلت کے اسی چیز کی حرمت کے پہلو کو ترجیح دی گئی ہو، کیا حلت و حرمت کے یہ اختلافات جو خبر آحاد کی حدیثوں پر مبنی ہیں، محض ان کی بنیاد پر مجال ہے کسی حنفی کی جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اس کا بھی اندیشہ کر سکتا ہے کہ اس فتوے کی وجہ سے فضل و قرب کے مدارج و مراتب میں ان کے کسی قسم کی کوئی کمی ہوگئی ہے، یقیناً نہ کوئی حنفی یہ تصور کر سکتا ہے اور نہ کرتا ہے اسی طرح میں نہیں جانتا کہ باوجود ان تمام اختلافات کے حضرت امام ابوحنیفہ کے لئے رحمۃ اللہ علیہ یاد ما رخیر کرنے سے کسی شافعی کے دل میں تنگی پیدا ہوتی ہو فقہی مسائل کے اختلافات کی کیا نوعیت ہے اور خود ائمہ اجتہاد و فقہ سے ان اختلافات کے متعلق جو باتیں کتابوں میں ملتی ہیں میں نے کتاب "تدوین فقہ" میں سب رسمیٹ کر ایک ہی جگہ پر جمع کر دیا ہے یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی معلومات کے تازہ کرنے کے لئے اس کا مشورہ ضرور دوں گا کہ ناظرین "تدوین فقہ" کے

اس حصہ کا اس موقعہ پر مطالعہ کرلیں۔

میں ذکر مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے اس حادثہ کا کر رہا تھا جس میں زوال حکومت کے بعد اچانک اس ملک کے مسلمان مبتلا ہو گئے تھے وہی حادثہ جس میں دیکھا گیا تھا کہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں نے رزمگاہوں کا قالب اختیار کر لیا نماز کی صفیں نماز کی صفیں نہیں بلکہ باضابطہ جنگ کی صفیں بن گئی تھیں جو نماز نہیں پڑھتے تھے ان کو نہیں بلکہ نماز پڑھنے والوں کو نمازوں ہی کے پڑھنے والے اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹک رہے تھے۔ (باقی آئندہ)

لہ " تدوین فقہ " میں علاوہ ائمہ اربعہ دوسرے ائمہ اجتہاد کے اقوال بھی آپ کو ملیں گے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کہنے والے یہ جو کہتے ہیں کہ ائمہ نے یا علماء نے اختلاف کیا بجائے اس کے یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ علماء نے وسعت نظر سے کام لیا۔ امت کے لئے سہولت بہم پہنچائی ہے، امام احمد بن حنبل سے پوچھنے والے نے جب پوچھا اور کہا کہ کیا آپ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں، جس کا وضو آپ کے فتویٰ کی رو سے باقی نہیں رہا ہے اگرچہ دوسرے ائمہ کے قول کے مطابق اس کا وضو نہ ٹوٹا ہو اور بعض جزئیات کا اس نے ذکر بھی کیا جواب میں فرمانے لگے کہ اے شخص تو کیا کہتا ہے میں سعید بن المسیب جو افضل التابعین سمجھے جاتے ہیں ان کے پیچھے نماز نہ پڑھوں گا کیونکہ اس مسئلہ میں سعید کا مذہب بھی یہی تھا کہ وضو نہیں ٹوٹتا، اسی میں میں نے یہ بھی نقل کیا ہے اور تقریباً یہ روایت حدِ شہرت تک پہونچی ہوئی ہے کہ امام مالک سے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے باصرار بلیغ کہا کہ آپ کے فقہی اجتہادات کو میں بزور شمشیر مسلمانوں میں چاہتا ہوں کہ نافذ کرا دوں اس پر امام مالک نے شدت سے اس کو منع کیا اور کہا کہ جس علاقہ کے مسلمان جن امور کے پابند ہو چکے ہیں ان کو اسی حال میں چھوڑ دو میں پوچھتا ہوں کہ امام مالک اگر ان مسائل کو جو ان کے اجتہادی مسائل سے مخالف تھے قطعی طور پر خلاف شرع سمجھتے تھے تو کوئی وجہ ہو سکتی تھی کہ جن کے نفاذ کا ایک بہترین ذریعہ ان کو مل گیا تھا اس سے نفع نہ اٹھاتے اور مسلمانوں کو غلط مسائل پر قائم رکھنے کا مشورہ دیتے؟ الغرض اسی قسم کی باتیں تقریباً تمام ائمہ کے حوالے سے اس کتاب میں نقل کی گئی ہیں کتاب " تدوین فقہ " جو ابھی غیر مطبوع نامکمل حال میں ہے اس کا یہ حصہ جس میں فقہی اختلافات کے اس پہلو کا ذکر آیا ہے مجلہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں شائع ہو چکا ہے جامعہ کے تحقیقاتی شعبہ سے غالباً مل سکتا ہے نیز برہان وغیرہ شہری مجلات میں بھی قسط وار یہ سلسلہ شائع ہو چکا ہے۔ ۱۲

عظمت حدیث

از

(جناب پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم۔ اے لکچرر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

قرآن کا دعویٰ ہے اور دعویٰ بھی کیسا جو نہ صرف اپنوں بلکہ انصاف پسند غیروں کی کسوٹی پر بھی پورا اتر چکا ہے کہ وہ دنیا کے لئے ایک مکمل و جامع قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ قانون اصولی طور پر انسانی زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے۔ اصلاحِ عقائد۔ تصحیحِ عبادات۔ درستیِ معاملات۔ مجموعۂ تعزیرات۔ آئینِ سیاست۔ آدابِ معاشرت اصولِ اخلاق غرض کوئی گوشہ اس کی حدود سے باہر نہیں مگر جس طرح ہر قانون کی کچھ Rulings یا نظائر ہوتی ہیں جن کو اس قانون کی شرح یا عملی تشکیل سمجھنا چاہئے اسی طرح اس قانونِ الٰہی کی بھی ایک شرح ہے جس کو حدیث[1] کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آج کی صحبت میں ہم چاہتے ہیں کہ حدیث اور اس کی تاریخ کے بارے میں چند ضروری باتیں گوش گذار کر دیں۔ تمام مذاہبِ عالم میں اسلام ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے دنیا کو ایک مکمل قانون دینے کے ساتھ ایک ایسا مکمل و کامل معلم بھی عطا کیا جس کا ہر قول و فعل جو قانون مذکور کی صحیح تصویر ہے آج ہمارے سامنے آئینہ ہے۔ قرآن اقامتِ صلوٰۃ۔ ادائے زکوٰۃ حج و جہاد۔ اہلی زندگی اجتماعی مسائل سب کی نسبت ہدایات و تعلیمات پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ تعلیمات نظری رہتیں اگر وہ معلمِ ربانی خود اپنی زندگی میں ان کو برت کر نہ دکھا دیتا مثلاً قرآن کا حکم ہے کہ اگر کسی کے ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو ان کے ساتھ برتاؤ میں عدل اور برابری فرض ہے لیکن جب ہم احادیث میں پڑھتے ہیں کہ رسول مقبولؐ کھانے۔ کپڑے۔ رہنے سہنے میں کس طرح ازواجِ مطہرات

[1] حدیث کا اطلاق آنحضرتؐ کے قول۔ فعل اور تقریر پر ہوتا ہے صحابہ اور تابعین کے قول۔ فعل اور تقریر کو بھی حدیث یا اثر کہتے ہیں حدیث کو سنت وغیرہ بھی کہا جاتا ہے۔

کے ساتھ وصل فرماتے تھے تو اس حکم کی عملی تفسیر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عہد رسالت سے لے کر ہر زمانے میں امت نے حدیث کی روایت و حفاظت کو ایک مذہبی فریضہ قرار دیا۔

روایت کے بارے میں مسلمانوں کی احتیاط اس درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ سیر و مغازی تو درکنار عام خلفاء و سلاطین کی تاریخ میں بھی اس پابندی کو سختی سے ملحوظ رکھتے تھے چنانچہ متقدم مورخین کی کتابوں میں آپ دیکھیں گے کہ کوئی واقعہ اس وقت تک بیان نہیں کیا جاتا جب تک کہ اس کا سلسلہ آخر راوی سے لے کر چشم دید گواہ تک منتہی نہ ہو اسی بنا پر مستشرقین نے اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کے بعد احادیث کے حفظ و ضبط میں جو حیرت انگیز سعی کی ہے اس کی مثال کسی قوم کی مذہبی و علمی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس دینی شغف میں سب سے پہلے صحابۂ کرامؓ کا نمبر ہے انھوں نے خود حضورؐ کے حکم کی تعمیل میں آپ کے ارشادات کو یاد رکھا۔ قلمبند کیا اور دوسروں تک پہنچایا چنانچہ محدثین کا بیان ہے کہ ایسے صحابہ کی تعداد جنہوں نے سن کر یا دیکھ کر آپ کے اقوال و افعال کو روایت کیا ایک لاکھ[1] سے اوپر ہے صحابہ کے بعد لاکھوں تابعین اور تبع تابعین آتے ہیں جو اپنی مقدس زندگیاں اسی خدمت دین کے لئے وقف کر چکے تھے، جو ایک ایک حدیث بلکہ ایک ایک لفظ کی تحقیق کے لئے سیکڑوں کوس کی مسافت برداشت کرتے تھے اور جو علم نبوی کی نشر و اشاعت کی خاطر ہزاروں خرچ کرتے تھے یہی زمانہ کتب حدیث کی باقاعدہ تالیف و تدوین کا تھا۔ ان حضرات کے ذوقِ علم کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں ایک ایک شہر میں ایک ایک ہزار شیخ حدیث کی روایت کی خدمت انجام دیتے تھے اور ایک ایک فرد اپنے وطن میں اور وطن سے نکل کر دو دو ہزار اساتذہ و شیوخ سے حدیث اخذ کرتا تھا۔

آج کل ہم تحریر پر تمام دار و مدار رکھنے کے باعث حافظے کی کمزوری میں مبتلا ہیں اس

---

[1] جن لوگوں نے حالت اسلام میں رسولِ خدا کو دیکھا وہ صحابہ کہلاتے ہیں۔ صحابہ کے دیکھنے والے تابعین اور تابعین کے دیکھنے والے تبع تابعین کہلاتے ہیں۔ کل احادیث کی تعداد تقریباً ۵۰ ہزار اور صحیح احادیث کی تقریباً ۱۰ ہزار بتائی جاتی ہے

لئے شاید مشکل سے ان واقعات کا یقین کریں۔ لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ امام احمد بن حنبل کو سات لاکھ احادیث یاد تھیں اور اتنی ہی امام ابوزرعہ کو امام بخاری اور مسلم کو تین تین لاکھ حدیثیں ازبر تھیں اسی پر دوسرے بزرگوں کو قیاس کیجئے۔ اللہ تعالیٰ علمائے اسلام کی تربتوں کو منور کرے جنہوں نے علمِ نبیؐ کی خدمت میں عمریں وقف کردیں اور جانیں لڑادیں۔ مصنفات۔ مسانید اور سنن کی جمع و تدوین و ترتیب و تبویب کے علاوہ ان علماء نے حدیث سے متعلق جو علوم وضع کئے ان کی تعداد سو تک پہنچتی ہے اور جو تصانیف چھوڑیں اُن کا شمار ہزاروں سے متجاوز ہے۔ فن روایت۔ اصول درایت۔ رجال حدیث۔ لغات حدیث۔ مصطلحات حدیث۔ اصول حدیث پر اس وقت جو سرمایہ مسلمانوں کے پاس ہے اس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہیے ڈاکٹر اسپرنگر نے سچ کہا ہے کہ کوئی قوم دنیا میں نہ ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے" حدیث کے رجال یعنی راویوں کی بایوگرافی کا یہ زبردست ذخیرہ جس کی مدد سے ہر روایت کا صدق و کذب آپ آج بھی جانچ سکتے ہیں صاف بتارہا ہے کہ مسلمانوں کا دینی شغف اور علمی ذوق کس قدر بلند تھا۔ ان حضرات کی جستجو و استقصا کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ رجال کی صرف ایک مختصر سی کتاب تقریب التہذیب میں محمد نام کے ۸۵۷ اور عبداللہ نام کے ۴۰۸ راویوں کا ریکارڈ موجود ہے دوسرے اسماء سعد۔ سعید۔ عمر۔ عمرو۔ عبدالرحمٰن وغیرہ کا بھی کم وبیش یہی حال ہے راویوں کے نام ونسب وسکونت کے علاوہ ہر ایک کے بارے میں نقد ونظر۔ جرح و تعدیل کے سرمایہ کی بنا پر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے کون ثقہ ہے کون غیر ثقہ۔ کس کی روایت معتبر ہے اور کس کی غیر معتبر۔ اگر کسی راوی پر کذب، تہمت، فسق، بدعت، گمنامی، غفلت، غلطی۔ ثقات کی مخالفت، وہم یا حافظے کی کمزوری کا الزام ہے تو محدثین نے بے رو رعایت اس کو مجروح اور اس کی روایت کو مردود ٹھہرایا ہے۔ احادیث کی تقسیم۔ مرفوع وموقوف ومقطوع۔ قولی وفعلی وتقریری۔ اسی طرح احاد ومتواتر۔ مشہور وعزیز وغریب

صحیح و حسن، مقبول و مردود وغیرہ وغیرہ بتا رہی ہے کہ علمائے اسلام کی نظر کس قدر گہری اور معیارِ نقد کس قدر مکمل تھا۔ یہ احادیث کی اقسام ہیں جن کی تعریفیں طوالت کے خوف سے ترک کی جاتی ہیں۔

فن روایت کے بعد اصول درایت کا نمبر آتا ہے۔ یعنی اسناداً ایک حدیث کے راوی سب ثقہ اور مستند ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ عقلاً اس کے اندر کوئی نقص ہو۔ اس صورت میں بھی وہ پایۂ اعتبار سے ساقط سمجھی جائے گی۔ اس کی علمائے اسلام نے مختلف صورتیں قرار دی ہیں۔ مثلاً

(۱) کوئی حدیث صریح عقل کے خلاف ہو۔

(۲) مشاہدے یا واقعے کے خلاف ہو۔

(۳) اصول مسلّمہ کے خلاف ہو۔

(۴) قرآن مجید کے خلاف ہو۔ مثلاً دنیا کی عمر کے متعلق احادیث۔

(۵) احادیث صحیحہ صریحہ کے خلاف ہو۔

(۶) واقعہ جس کی طرف منسوب کیا جاتا ہو اس کی شان یا عادت کے خلاف ہو۔

(۷) حدیث میں کوئی فضول یا رکیک بات بیان کی گئی ہو۔

(۸) حضرت خضر کے متعلق احادیث۔

(۹) قرآنی سورتوں کے فضائل کی احادیث۔

(۱۰) اطبا کے کلام سے مشابہت رکھنے والی احادیث۔

(۱۱) وہ حدیث جس میں معمولی نیکی پر بڑے اجر کا وعدہ یا خفیف سی غلطی پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

(۱۲) جس درجے کا اہم واقعہ ہو شہادت اس درجے کی نہ ہو۔ مثلاً روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت تھی تاہم ایک راوی کے سوا کسی اور نے یہ روایت نہیں کیا یا ایسا اہم واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سیکڑوں شخص اس کو روایت کرتے۔ اس کے باوجود صرف ایک شخص اس کا راوی ہے۔

(۱۳) راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی۔
(۱۴) وہ روایت جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں۔ یا جس کی تردید کے قرائن زیادہ ہوں مثلاً یہود خیبر سے جزیہ معاف ہونے کی روایت۔
(۱۵) روایت میں اصل واقعے کے علاوہ راوی کی ذاتی رائے بھی شامل ہو۔
(۱۶) ثقہ راوی سے روایت کے سمجھنے یا بیان کرنے میں غلطی کا احتمال ہو۔ مثلاً حضرت ابن عمر کی روایت کہ اہل میت کے رونے سے میت پر عذاب ہوتا ہے۔

محدثین و محققین کو روایت و درایت کے قواعد مرتب کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ خواص و عوام میں حدیث کی مقبولیت کو دیکھ کر بہت سے دجالین و وضاعین نے علما کا لباس پہن کر اپنے دل سے احادیث تراشنے اور ناواقفوں کو گمراہ کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ رسول مقبولؐ کا ارشاد ہے کہ من کذب علیّ متعمداً فلیتبوء مقعدہ من النار۔ یعنی جو مجھ پر قصداً جھوٹ جوڑے وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔ یہ حدیث اتنے صحابہ سے مروی ہے اور صحابہ کے بعد بھی ہر عہد میں اتنے اشخاص نے اس کو روایت کیا ہے کہ یہ درجۂ تواتر کو پہنچ گئی ہے ویسے بھی صحابہ سے جو دین کے حامل ہیں اس کی توقع نہیں ہو سکتی کہ ان میں سے کوئی کمتر درجہ کا شخص بھی آنحضرتؐ پر بالقصد افترا کرے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ الصحابۃ کلھم عدول یعنی سب اصحاب حدیث کے پہنچانے میں لائق وثوق و قابل اعتبار ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر جلیل القدر صحابہ حضورؐ سے حدیث روایت کرتے وقت کمال احتیاط برتتے تھے اور اپنی ذمہ داری کے خوف سے کانپ اٹھتے تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ حضرات عشرہ مبشرہ سے جو مقربین بارگاہِ رسالت تھے بہت تھوڑی تعداد میں احادیث مروی ہیں اور ایسے اصحاب جو اکثر حاضر باش رہتے تھے اور جن سے زیادہ احادیث مروی ہیں چھ سات سے زیادہ نہیں البتہ قرون مابعد میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے جو اپنی اغراض نفسانی کی خاطر احادیث وضع کرنے میں بے باک تھے۔ وضع احادیث کے مختلف اسباب تھے۔

(۱) بعض علمائے سوء نے حدیث کو امراؤ سلاطین کے درباروں میں تقرب کا ذریعہ بنایا۔ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں ایک قصہ لکھا ہے کہ خلیفہ مہدی کو کبوتروں کا بہت شوق تھا ایک دن غیاث بن ابراہیم محدث کو باریابی کا موقع ملا۔ جب حدیث سنانے کی فرمائش کی گئی تو غیاث نے کہا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ گھوڑ دوڑ۔ تیر اندازی۔ اور کبوتر بازی کے علاوہ شرط بدنا جائز نہیں۔ مہدی نے خوش ہو کر دس ہزار درہم عطا کئے۔ جب شخص مذکور چلا گیا تو مہدی نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ شخص کذّاب ہے اور اس نے محض میرے خوش کرنے کو کبوتر بازی کے الفاظ اپنی طرف سے بڑھائے ہیں یہ کہہ کر سب کبوتر ذبح کرا دیتے۔

(۲) مشاجرات و نزاعات صحابہ کی بنا پر مسلمانوں میں دو فریق ہو گئے تھے اور ہر فریق کے لوگوں نے دوسروں کے خلاف اور اپنے موافق روایت سازی سے کام لیا۔

(۳) حکومت وقت نے اپنے پروپاگنڈے اور اپنے حریفوں کی اہانت کی غرض سے اس مشنری کو حرکت دی۔ چنانچہ متعدد احادیث جو بنی امیہ یا بنی عباس کی حمایت میں ہیں اور جن کو ناقدین حدیث نے رد کر دیا ہے۔ اسی قبیل سے ہیں۔

(۴) بعض سادہ لوح اشخاص نے نیک نیتی سے اس گناہ کا ارتکاب کیا۔ چنانچہ لوگوں نے مسجد کوفہ میں ایک شخص کو دیکھا کہ زار زار رو رہا تھا۔ جب وجہ پوچھی گئی تو بتایا کہ میں احادیث وضع کیا کرتا تھا اب تائب ہو چکا ہوں۔ لیکن ہزاروں حدیثیں جو فضائل قرآن میں تصنیف کر کے ملک میں پھیلا چکا ہوں ان کا اب کیا تدارک ہو۔ لوگوں نے کہا آخر یہ حرکت کی ہی کیوں تھی جواب دیا کہ لوگ قرآن چھوڑ کر فقہ ابو حنیفہ میں مشغول ہو گئے تھے اس لئے فضائل قرآن میں احادیث وضع کرنے کی ضرورت پیش آئی اکثر احادیث جو صوفیہ سے مروی یا ان میں رائج ہیں۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً من عرف نفسہ فقد عرف ربہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ سمعانی کا قول ہے کہ یہ حدیث نہیں بلکہ یحییٰ بن معاذ کا قول ہے من عشق فعف فکتم فمات مات شہیداً جو عشق میں پاکباز رہے اور اس کو چھپاتے

تو اس کی موت شہید کی موت ہوگی۔ یحییٰ بن معین نے یہ روایت سن کر فرمایا کہ اگر میرے پاس گھوڑا اور نیزہ ہوتا تو میں اس کے راوی سے جہاد کرتا۔ علیٰ ہذا موتوا قبل ان تموتوا مرنے سے پہلے مرجاؤ۔ یا کنت کنزاً مخفیاً الخ محدثین نے ان حدیثوں کو بے اصل قرار دیا ہے اسی طرح یہ روایت بھی کہ حضورؐ پر نور نے سماع میں شرکت فرمائی اور حالت وجد میں گریبان چاک کر ڈالا سراسر افترا ہے۔ ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ خدا اس کے وضع کرنے والے پر لعنت فرمائے۔

(۵) واعظ اور قصہ خواں اپنی گرمی بازار کے لئے روایات گھڑ کر آنحضرت سے منسوب کر دیتے تھے اس لئے حضرت علیؓ نے ایسے واعظین کو مسجد سے نکال دیا۔

(۶) متعدد گمراہ فرقوں نے اپنی بدعات کی ترویج کے لئے اس شغل کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ جیسا کہ کتب حدیث کے مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا علمائے امت نے بر وقت اس فتنے کی روک تھام کی اور ایسے عمدہ اصول مرتب کئے جن سے حق و باطل جدا جدا ہو گئے۔ ملا علی قاری۔ علامہ ابن جوزی۔ علامہ سیوطی اور دوسرے بزرگوں نے موضوعات کو کتابی صورت میں یکجا کر دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد احادیث جو ہمارے یہاں میلاد شریف کی محافل میں بیان کی جاتی ہیں یا معجزات و فضائل سے متعلق ہیں یا حضرات صوفیہ کی تصانیف میں داخل ہو گئی ہیں سرے سے بے اصل ہیں۔

اس جگہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ شبہات جو حدیث پر بعض مستشرقین یا نو تعلیم یافتہ گروہ کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں صاف کر دئے جائیں یہ شبہات حسب ذیل ہیں۔

(۱) احادیث کے ذخیرہ کی اس قدر کثرت کو دیکھتے ہوئے حفاظِ حدیث کا ان کو محفوظ رکھنا نہایت مستبعد اور مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔

(۲) رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین نے لوگوں کو کتابت حدیث سے ہمیشہ منع فرمایا عہد سعادت سے مدتوں بعد یعنی تیسری صدی ہجری میں کتب احادیث کی تدوین ہوئی۔ ایسی صورت میں ان کے مستند ہونے کی کیا دلیل ہے۔

(۲) اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ ذخیرہ مستند ہے۔ تاہم اس کی حیثیت ایک تاریخی ریکارڈ کی ہے۔ مذہباً حدیث کا ہم پر حجت ہونا اور واجب العمل قرار پانا کیونکر تسلیم کیا جائے۔

پہلے شبہ کے متعلق ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ محدثین نے اکثر یہ کوشش کی ہے کہ ایک ہی روایت کی توثیق کے لئے اس کے جتنے طرق واسناد ہوں سب کو محفوظ رکھا جائے۔ جیسا کہ علامہ ابن جوزی کا قول ہے ان المراد بھذا العدد الطرق لا المتون یعنی حدیثوں کی اتنی بڑی تعداد سے مراد اسناد ہیں نہ کہ متن۔ مثلاً مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات ۷۰۰ طرق سے مروی ہے یعنی اگرچہ حدیث ایک ہی ہے۔ مگر راویوں کے متعدد سلسلوں کی بنا پر اس کو ۷۰۰ شمار کیا جاتا ہے اسی کے ساتھ عربوں کے غیر معمولی حافظے اور مذہب کے ساتھ ان کے زبردست شغف کو دیکھتے ہوئے ان کا محفوظ رہنا بعید از عقل نہیں معلوم ہوتا یہاں یہ بات اور صاف کر دینی چاہیئے کہ جب ہم لاکھوں حدیثوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد صرف اقوال نبوی نہیں ہوتی کیونکہ حدیث کا لفظ رسولؐ پاک کے قول۔ فعل اور تقریر (یعنی جس کام کو آپ نے دوسرے کو کرتے دیکھا اور انکار نہ فرمایا) سب پر حاوی ہے۔ بلکہ آپ کے علاوہ صحابہ اور تابعین کے قول۔ فعل اور تقریر کو بھی محدثین نے حدیث کی تعریف میں داخل کیا ہے دوسرا شبہ بھی قلت تدبر کا نتیجہ ہے یہ درست ہے کہ آنحضرت نے شروع میں کتابتِ حدیث کی ممانعت فرمائی تھی۔ کیونکہ قرآن سے لوگوں کی توجہ ہٹ جانے اور قرآن و حدیث کے مخلوط ہو جانے کا خطرہ تھا لیکن جب یہ خطرہ رفع ہو گیا تو حکم امتناعی واپس لے لیا گیا۔ رہی نفس روایت اس کی اجازت بلکہ حکم برابر باقی رہا۔ یہ ضرور ہے کہ محتاط اور دور میں صحابہ مثلاً حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ قبولِ روایت میں پوری احتیاط برتتے تھے۔ اور صحابہ سے بغیر گواہ اور قسم کے حدیث قبول نہ فرماتے تھے۔

عام خیال یہ ہے کہ تدوین حدیث تیسری صدی ہجری کا واقعہ ہے کیونکہ جامعین صحاح ستہ

شان العرب قد خصت بالحفظ۔ یعنی عرب حافظے کے بارے میں مخصوص درجہ رکھتے ہیں ۱۲

نے تیسری صدی کے لگ بھگ وفات پائی ہے چنانچہ امام بخاری کا سال وفات ۲۵۶ امام مسلم کا ۲۶۱۔ ابن ماجہ کا ۲۷۳۔ ابوداؤد کا ۲۷۵۔ ترمذی کا ۲۷۹۔ اور نسائی کا ۳۰۳ ہجری ہے[1] زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لیجئے کہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے حکم سے حدیث کی تدوین امام زہری کے ہاتھوں پہلی صدی ہجری کے آخر میں عمل میں آئی۔ بہرصورت جب حضورؐ سے اتنی مدت کے بعد یہ سرمایہ مدون ہوا تو اس کی صحت کا کیا اعتبار لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے کیونکہ عہد نبوت اور عہد صحابہ میں حدیث کا کافی ذخیرہ تحریر و تدوین کے مراحل طے کر چکا تھا خود امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب کتابۃ العلم باندھا ہے جس میں حضرت علیؓ کے پاس ایک صحیفے کا موجود ہونا بیان کیا گیا ہے۔ اس صحیفے میں دیت وغیرہ کے احکام قلمبند تھے۔ ایک دوسری حدیث میں حضورؐ کے خطبۂ فتح مکہ کا ذکر ہے اس موقع پر ایک شخص ابوشاہ یمنی عرض کرتے ہیں کہ یا حضرت یہ احکام میرے لئے لکھوا دیجئے۔ جس پر آپ فرماتے ہیں اکتبوا لابی فلاں یعنی ان کے لئے یہ احکام قلمبند کر دئے جائیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کے پاس بھی اپنی مرویات جو پانچ ہزار سے اوپر تھیں کتابی صورت میں موجود تھیں۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص نے اپنی مرویات جو حضرت ابوہریرہ کی مرویات سے بھی زیادہ تھیں حضور کی اجازت سے لکھ لی تھیں۔ حضرت انسؓ جن سے تقریباً بارہ سو احادیث مروی ہیں خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے ان کو لکھ کر رسول مقبول کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ حضرت جابرؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عباس کا بھی یہی حال تھا۔ آخرالذکر بزرگ کے پاس اقوالِ نبویؐ کے علاوہ حضرت علیؓ مرتضیٰ کے فتاویٰ بھی قلمبند تھے۔ یہ تحریری مجموعے ان مراسلات اور معاہدات کے علاوہ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لکھ کر سلاطین کو بھیجے گئے تھے یا بعض جماعتوں کو سپرد کئے گئے تھے۔

جو حضرات عہد رسالت میں اس مقدس سرمایے کا قید کتابت میں آنا تسلیم نہیں کرتے

---

[1] انھیں چھ محدثین کی جمع کردہ کتب حدیث جو انھیں کے نام سے مشہور ہیں صحاح ستہ کہلاتی ہیں [2] صحابہ مکثرین فی الحدیث اس ترتیب سے ہیں عبداللہؓ بن عمرو۔ تقریباً چھ ہزار، ابوہریرہؓ۔ ۵۳۷۴، عبداللہؓ بن عباس۔ ۲۶۶۰، عائشہ صدیقہؓ۔ ۲۲۱۰، عبداللہؓ بن عمر۔ ۱۶۳۰، جابرؓ ۱۵۰۶، انسؓ ۱۲۸۶۔

صحابہ تو مستند اسلامی تاریخ سے بیگانہ ہیں۔ یا دانستہ ایسا کہہ کر حدیثِ نبوی کی اہمیت کو گھٹانا چاہتے ہیں۔ دراصل ان کی مثال اس کوزہ پشت بڑھیا کی ہے جو خود تندرست ہونے کی بجائے یہ چاہتی تھی کہ تمام دنیا کی پیٹھ اسی کی طرح کُبڑی ہو جائے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ سرورِ عالم کی حیاتِ مبارک ہی میں ایک طرف قرآن مجید بتمامہ سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہو کر پوری اسلامی آبادی میں دائر و سائر ہو چکا تھا اور دوسری طرف احادیث کا کل نہیں تو بڑا حصہ قیدِ تحریر میں آچکا تھا۔ پہلی صدی ہجری کے آخر میں جب صحابہ کی جماعت کے اکثر افراد وفات پا چکے تھے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس خوف سے کہ علم حدیث دنیا سے مٹ نہ جائے ابوبکر بن حزم کو احادیث کی جستجو کا حکم دیا اور ابن شہاب زہری کو تدوین پر مامور کیا۔ امام زہری اور ان کے رفقائے کار نے اس دور میں علم حدیث کی بڑی خدمت کی۔ مگر افسوس کہ اس دور کے اکثر کارنامے زمانہ کے ہاتھوں تلف ہو گئے۔ یہاں تک کہ امام بخاری اور ان کے رفقا کا عہد آگیا۔ غیر مناسب نہ ہوگا اگر مثال کے طور پر یہاں بخاری کی تالیف کا واقعہ مختصراً نقل کر دیا جائے جس سے سلف کے حیرت انگیز حافظے اور غیر معمولی احتیاطِ کتابت کا اندازہ ہو سکے گا۔ خود ان کا بیان ہے کہ شیخ اسحٰق کی مجلس میں بعض دوستوں نے کہا کہ اگر احادیث کے دفتر میں سے ایک مختصر اور مستند انتخاب کر دیا جائے تو کیا اچھا ہو۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی اور میں نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے تقریباً سات ہزار حدیثیں[1] چھانٹ لیں اور ان کو اپنے اور حق تعالیٰ کے درمیان حجت قرار دیا۔ ایک مرتبہ لوگوں نے ان کے حافظے کا امتحان کرنے کے لئے سو حدیثوں کو اس طرح الٹ پلٹ دیا کہ ایک کے متن میں دوسری کے اسناد ملا دئے۔ امام بخاری نے تمام حدیثوں کو صحیح متون اور اسناد کے ساتھ سنا دیا۔ کتابت میں اس قدر احتیاط مدنظر تھی کہ صرف وہ حدیث درج کرتے جو صحت کے اعلیٰ درجے پر ہوتی اور جس کے اسناد متصل ہوتے اور ہر حدیث لکھنے سے پہلے غسل کر کے دو رکعتیں ادا کرتے اور ممبر و قبر نبوی کے درمیان بیٹھ کر مصروفِ تحریر

---

[1] یہ مکررات کو حذف کرنے کے بعد چار ہزار کے قریب ہوتی ہیں۔

ہوتے اس طرح یہ کتاب سولہ سال میں تکمیل کو پہنچی۔اسی احتیاط کا نتیجہ ہے کہ حدیث کی چھ مشہور کتابوں (صحاح ستہ) میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو بڑا مرتبہ حاصل ہے۔اور یہ دونوں صحیحین کہلاتی ہیں اور ان میں بھی صحیح بخاری کتاب اللہ کے بعد آسمان کے نیچے اصح الکتب تسلیم کی گئی ہے۔

محدثین کا قول ہے کہ دنیا کے حفاظ چار گذرے ہیں۔ابو زرعہ رَے میں۔مسلم نیشاپور میں۔دارمی سمرقند میں۔اور بخاری بخارا میں اور ان میں آخر الذکر علم و فہم میں سب سے برتر ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ علل و اسانیدِ حدیث کے علم میں وہ اپنے عہد کے امام تھے چنانچہ مشہور ہے کہ عہدِ طلب میں ایک مرتبہ ان کے شیخ اپنی کتاب سے ان کو حدیث پڑھا رہے تھے کہ ان کی زبان سے نکلا سفیانؒ عن ابی الزبیر عن ابراہیم۔بخاری نے ٹوکا اور کہا کہ ابو الزبیر نے ابراہیم سے سماعتِ حدیث نہیں کی ہے۔استاد انصاف پسند اور جوہر شناس تھے خوش ہوئے اور دریافت کیا کہ صحیح کیا ہے۔جواب دیا سفیان عن الزبیر بن عدی عن ابراہیم۔استاد ان کی معلومات دیکھ کر حیران ہوئے اور اپنی کتاب میں تصحیح کر لی۔

اسی سلسلے میں ان کا ایک خواب دلچسپی سے خالی نہیں وہ یہ کہ انھوں نے دیکھا کہ میں رسول مقبولؐ کی خدمت میں حاضر ہوں اور آپ کو پنکھا جھل رہا ہوں۔جس کی ایک شخص نے یہ تعبیر کی کہ تم احادیثِ نبویہ سے وضاعین دجالین کا کذب دفع کرو گے۔

ایک جگہ خود امام بخاری نے لکھا ہے کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں اور یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ان کی عمر سولہ برس کی تھی۔انھیں کا بیان ہے کہ میں نے مختلف بلادِ اسلام میں جا کر متعدد شیوخ سے (جن کی تعداد اٹھارہ سو تک پہنچتی ہے) حدیث اخذ کی اور ہر حدیث کی سند مجھے ازبر ہے۔

ان کی صحیح بخاری خالص صحیح احادیث کا پہلا مجموعہ ہے جس میں قبولِ روایت کی شرائط بہت سخت رکھی ہیں اس میں انھوں نے صرف صحیح احادیث کو لیا ہے۔اور بعض صحیح احادیث

کو طول کی وجہ سے ترک کر دیا ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جن لوگوں نے خود مؤلف سے اس کی روایت کی ہے ان کی تعداد نوے ہزار۔ یا ایک لاکھ بتائی جاتی ہے جن میں بڑے بڑے علمائے اعلام مثلاً مسلم۔ ترمذی۔ نسائی وغیرہم شامل ہیں۔

امام بخاری کے اسی تبحر اور احتیاط کا نتیجہ ہے کہ دنیائے اسلام کے اکابر نے ہر زمانے میں ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ابن خزیمہ کا قول ہے کہ میں نے آسمان کے نیچے بخاری سے بڑا عالم حدیث نہیں دیکھا۔ امام مسلم جب ان کے پاس آتے تو ان کی پیشانی پر بوسہ دیتے اور کہتے کہ مجھے اجازت دو کہ تمہارے قدم چوموں۔ انھیں کا ارشاد ہے کہ آپ سے حاسد کے سوا کوئی بغض نہ رکھے گا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ دنیا میں آپ کی نظیر نہیں۔ جعفر مروزی فرماتے ہیں کہ اگر ممکن ہوتا تو میں اپنی عمر میں سے بخاری کو دے دیتا۔

مشہور ہے کہ امام بخاری کی وفات پر لوگوں نے حضور سرور عالم کو خواب میں دیکھا کہ کسی کا انتظار فرما رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر ارشاد فرمایا کہ میں محمد بن اسمٰعیل (بخاری) کی راہ دیکھ رہا ہوں۔

باقی کتب صحاح کے جامعین کے تبحر اور تورع کا بھی کم وبیش یہی حال ہے لیکن وقت کی کمی کے باعث ہم اس کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہیں۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم تیسرے شب کی طرف متوجہ ہوں اور حدیث کا مذہباً حجت ہونا ثابت کریں۔

جن لوگوں کی احادیثِ نبوی پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ سنتِ رسولؐ کو جاننے اور اس پر کاربند ہونے کی کس قدر تاکید آئی ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا حاکم مقرر فرمایا۔ روانہ کرنے سے پہلے سوال کیا کہ وہاں لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کیوں کر کروگے۔ جواب دیا کتاب اللہ کے ذریعے سے دریافت کیا اگر کتاب اللہ میں کوئی صریح حکم نہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ سنت رسولؐ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ اس پر آپ نے ان

کی تصویب و تحسین فرمائی۔

ایک حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ دیکھو ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص مسند پر نازو غرور سے
متمکن ہو اور میرا حکم اس کے روبرو پیش کیا جائے اور وہ کہے کہ میں قرآن کے علاوہ کچھ نہیں جانتا
ممکن ہے کہ کوئی منطقی دوست مجھ پر دور یعنی arguments in circle کا الزام
لگائیں اور فرمائیں کہ خوب! حدیث کا حجت ہونا ثابت کیا جائے اور حدیث ہی سے دلیل لائی
جائے۔ اس لئے قرآن کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

قرآن حکیم میں ایسی آیات بکثرت ہیں جن میں اطاعت خدا و اطاعت رسول کی تاکید جداجدا
آئی ہے کہیں فرمایا جاتا ہے "مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا" رسول تمہیں جو کچھ
دیں وہ لے لو اور جس کام سے منع کریں اس سے باز رہو۔ کہیں ارشاد ہوتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي
رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ رسول اللہ تمہارے لئے عمدہ نمونہ ہیں۔ متعدد مقامات پر آنحضرت
کا منصب یہ بتایا گیا ہے کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وہ لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے
ہیں۔ جو حضرات صرف کتابِ الٰہی کو واجب العمل مانتے ہیں خدارا بتائیں کہ حکمت سے کیا چیز
مراد ہے؟ بعض لوگ دبی زبان سے فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد قرآن کی تفسیر اور اس کے
مطالب کی تشریح ہے۔ لیکن آخر ہمارے لئے اس تفسیر تک پہنچنے کا ذریعہ کیا ہے۔ وہی حدیث
یا کچھ اور۔ اگر عقلاً دیکھا جائے تو بھی حدیث کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کیوں کر ہو سکتا
ہے کہ آپ ایک قانون کو تو تسلیم کریں اور اس کی نظائر کے ماننے سے انکار کر دیں جبکہ آپ کو یہ
ثابت ہو چکا کہ وہ نظائر مستند طور پر قانون کے اولین ترجمان کی طرف منسوب ہیں۔

اس امر کو اس پہلو سے دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ جو پیمبر پر کتاب نازل کر سکتا تھا کیا اس پر قادر
نہ تھا پیمبر کی وساطت کے بغیر مخلوق کے درمیان کتاب بھیج دیتا تاکہ لوگ اس میں دیکھ دیکھ کر
اس کے احکام پر عمل پیرا ہوتے بلکہ یہ صورت اعجوبہ پرست لوگوں کو اور زیادہ ساکت کر دیتی
اُن کو تو یہی اعتراض تھا کہ ہمیں جیسے انسان کو وحی سے کیوں مشرف کیا گیا ہے۔ تاہم خدا

نے ایک رسول کو بھی مبعوث کیا تاکہ وہ اس الٰہی تعلیم کا صحیح و کامل نمونہ بناکر خود کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔ خدا خود فرماتا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ

یعنی ہم نے جتنے رسول بھیجے وہ صرف اس غرض سے بھیجے کہ ہمارے حکم سے ان کی اطاعت کی جائے بے شک خدائے پاک نے ہمیں نماز کا حکم دیا اور زکوٰۃ کی تاکید فرمائی ہے۔ لیکن فجر کی دو رکعتیں پڑھی جائیں اور زکوٰۃ رقم کی ۱/۴۰ ہو یہ ہمیں رسولِ خدا نے اپنے قول و عمل سے بتایا ہے۔ تمام عبادات و معاملات کا یہی حال ہے یعنی قرآن نے عموماً کلیات سے اعتنا کی ہے اور جزئیات کی تفصیلات اسوۂ رسول سے ماخوذ ہیں۔

فبای حدیث بعدہ یومنون

اس مقالے کی ترتیب کے وقت کتب ذیل پیش نظر تھیں۔ قرآن مجید۔ صحیح بخاری مع مقدمہ مولانا احمد علی سہارنپوری۔ نخبۃ الفکر مع نزہۃ النظر۔ الدر النضید۔ نیل الامانی۔ تدریب الراوی۔ عمدۃ الاصول۔ معرفۃ علوم الحدیث۔ تقریب التہذیب۔ موضوعات ملا علی قاری۔ تاریخ الخلفاء۔ سیرۃ النبی۔ تدوین حدیث۔ موجودہ تصوف (مرتبہ خود)۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔ مجاہد اعظم۔

دلائل القرآن

از

(نجم الدین اصلاحی)

(۲)

تحدی یعنی قرآنی چیلنج منکرینِ قرآن ابتدارِ نزول ہی سے قرآن پر نت نئے اعتراضات اور شکوک وشبہات وارد کرتے رہے اور باوجود اہل زبان ہونے کے قرآن کا چیلنج قبول کرنے سے قطعاً عاجز تھے۔ آخر ان کا یہ عجز کس بنا پر تھا اور کیوں اس کے مقابلہ میں آنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی درانحالیکہ ان کا یہ کہنا تھا "لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا" پھر کیوں نہیں بنالائے جبکہ قرآن سارے قصوں کا خاتمہ اسی پر کر رہا تھا؟

یہ ایک اہم اور مشکل سوال ہے جس پر علمائے اسلام نے ہر دور میں دادِ تحقیق دینے کی سعی فرمائی ہے اور وجوہِ اعجازِ قرآن پر نہ جانے کتنی کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ امام عبدالقاہر جرجانیؒ، امام باقلانیؒ، استاد مصطفےٰ صادق رافعی اور حضرت الاستاذ مولانا حمیدالدین فراہیؒ کی تحقیقات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ذیل میں ہم پہلے ان آیات کو ترتیب وار درج کرتے ہیں جن میں قرآن عزیز نے تحدی کی ہے

(۱) قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (قصص)

(۲) قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا۔ (بنی اسرائیل)

(۳) أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ (ھود)

(۴) وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ

يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (یونس)

(۵) أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ (طور)

آیاتِ مذکور کو ہم نے اسی ترتیب سے درج کیا ہے جس ترتیب سے قرآن نے تحدی کی اور تدریج اپنا قدم بڑھایا ہے۔ علماء کے اقوال دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت سب کے نزدیک وجوہِ اعجاز میں بڑی اہمیت رکھتی ہے چنانچہ انھوں نے کلام بلیغ میں تین حیثیتوں سے بحث کی ہے۔ انتخاب مفردات، بندش اور ترکیب اور اسلوب و طرز ادا۔

قرآن مجید کے مثل لانے کا عجز اور اس کی حکمت کا سراغ ذیل کی آیات میں کچھ ملتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ بَلْ عَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ فَقَالَ الْكَافِرُونَ هَذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ

يٰسٓ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ إِنَّكَ لَمِنَ	قسم ہے اس پکے قرآن کی تو تحقیق ہے بھیجے
الْمُرْسَلِينَ عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ	ہوؤں میں سے اوپر سیدھی راہ کے اتارا
تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ (یٰس)	زبردست رحم والے نے۔

قرآن کی بزرگی اور عظمتِ شان پر بذاتِ خود قرآن شاہد ہے۔ جس نے اپنی اعجازی قوت اور بے پایاں اسرار و معارف، پُرحکمت تعلیمات اور اعلیٰ مضامین کے اعتبار سے قومِ عرب کے اندر ذہنی و فکری انقلاب طاری کر دیا اور تمام انسانوں میں عام تبدیلی پیدا کر دی، وہی قرآن بڑا زبردست گواہ اس بات کا ہے کہ جو نبی امی اس کو لے کر آیا یقیناً وہ اللہ کا بھیجا ہوا اور ٹھیک راستے پر تھا اور یہ قرآن اس خدا کا اتارا ہوا ہے جو عزیز و رحیم ہے۔

عربی میں عزت کے معنی ایسی قوت و طاقت کے ہیں جو مغلوبیت میں مانع ہو اسی سے عزیز ہے یعنی ایسی ذات جس پر غیر کی دسترس نہ ہو سکے اور جو غالب و قاہر ہونے کو مغلوب و مقہور۔ پس جو ذات ایسی ہے اسی پر اس کے کلام کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ اس

نبی امی کی طاقت اور دسترس سے بھی باہر تھا جس نے نبوت سے پہلے غارِ حرا میں گوشہ نشینی کی زندگی گذاری، بچپن میں گلہ بانی اور جوانی میں تجارت کی کہ کوئی قرآن اپنے الفاظ میں تالیف کر سکتے معلوم ہوا کہ قرآنِ عزیز خالص اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

ہمارے پاس قرآن مجید کے بعد احادیث نبوی کا زبردست ذخیرہ موجود ہے اور اسماء الرجال کا وہ عظیم الشان دفتر ہے جس میں کلام نبوی کے روایت کرنے والوں کی ثقاہت وغیرہ کو اس طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ مجال گفتگو نہیں چنانچہ مسلمانوں کی اس مصوری پر دنیا تحقیق متحیر ہے اگر مستشرقین یورپ کے قول کے مطابق کہ محمد عربی (صلعم) ہی نے قرآن کو اپنے الفاظ میں لکھوایا ہے تو پھر اسی طرح آنحضرت صلعم ہی نے تو احادیث کو بھی لکھوایا تھا آخر احادیث کے مجموعہ الفاظ میں وہ تاثیر کیوں نہیں پائی جاتی اور اس کی تلاوت کیوں نہیں کی جاتی جب کہ اسلوب نبی اور اسلوب قرآن دونوں ایک ہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ خصائص و اسلوبِ قرآن اور خصائص و اسلوبِ احادیث میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس فرق کو سمجھنے کے لئے ہم آیت تکمیل دین جو سنہ ۱۰ھ حجۃ الوداع کے موقع پر جمعہ کے دن عصر کے وقت نازل ہوئی اور اسی جگہ اور اسی وقت دنار رخ میں آنحضرت صلعم نے چالیس ہزار قدوسیوں کے مجمع میں جو خطبہ حجۃ الوداع ارشاد فرمایا ہے العقد الفرید جلد دوم صفحہ ۱۱۱ سے ذیل میں درج کرتے ہیں پورا خطبہ کتاب مذکور میں ہے۔

"ایھا الناس . . . اسمعوا منی ابین لکم فانی لا ادری لعلی لا القاکم بعد عامی ھذا فی موقفی ھذا . . . ایھا الناس ان دماءکم و اموالکم علیکم حرام الی ان تلقوا ربکم کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا . . . الا ھل بلغت . اللھم اشھد فمن کانت عندہ امانۃ فلیؤدھا الی الذی ائتمنہ علیھا وان ربا الجاھلیۃ موضوع وان اول ربا ابدأ بہ ربا عمی العباس بن عبد المطلب وان دماء الجاھلیۃ موضوعۃ وان اول دم ابدا بہ دم

عامر بن ربیعۃ بن الحارث ابن عبد المطلب ... دان ماثر الجاھلیۃ موضوعۃ غیر السدانۃ والسقایۃ الخ"

اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْھُمْ وَاخْشَوْنِ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا الخ (المائدۃ)

یہ دو نمونے ایسے پیش کر دیے گئے ہیں کہ جو ذرا بھی کلام عرب کی ممارست رکھتا ہے صاف فیصلہ کر دے گا کہ یہ دونوں کلام ایک ہی شخص کے نہیں ہو سکتے اور اسلوب قرآن اور اسلوب حدیث میں ایسا نمایاں فرق ہے کہ باوجود خطبۂ حجۃ الوداع کی بلاغت و فصاحت کے پھر بھی کلام ناس اور کلام ربانی کا فرق واضح رہتا ہے حالانکہ آنحضرت صلعم کا خود ہی ارشاد ہے "انا افصح العرب" پیغمبر سب کچھ ہو جائے لیکن خدا نہیں ہو سکتا اللہ تعالیٰ کی ہر صفت اس درجۂ کمال پر ہے جس کا تصور انسانی قوت سے باہر ہے قرآن کریم خود اپنے اوصاف کو بیان کرتا ہے ارشاد ہوتا ہے

لَوْ اَنْزَلْنَا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ الخ

یہ قرآن مجید ہی کی قدسیت ہے کہ چودہ سو برس سے اس کے حفظ اور تلاوت کا سلسلہ قائم ہے اور ایمان والوں کے حواس باطنی کے اندر اس کا نشیمن، بار بار کی تکرار میں حلاوت و تاثیر کی زیادتی اس کا ایسا محیر العقول اعجاز ہے جو اس آسمان دنیا کے نیچے آسمانی و غیر آسمانی کتابوں کو نہ کبھی نصیب ہوا اور نہ کلام ناس و کلام ربانی ایک دوسرے سے مخلوط ہو سکے۔

لیس شان القرآن کشان کلام الناس | کلام ناس اور کلام رب کو ہم چند مثالوں سے واضح کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ اچھی طرح ثابت ہو جائے کہ کلام ناس سے کلام ربانی پر استدلال کرنا یا اس پر قیاس کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔

قرآن مجید میں ایک چھوٹی سی سورۂ نصر ہے۔ اہل زبان اس کے مضمون کو زیادہ سے زیادہ دو طرح پر ادا کر سکتے ہیں۔

(۱) اِنَّ اللّٰہ قد نصرك ودخل الناس فی دینك فاحمد اللّٰہ واستغفرہ

من ذنوبك فان الله يتوب عليك۔

(۲) اذا نصرك الله واتاح لك الفتح ودخل الناس فی دین الله افواجا فسبح بحمد ربك واستغفره انه كان توابا۔

(۳) اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (نصر)

مذکورہ بالا تینوں عبارتیں اہل علم کے سامنے ہیں اس تھوڑے تھوڑے سے ہیر پھیر میں کلام کی بلاغت کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ سورۂ نصر میں الفاظ کی بندش اور جملوں کا جوڑ اعلیٰ درجہ پر ہے چنانچہ جو لفظ جہاں ہونا چاہئے تھا وہیں نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے، غور کرو کہ اللہ کی مدد کا آنا کس قدر اعلیٰ خوشخبری ہے اور نیک فالی۔ ایک مستقل وجود فرض کر کے لفظ (جاء) لایا گیا یہ نہیں کہ تمہاری مدد کی گئی وغیرہ۔ اللہ کی مدد کے بے شمار نتائج میں مگر آنحضرت صلعم کے مشن کے مناسب فتح مکہ بڑی نعمت اور خیر کثیر ہے لہذا اس کے متصل (والفتح) کہا گیا۔

" وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فتح سے اسی طرح متصل ہے جیسے فتح نصر اللہ سے فتح مکہ کے بعد ۹ھ میں تمام عرب کے وفود آئے اور اسلام میں داخل ہوئے۔ نصر اللہ سے مناسب تسبیح و تقدیس ہے اور اسلام کی اشاعت و نشر کے مناسب استغفار ہے کہ فرائض نبوت پورے ہوئے اب خدا کو یاد کرو۔ چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ گویا خبر وفات ہی تھی۔ اور عرفاء صحابہ نے ایسا ہی سمجھا۔

قرآن مجید کے اسالیب اور تفنن خاص سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے ایک اور مثال سے اسلوب کلام ناس اور اسلوب کلام ربانی کے فرق کو ہم بتلانا چاہتے ہیں وہ آیت یہ ہے۔

رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا (سورۂ مریم)

حضرت زکریا علیہ السلام بہت زیادہ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اولاد کی امید منقطع اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔

لیکن پکارتے ہیں تو مذکورہ بالا الفاظ میں ان کو سامنے رکھا جاتا اور پھر اس مضمون کو دوسرے اپنے الفاظ میں دہرایا جائے تو" وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي " کو وهنت عظام بدنی انا وهنت عظام بدنی، انی وهنت العظام من بدنی، انی وهنت العظام منی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن کیا کلام ناس اور کلام رب کا فرق اور اسلوب میں وہی بات ہے جو وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا میں ہے؟

"ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا"

اس موقع پر ہم ایک اور آیت کریمہ کا ذکر کرنا ضروری خیال کرتے ہیں وہ مشہور آیت یہ ہے۔

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ	اور حکم آیا اے زمین نگل جا اپنا پانی اور اے
وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ	آسمان تھم جا اور سکھا دیا گیا پانی اور ہو چکا کام
الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ	اور کشتی ٹھہری جودی پہاڑ پر اور حکم ہوا کہ دور
وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ	ہو قوم ظالم (ہود)

قرآن عزیز میں یہ آیت کریمہ ایسی ہے کہ جس کے وجوہ اعجاز پر علماء نے خصوصیت سے توجہ فرمائی ہے اور مستقل کتابیں اور بحثیں کی ہیں ان میں علامہ ابو حیان محمد بن یوسف اندلسی نے اپنی تفسیر میں علم بدیع کی ۲۱ انواع کا ذکر اس کے تحت میں کیا ہے اور اسی طرح سید محمد بن اسمٰعیل امیر نے اپنی کتاب النھر المورد فی تفسیر آیۃ ھود میں ۲۱ وجوہ سے تعارض فرمایا ہے جس کو ہم گنا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں

ھو المناسبة۱ والمطابقة۲ والمجاز۳ والاستعارہ۴ والاشارة۵ والتمثیل۶ والارداف۷ والتعلیل۸ وصحة التقسیم۹ والاحتراس۱۰ والایضاح۱۱ والمساوات۱۲ وحسن النسق۱۳ والایجاز۱۴ والتسھیم۱۵ والتھذیب۱۶ وحسن البیان۱۷ والتمکین۱۸ والتجنیس۱۹ والمقابلة۲۰ والذم والوصف۲۱۔

ان تمام انواع پر مفصل کلام فرمایا ہے جو اپنے مقام پر موجود ہے اور لطف یہ کہ تمام بحث محض تصویر

کے ایک رخ یعنی بلاغت پر ہے۔ باقی فصاحت معنویہ ولفظیہ پر گفتگو مزید براں ہے۔ اصل بحث کو پڑھنا چاہیئے یہاں تمام کے ذکر کی گنجائش نہیں البتہ مفسرین کی بعض عبارتیں ہم درج کر کے فیصلہ اہل علم اور ارباب ذوق پر چھوڑ دیتے ہیں مدارک میں ہے۔ ومن نظر الطبق المعاندون علی ان طوق البشر قاصر عن الاتیان بمثل هذه الایة ولله در شان التنزیل لایتامل العالم آیة من آیاته الا ادرک لطائف لا تسع الحصر ولا تظنن الایة مقصورة علی المذکور فلعل المتروك اکثر من المسطور۔

مفسر ابو السعود فرماتے ہیں۔ ولقد بلغت الایة الکریمة من مراتب الاعجاز قاصیتها وملکت من غرر المزایا ناصیتها وقد تصدی لتفسیرها المهرة المتقنون ولعمری ان ذلك فوق مایصفه الواصفون فحری بنا ان نوجز الکلام فی هذا اللباب ونفوض الامر الی تامل اولی الالباب والله عنده علم الکتاب۔

جمل حاشیہ جلالین میں ہے۔ قال بعضهم هذه الایة ابلغ ایة فی القرآن وقد احتوت من انواع البدیع علی احد وعشرین نوعا الخ

ہم اوپر کہیں ذکر کر چکے ہیں کہ کفار مکہ اور فصحاء و بلغاء عرب و عدنان کو بھی قرآن کی فصاحت وبلاغت، حسن اسلوب۔ قوت تاثیر، طرز موعظت، شیریں بیانی موزونیت وسلاست کا اعتراف تھا اور بعض نے تو خارق عادت کلام کو دیکھ کر سحر کہنا شروع کر دیا تھا نہ صرف کفار کو قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا یقین تھا بلکہ جنات تک کو قرآنی رشد و ہدایت پر مستحکم عہد کرنا اور ایمان لانا پڑا امام لغت ابو عبیدہ سے مروی ہے کہ ایک بدو نے کسی کلامی کو آیت "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ" پڑھتے سنا تو فوراً سجدہ میں گر گیا اور کہا کہ یہ کلام ایسا فصیح ہے کہ سجدہ کیا جائے [1]

ایک اور مثال سے قرآن کی فصاحت وبلاغت اور اعجاز کو کسی قدر سمجھا جا سکتا ہے وہ یہ کہ عرب میں دستور تھا کہ جو شعراء چوٹی کے تھے ان کے کلام کو خانہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا اور فخر

[1] اس مقام کی مزید تشریح کے لئے فاضل مضمون نگار کو زرقانی علی المواہب ج ۵ کا مطالعہ کرنا چاہیئے (برہان)

مباہات کے طور پر ساری دنیا کو گونگا کہا جاتا تھا اور جب تک قرآن کا نزول نہیں ہوا ایک صدی سے اوپر تک معلقات السبع کو برابر سجدہ کیا جاتا رہا چنانچہ اساتذہ سے سننے میں آیا ہے کہ جب فرزدق نے یہ شعر سنا ؎

وجلا السیول عن الطلول کانھا   زبر تجد متونھا اقلامھا (لبید)

توسجدہ میں گر پڑا۔ (جمہرۃ البلاغۃ)

سموأل ابن عادیا عرب کا مشہور شاعر ہے فخریہ کہتا ہے ؎

وننکر ان شئنا علی الناس قولھم   ولا ینکرون القول حین نقول

ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کی تردید کر سکتے ہیں لیکن ہمارے کہے کی کوئی تردید نہیں کر سکتا اس مضمون کے مشابہ آیت ملاحظہ ہو ارشاد ہوتا ہے۔

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ ۔ سموأل کا فخر صرف یہاں تک محدود ہے کہ اس کی بات کی کوئی تردید نہیں کر سکتا اعمال و افعال ذکر نہیں ہے۔ اور دونوں کے طرز ادا اور اسلوب میں وہی فرق ہے جو کلام رب اور کلام بشر میں ہونا چاہیے۔

نزول قرآن سے قبل کے اشعار، قصائد، نثر اور ابیات محفوظ چلے آتے ہیں اور لوگ برابر اس کو پڑھتے، دہراتے رہتے ہیں۔ اسی طرح نہ جانے کتنی بار امری القیس کا مشہور لامیہ قفا نبک من ذکری الخ پڑھا گیا۔ اس کے معنی بچوں اور طالب علموں کو بتائے گئے، اور اس پر غور و فکر بھی کیا گیا لیکن سوال یہ ہے کہ یہ قصائد و ابیات وغیرہ خود شاعری کے مرتبہ سے ایک انگل بھی آگے بڑھ سکے اور ترقی کر سکے اور کیا لوگوں کے قلوب میں ان کی کوئی خاص جگہ ہے اور کیا ان اشعار نے کوئی خاص انقلاب پیدا کیا اور کیا ان اشعار کی تاثیر کہیں باقی رہ سکی ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ لوگوں کے کلام مثل جنگل کے ہیں جس میں درخت گھاس، کانٹے، پھل، پھول اور کیڑے مکوڑے سب ہی موجود ہیں بخلاف اس کے قرآن گویا پھولوں سے نکلا ہوا عطر، پھلوں سے بنا ہوا شہد جو اثر اور حلاوت کے ساتھ ساتھ

ایسا چمن ہے جس میں نگاہ کے لئے ہر حسن جمع کر دیا گیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی ذات بے ندو بے نظیر "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ" ہے تو اسی طرح اس کے کلام کو بھی سمجھنا چاہیئے، سورہ اعراف میں ایک اسلوب خاص قرآن نے استعمال کیا ہے "وَلَمَّا سُقِطَ فِي أَيْدِيهِمْ" کیا اس اسلوب سے دنیائے عرب وعجم پہلے سے واقف تھی؟ صاحب فتح البیان جن کی نظر بڑی وسیع اور کلام عرب سے خاص دلچسپی تھی فرماتے ہیں "هذا التركيب لم تعرفه العرب الا بعد نزول القرآن" اسی طرح لفظ "تفث" ہے ائمہ لغت میں زجاج اور ابوعبیدہ کا قول ہے "ان اهل اللغة لا يعرفون التفث... ولم يات في الشعر ما يحتج به في معنى التفث" پھر کس مائی کے لال کو معارضہ ومقابلہ کی ہمت ہو سکتی تھی۔

آنحضرت صلعم کے وصال کے قریب بہتوں کو اس طرح کا خیال ہوا تھا جس کو ہم آگے مفصل بیان کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر جان لینا کافی ہے کہ عرب دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان کے مالک تھے اور اپنی عقل وارادہ میں خود مختار تھے ان کا عجز اور ان کی درماندگی دربارۂ قرآن بیّن ثبوت ہے کہ قرآن عزیز کے مثل ایک آیت اور ایک بات بھی لانے سے قطعاً عاجز تھے یہ عجز علوم انسانی کے خصائص سے نہیں بلکہ علوم ربانی کے اعجاز کی بنا پر تھا جس کے سامنے مجبوراً دنیا کو جھکنا اور اعتراف عجز کرنا پڑتا تھا۔

علما کا اعتراف حقیقت | مستشرقین یورپ اور بہت سے علماء کو قرآن حکیم کے سمجھنے میں بہت کچھ مغالطے پیش آئے اور کلام بشر سے کلام الٰہی کے سمجھنے، تفسیروں سے حل کرنے اور لغت ونحو پر کلی بھروسے نے ان کو راہ راست سے ہٹا دیا چنانچہ آیات اور سورتوں کے اسرار ومعارف باوجود غیر معمولی سعی وجہد کے تفسیروں سے حل نہ کر سکے۔ حالانکہ جب قرآن نہ تو سحر تھا اور نہ شعر وکہانت تو پھر کیوں نہ خود قرآن سے پوچھا گیا کہ تو کیا ہے؟ قرآن بتاتا میں نور ہوں، ہدایت ہوں، شفاء ہوں۔ رحمت ہوں۔ دلیل وبرہان ہوں، حکمت اور کتاب ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ رب السموات والارض کا کلام اور اس کا علم ہوں اور تاریخ نے انبیاء، حکماء، اور سیاسیوں و

مقننوں کے جتنے علوم و فنون اپنے اندر محفوظ رکھے ہیں ان سب سے بہتر و اعلیٰ ہوں کیونکہ جب محض انسانی علم انسانوں کی اصلاح و کفالت کا ذمہ دار نہیں تو پھر اسے کیا مانع ہے کہ وہ فطری مقنن خدا کے سامنے نہ جھکے اور جھکے تو کسی شخص اور انسانی علم کے سامنے! خدا تو بآواز بلند فرما رہا ہے۔

"اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں شفاء اور رحمت ہیں اور نا انصافوں کو اس سے الٹا نقصان بڑھتا ہے" (سورہ بنی اسرائیل)

پس جن کے اندر فطری صلاحیت، قلب میں صفائی، روح میں پاکیزگی اور حقیقت کی طلب و جستجو کار فرما تھی وہاں عروس قرآن نے اپنی نقاب حجاب الٹ دی۔ اور جہاں ضمیر پر سو طرح کے پردے پڑے اور دلوں پر قفل لگے تھے وہاں آفتاب ہدایت نے اپنی روشنی تو سلب کر لی مگر ظن اور تشویش ان کے حصہ میں آئی۔ غرض قرآن کی فصاحت و بلاغت اور وجوہ اعجاز پر ذیل کی رائیں خاص طور پر قابل لحاظ ہیں۔

(۱) قاضی ابوبکر باقلانیؒ کا ارشاد ہے۔ قرآن مجید کے اجزاء کی فصاحت میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ ہر کلمہ بلندی کی انتہا پر پہنچا ہوا ہے اور جو کچھ قرآن میں ہے فصاحت کے بلند مرتبے پر ہے۔ "ونحن نعتقد ان الاعجاز فی بعض القرآن اظھر وفی بعضہ ادق واغمض"

(۲) امام عبد القاہر جرجانی وغیرہم فرماتے ہیں کہ اعجاز قرآن تراکیب نحویہ اور وجوہ بلاغت کی بنا پر ہے جس کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ قرآن لفظاً و معنی کے لحاظ سے معجزہ ہے

(۳) استاد مصطفےٰ صادق رافعی کا قول ہے کہ قرآن ایسی لغت میں نازل ہوا ہے کہ اس کی کم سے کم اور چھوٹی سے چھوٹی آیات کے مثل لانے سے انسان قطعاً عاجز ہے۔ قرآن نور کے جملہ سے بہت مشابہ ہے جس کے بعد دوسرا جملہ نور ہی کا لایا جاتے وغیرہ۔

علامہ سیوطی نے ایک لمبی تقریر فرمائی ہے چند فقرے یہ ہیں۔ ان القرآن انما صار معجزاً لانہ جاء بافصح الالفاظ فی احسن نظم التالیف متضمناً اصح المعانی الخ

اس اہم گفتگو میں علامہ سیوطی کے خیال کا خلاصہ یہ ہے کہ جو الفاظ قرآن کریم نے استعمال کئے ہیں معنی بھی اس کے اندر شامل ہے اور یہی چیز وجہ اعجاز ہے (اتقان)

(۵) ڈاکٹر سید حسین مصری کا خیال ہے کہ کلام کی تین قسمیں ہیں۔ شعر، نثر اور قرآن۔ ڈاکٹر صاحب کے کہنے کا منشا یہ ہے کہ قرآن نے ایسا جدید اسلوب اختیار کیا ہے کہ نہ اس کو شعر کہہ سکتے ہیں نہ نثر بلکہ وہ قرآن ہے۔ کیونکہ قرآن دنیاوی نثر و نظم سے لگا نہیں کھاتا بلکہ وہ ایک خاص قسم کی موسیقیت وجاذبیت اپنے اندر رکھتا ہے جو ترکیب الفاظ و تتابع آیات سے محسوس ہوتا ہے الخ۔

(۶) ڈاکٹر زکی مبارک مصری کا قول ہے کہ قرآن عربی نثر ہے اور ایک خاص ادبی اثر اپنے اندر رکھتا ہے جس کو مندرجہ ذیل اوصاف سے سمجھا جا سکتا ہے۔

(۱) قرآن شعر موزوں سے پورے طور پر خالی ہے۔ البتہ ماقبل ومابعد کے لحاظ سے نثر ہے۔

(۲) آیات کا نظام اس طور پر ہے کہ وقوف کامل کے ساتھ قاری کے دل کو آرام محسوس ہوتا ہے اور ایسا سلسلہ نظام ہے جو نثر مرسل اور اس سجع کے مخالف ہے جو عرب جاہلیت کا خاصہ تھا اور بعد اسلام کے بھی جاری رہا۔

(۳) ضرب الامثال اور قصص کا ذکر اور ایک ہی قصہ کو اپنی مناسبت سے بار بار لانا

(۴) بعض جگہ ایسے الفاظ کو لانا جس کا مفہوم نہ سمجھا جائے جیسے الرحمٰن۔ ص وغیرہ

(۵) قرآن نے سجع کا التزام نہیں کیا ہے بلکہ کبھی تو ہم ایک چھوٹی سی سورت میں سجع کو پاتے ہیں اور کبھی بڑی سورتوں میں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سجع سے کلام مرسل کی جانب انتقال ہوجاتا ہے

(۷) نظام ابراہیم بن سیار بن ہانی استاذ جاحظ کا خیال ہے۔ "ان اعجاز القرآن بالصرفۃ الخ" نظام کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کی عقلوں کو قرآن مجید کے معارضہ کرنے سے سلب کر لیا حالانکہ ان کو قدرت تھی یعنی ایک امر خارجی مانع ہوا جس طرح تمام معجزات "معتزلہ کی

کھوپڑی الٹی ہوتی ہے بالخصوص قرآن کے معاملہ میں۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت قل لئن اجتمعت الانس الخ صاف دلالت کر رہی ہے کہ ان کا عجز ان کی قدرت کے ساتھ ساتھ تھا اگر قدرت سلب کر لی گئی ہوتی تو اس تحدی وچیلنج کا فائدہ ہی کیا ہوتا؟ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ تحدی زمانے کے زوال کے ساتھ ساتھ اعجازِ قرآن کا بھی معاذ اللہ زوال ہو گیا

(۸) شیخ طہ حبیب کا ارشاد ہے: "القرآن هو اللفظ العربي، المنزل على محمد عليه الصلوٰة والسلام المتعبد بتلاوته المتحدى باقصر سورة منه، المتواتر، فالمنزل هو اللفظ المقروء ..." وجملة القول ان المنزل والمقروء ليس هو الصفة القديمة كما هو ظاهر"

([illegible] علوم القرآن الکریم)

شیخ صاحب مرحوم کی عبارت صاف ہے البتہ بحث فرق کلام اللہ اور قرآن کے متعلق جو ان کی تحقیق ہے وہ یہ ہے کہ کلام اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ صفت قدیمہ ہے جو سکوت اور آفت کے منافی اور حروف واصوات کی جنس سے نہیں ہے اور امر و نہی واخبار ہونے کی وجہ سے نہ تو مختلف ہوتی ہے اور نہ ماضی وحال اور استقبال سے متصف ہوتی ہے الا بحسب التعلقات والاضافات۔ خلاصہ یہ ہے کہ منزل اور مقروء یہ صفت قدیمہ نہیں ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ تحقیق کلام نفسی

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کلام کی نسبت ہمیشہ تالیف کرنے والے کی طرف ہوتی ہے اگرچہ تلفظ کسی کا ہو منجانب کسی کے ہو اور زبان پر کسی کے ہو۔ کلام کا تالیف کرنا حقیقتہً قلب کا کام ہے اس لئے اصل کلام کلام نفسی ہوا جو کہ قلب اور فواد کا کلام ہے زبانی الفاظ اور کاغذی نقوش وغیرہ جو خزانہ حافظہ میں محفوظ ہو گئے ہیں سب اسی کلام نفسی کے ظلال و آثار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت علم اور صفت کلام سے جو کہ دوسرے صفات ازلی کی طرح حقیقیہ اور ازلی ہیں قرآن کو تالیف فرمایا اس لئے معانی اور الفاظ قدیم ہوں گے اور تلفظ مثلاً تحریر نزول وغیرہ حادث ہو گا۔ ان الفاظ میں ازل کے اندر تقدم اور تاخر صرف ذاتی ہو گا زمانی نہ ہو گا اس لئے کلام لفظی کو حادث کہنا خلاف تحقیق ہو گا۔ صرف تلفظ حادث ہے کلام نفسی و لفظی حادث نہیں کما فصلہ بحر العلوم فی فواتح الرحموت۔ امام احمد بن حنبلؒ کا اس کو قدیم کہنا اسی بنا

پرتھا مگر بہت سے حنابلہ نہ سمجھ سکے اور یہی معنی ہیں امام ابو یوسفؒ کے اس ارشاد کے "ناظرت اباحنیفۃ ستۃ اشھر ما جتمع رائی ورایہ علیٰ ان من قال بخلق القرآن فھو کافر"

اس مختصر تشریح سے یہ بات بھی نکل آتی ہے کہ اعجاز اور تحدی جو چودہ سو برس سے قائم ہے وہ ہمیشہ قائم رہے گی اور منجملہ قرآنی حکمتوں کے یہ حکمت بھی مسلم ہے کہ قرآن قدیم ہے اور کلام قدیم جس کو کلام نفسی سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کا معارضہ محال اور یہ چیلنج قبول کرنا ناممکن ہے۔

(۹) ابوالحسین احمد بن یحییٰ المعروف بابن الراوندی معتزلی بلکہ ملحد کہتا ہے۔ کہ مسلمانوں نے اپنے نبی کی نبوت پر قرآن کو دلیل میں پیش کیا ہے اور دلیل یہ دی کہ آنحضرت صلعم، نے اہل عرب کو چیلنج کیا کہ قرآن کے مثل لاؤ مگر عرب اس کے مثل لانے اور معارضہ سے عاجز رہے (مذاق کے طور پر) کہتا ہے کہ اگر یہی چیز دلیل نبوت ہے تو اگر اقلیدس یہ دعویٰ کرے کہ میری کتاب کے مثل لاؤ اور دنیا لانے سے عاجز رہے تو اس سے میرا نبی ہونا ثابت ہو جائے گا؟

ابن الراوندی کی ہفوات میں مغالطہ کو بڑا دخل ہے وہ یہ کہ اقلیدس کو خود بھی یہ طاقت نہیں کہ دوسری کتاب اس کے مثل بناوے یا کسی اور قضیئے و مقالے کا اضافہ کر سکے لہذا اقلیدس اور دوسروں کا عجز مساوی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اقلیدس نے اپنی کتاب میں حقائق کا اختراع نہیں کیا ہے پس ابن الراوندی کی حماقت سے اقلیدس اور اس کی کتاب کی کوئی اہمیت نہیں ثابت ہوتی ہے۔ ابن الراوندی کو معلوم نہ تھا اور نہ اقلیدس کو گمان تھا کہ تیرھویں صدی ہجری میں چریا کوٹ ضلع اعظم گڈھ کے اندر ایک ہستی پیدا ہوگی جو مولانا عنایت رسول کے نام سے پکاری جائیگی اور سر سید جیسے لوگوں کو اس کی شاگردی کا شرف حاصل ہوگا وہ اقلیدس کے مقالوں پر اضافہ کر دے گا اگر اقلیدس زندہ ہوتا تو داد دیتا اور ابن الراوندی کو اپنی طالب علمانہ جہالت کا اعتراف کرنا پڑتا۔ ملاحظہ ہو "مقولات عضدیہ" (البشریٰ ص۲۵)

(۱۰) حضرت استاد امام مولانا حمید الدین الفراہیؒ صاحب تفسیر نظام القرآن نے وجوہ اعجاز قرآن پر مفصل کلام فرمایا ہے۔ اسالیب القرآن غیر مطبوع اور جمہرۃ البلاغۃ مطبوع کے اندر وہ

حقائق علمی بیان فرماتے ہیں جو صرف حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا حصہ تھا اور صرف آپ کی ایک
ذات ایسی تھی کہ مطالب قرآن، مشکلات قرآن وغیرہ پر آج کل کی نت نئی قرآنی بے راہ روی میں
رجوع کیا جاسکتا تھا جس کو سرزمین مصر نے ہم سے چھین لیا" انما اشکوا بثی وحزنی من اللہ"
اثناء درس میں جو کچھ باقی یاد رہ گئی ہیں وجوہ اعجاز قرآن پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر
خیالات کو ہم قول فیصل کے طور پر پیش کرتے ہیں تفصیل کے لئے انتظار کیا جائے یا مذکورہ بالا
کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

ایک عام مصیبت | علماء بلاغت کی بنیادی کمزوری ارسطو کی تقلید ہے اگر بلاغتِ قرآنی میں خود قرآن
اور اسلوب کلام عرب کے صحیح تتبع اور حقیقی معرفت کو اساس قرار دے کر وجوہ اعجاز کو پرکھا
جاتا تو "خشت اول چوں نہد معمار کج ۔ تا ثریا می رود دیوار کج " کی مثل صادق نہ آتی اور نہ
الفاظ اور اس کے صنائع وبدائع کو معنی کے خیال سے زیادہ حیثیت دی گئی ہوتی بلکہ جو شخص تکمیل
نطق اور بلاغت کرنا چاہتا اس کو سب سے پہلے اپنی عقل، فکر اور تمیز کی تکمیل کرنی چاہئے تھی
کیونکہ بہت سے لوگ فصیح تو ہیں کہ بلبل اور طوطے کی طرح خوش آوازی میں لوگوں کو متوجہ کر لیتے
ہیں لیکن ان کے اندر حقیقت اور معنیٰ کا نام ونشان تک نہیں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر حریری کے
کلام کو سامنے رکھئے اور بعض احمق اور بد مذاق لوگوں کی جرأت کو ملاحظہ فرمایئے۔ کہ حریری
کے مقامات کو (نعوذ باللہ) قرآن سے بہتر قرار دے دیا ہے۔ بھلا آب حیات کو مردار سے کیا
نسبت اور چراغ مردہ کو نور آفتاب سے کیا تعلق ہے؟" این الجیفۃ من ماء الحیات"
زمخشری جو کلام عرب پر گہری نظر رکھتا ہے وہ بھی اس نازیبا تقلید سے نہ بچ سکا اور کہہ گیا۔

اقسم باللہ وآیاتہ　　　ومشعر الحج ومیقاتہ

ان الحریری حری بان　　　تکتب بالتبر مقاماتہ

حریری ہی کا یہ فقرہ بھی تو ہے " اقمر لیلہ الدجوجی " اس کی تاریکی والی رات چاندنی والی ہوگئی
ہے۔ لفظ " دجوجی " نے فقرے کی رونق کو مٹا دیا ورنہ استعارہ برا نہ تھا پھر بھی قرآن کے ارشاد

"وَاشْتَعَلَ الرَّاسُ شَیْبًا" سے ان کو کیا علاقہ ؟

یہ تمام باتیں اسی عمومِ بلوی کی پیداوار ہیں اور ایسا فتنہ ہیں جس نے فہم بلاغت اور اعجاز قرآن کے دروازوں کو بند کر دیا ہے۔ غور کا مقام ہے امام ابو بکر باقلانیؒ جیسا مبصر جس نے اعجاز قرآن پر بہترین کلام کیا ہے اور معترضین کے جوابات دے کر قرآن عزیز کی پوری پوری حمایت کی ہے وہ بھی اس ہمہ گیر مصیبت سے بچ نہ سکا اور نہ جانے یہ کیسے کہہ دیا کہ آیت "حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ الخ" میں کوئی خاص بلاغت نہیں ہے۔ (سبحان اللہ، جمہرۃ البلاغۃ)

اسی طرح کی بات ابو نصر قشیریؒ نے کہہ دی ہے "لا ندعی ان کل ما فی القرآن علی ارفع الدرجات فی الفصاحۃ" جس کی توجیہ بعض فدبار نے یہ کی ہے کہ اگر تمام قرآن فصاحت میں برابر ہوتا تو وہ موجودہ طریقہ پر نہ ہوتا اور اس کے معارضہ کرنے سے کلی طور پر عجز کا اظہار ہو جاتا۔ غرض ان معروضات کے بعد استاد امام مولانا فراہیؒ کے خیالات دربارۂ اعجاز قرآن ہم پیش کرتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

دیوانِ مخلص کا ایک نادر نسخہ

از

(مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی)

رای رایان آنند رام مخلص محمد شاہی عہد کے مشہور ادیب ہیں۔ یہ ذولسانتین "ذو زبان" شاعر تھے، اس لئے اردو و فارسی دونوں زبانوں کی محفل شعر و سخن میں ان کا مذکور رہتا ہے۔
کتاب خانۂ رام پور میں مخلص کے دیوان کا ایک بیش قیمت نسخہ محفوظ ہے۔ یہ نہایت عمدہ انڈے کے رنگ کے دبیز کشمیری کاغذ پر عمدہ شفیعا آمیز نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے۔
اس کے سرورق پر کسی نے لکھا ہے:

"دیوان آنند رام مخلص، خاص مسودۂ مصنف میر منشی محمد شاہ بادشاہ غازی، اوستاد مرزا ہمایوں شاہ"

نسخۂ مذکور کے حاشیوں پر بہت سے اشعار "راقمہ" عنوان کے تحت مندرج ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان اشعار کا کاتب ہی ان کا مصنف یا ناظم بھی ہے۔ خود متن کے اندر بھی بہت سے شعر اسی خط میں بڑھائے گئے ہیں، اور جگہ جگہ اشعار، مصرعے اور الفاظ قلمزد کر کے ان کی جگہ دوسرے شعر، مصرعے یا الفاظ بھی اسی خط میں لکھے گئے ہیں۔ کتاب خانۂ رام پور میں سفرنامۂ مخلص کا ایک نسخہ خود مخلص کے قلم کا محفوظ ہے۔ اسی کے قلم کی ایک بیاض اشعار کے چند ورق بھی موجود ہیں ان سب کا انداز خط دیوان کے حواشی کے اضافوں اور متن کی جگہ کے خط سے ملتا جلتا ہے[1]۔

---

[1] اورنٹیل کالج میگزین لاہور بابتہ نومبر ۱۹۳۱ء کے صفحہ ۹۰ کے مقابل مخلص کی ایک تحریر کا عکس شائع ہوا ہے۔ اس کا خط بھی زیر نظر دیوان کے اضافوں کے مشابہ ہے۔

اس سے یہ بات حدِ یقین کو پہنچ جاتی ہے کہ سرورق کی تحریر میں اس کو مسودۂ مصنف قرار دینا امر واقعی ہے۔

دیوان کا آغاز ایک طلاکار صفحے سے ہوتا ہے اور اقسامِ نظم میں پہلے غزلوں کو جگہ دی گئی ہے جو صفحہ ۲۵۹ پر ختم ہو جاتی ہیں۔

صفحہ ۲۶۲ سے ایک چھوٹی سی مذہب لوح کے تحت رباعیاں شروع ہوتی اور صفحہ ۲۸۹ پر انجام کو پہنچی ہیں صفحہ ۲۹۲ سے قطعات تاریخ کا آغاز ہوتا ہے یہ بھی ایک مذہب چھوٹی سی لوح کے تحت شروع اور صفحہ ۳۱۴ پر ختم ہوتی ہیں صفحہ ۳۱۶ سے صفحہ ۳۲۰ تک "اشعار ریختہ" درج کئے گئے ہیں، جن کی کل تعداد ۳۲ ہے ان اشعار کا عنوان حسب ذیل ہے۔

• اشعار ریختہ کہ گاہی بنا بر تفریح طبیعت گفتہ می شود:۔

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مخلص اردو شعر تفریح طبع کی خاطر کہا کرتا تھا، اور چونکہ ان تفریحی اشعار کی تعداد کل ۳۲ ہے اسی بنا پر یہ بھی یقین ہے کہ اسے اس تفریح کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اندریں صورت میر تقی میر سے لے کر حکیم قاسم صاحب مجموعۂ نغز تک کے تذکرہ نگاروں کا اسے شعرائے اردو میں شمار کرنا صرف اسی سے تو درست ہے کہ وہ دہلی کے صاحبانِ اقتدار میں شامل تھا ورنہ ۳۲ شعر کہنے والے شاعر محمد شاہی کو اساتذۂ اردو کی صف میں کسی طرح جگہ نہیں دی جا سکتی۔

اس دیوان کے مطالعے سے یہ بات بھی بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ مخلص نے قصیدہ گوئی سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مداحی کو ناپسند کرتا تھا، اس لئے کہ قطعات میں اس نے اپنے خداوند نعمت کی خاصی مدح سرائی کی ہے بلکہ اس کی طبیعت کو قصیدے کے مقابلے میں غزل سے زیادہ لگاؤ تھا اس لئے اس نے بڑی دانش مندی سے کام لیا کہ قصیدے کے ہفتخواں کو طے کرنے کا کبھی ارادہ ہی نہ کیا۔

قطعات کے آخر میں (ص ۳۱۴) مخلص نے یہ قطعہ درج کیا ہے:۔

پر تو فشاں چو گشت دریں عالمِ سخن　　　خورشیدِ انورِ نظرِ خانِ آرزو

نابود گشت سایۂ اسقام یک قلم | اصلاح نور ریخت بہر گاہ چارسو
صد جای خط کشید برابیاتِ ناپسند | بنود چوں قلم حرکت در بنانِ او
ہر یک خطی است جادۂ من اندر طریق | باشم زرہبر شاہدِ معنی بجستجو
اصلاح را چو کز لکِ تیزی بکف گرفت | بستر د مصرعی کہ بیاورد بہ ازو

اس کے بعد آرزو کی تعریف میں یہ دو شعر لکھے ہیں۔

شبستان معانی از تو روشن | سزد گویم ترا گر شمع ایں فن
جہاں را باعث آئیں تو باشی | بدیں خود سراج الدیں تو باشی

ان اشعار سے خان آرزو کے اُس دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ

"در عنفوانِ شباب اشعارِ خود را از نظر میرزا بیدل مرحوم گذرانیدہ۔ ازاں زماں باین عاجز مشورہ مربوط است"[1]

مجمع النفائس میں آرزو نے مخلص کے جو شعر انتخاب کئے ہیں ان کے الفاظ کا زیرِ نظر دیوان کے الفاظ سے مقابلہ کرنے پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آرزو سے اصلاح لینے کے بعد بھی مخلص اپنے کلام کو پرکھتا رہا ہے اور جہاں کہیں کوئی مناسب تبدیلی سوجھی ہے بلا پس و پیش کر ڈالی ہے مثلاً آرزو کے یہاں اُس کا ایک شعر اس طرح درج ہوا ہے:۔

دریوزہ گر حضرت عشقیم چو مخلص | بر دل بنویسید براتِ صلۂ ما

زیرِ نظر دیوان میں مصرع اول کو قلمزد کر کے یہ مصرع بہم پہنچایا ہے

مشہور بہ داحی عشقیم چو مخلص

اسی طرح آرزو نے ایک غزل کے یہ دو شعر چنے تھے:

عیشہا کردہ شد کہ ہماں بود | دخترِ تاک شب بخانۂ ما
قصۂ کوہ کن بود گویا | بوی خوں آید از فسانۂ ما

---

[1] مجمع النفائس (مخطوطۂ رامپور)، ورق ۴۲۶ ب

دیوان میں یہ دوسرا شعر نہیں ہے، مگر ایک شعر کی سادہ جگہ موجود ہے اور کاغذ کو دیکھنے سے آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں کوئی شعر لکھا ہوا تھا جسے چھیل ڈالا گیا ہے۔ مجھے یہ گمان ہے کہ مخلص نے اسی شعر کو ناپسند کر کے چھیل پھینکا ہے

آرزو نے ایک اور شعر اس طرح نقل کیا ہے :-

برسبیلِ شکوہ خواند ایں بیت سالک پیشِ یار   مخلص ما یعنی آں سرحلقۂ دیوانہ ہا

دیوان میں بھی یہ شعر پہلے اسی طرح لکھا گیا تھا۔ بعد میں مخلص نے مصرع ثانی کے الفاظ "یعنی" "کو کاٹ کر اس کے اوپر "دلدادہ" تحریر کر دیا ہے۔

آرزو نے یہ شعر بھی انتخابی قرار دیا تھا۔

زندگی تا کی بکامِ دیگراں   خانۂ یاس مبتہا خراب!

مگر مخلص نے اس پر خط بطلان کھینچ دیا ہے۔

حسب ذیل شعر آرزو کا منتخبہ تھا:-

کنم جاں پیش کش، در دل چو ابروی تو جاگیرد   بہ قیمت آشنا شمشیر را از آشنا گیرد

"دہم جاں، یاد ابرو یش بدل ہرگاہ جاگیرد" دیوان میں مخلص نے پہلے مصرع یوں بدل دیا ہے

آرزو نے یہ مطلع بھی چن لیا تھا۔

دلم پراست بہ ننگے زیادِ خوش چشماں   کہ چیدہ اند در آئینہ خانہ نرگسداں

مخلص نے اسے قلمزد کر کے تو دوسرا مطلع بہم پہنچایا اور اس قافیے کو اس طرح نظم کیا

برابر دی آں شوخ می نماید چشم   چنانکہ کس بگذارد بطاق نرگسداں

آرزو نے مجمع النفائس میں مخلص کے جتنے شعر چنے ہیں دیوان کے زیر نظر نسخے میں ان کے بالمقابل حاشیوں پر یہ علامت (ہ) ثبت ہے۔ اس سے میں نتیجہ نکالتا ہوں کہ انتخاب اشعار کے وقت آرزو کے مطالعے میں یہی نسخہ تھا۔ لیکن کچھ نشان زدہ شعر تذکرے میں نہیں ملتے اور تذکرے میں مذکور متعدد بیت دیوان میں بے نشان نظر آتے ہیں[1]۔ اس سے میں قطعی فیصلہ

---

[1] جن شعروں پر دیوان میں تو نشان نظر آتا ہے لیکن تذکرے میں انھیں داخل نہیں کیا گیا۔ ان کی تعداد (۲۹) ہے اور جن شعروں پر دیوان میں نشان نہیں ہے تاہم تذکرے میں نقل کئے گئے ہیں ان کا شمار (۷) ہوتا ہے۔

کرنے سے قاصر ہوں، تاہم ظن غالب یہی رکھتا ہوں کہ آرزو نے اسی نسخے کو اپنے سامنے رکھا تھا
مذکورۂ بالا تفصیل سے یہ بات صاف طور پر مترشح ہے کہ مخلص نے اپنا کلام آرزو کو دکھا
کر کسی کاتب سے صاف کرایا، اور بعدازاں موقع بموقع کمی، بیشی اور ترمیم کرتا رہا۔ چنانچہ اسی
شعر میں اپنی "نظر ثانی" کا ذکر بھی کرتا ہے:

للہ الحمد کہ در عرصۂ کمتر شعرم   بگذشت از نظر ثانی مخلص یک یک

ایک بات آخر میں اور کہتا چلوں۔ دیوان کے صفحۂ ۸ا کا پہلا شعر یہ ہے:-

می رسد بر لالہ و گل ناز رخسار ترا   دادہ اند آب از سبوی بادہ گلزار ترا

مصرع اول کے اوپر (بغیر قلمزد کئے) کسی نے یہ مصرع لکھا ہے۔

"گشتہ مستی لالہ کار حسنِ رخسار ترا"

اور دائیں جانب کے حاشیے پر باریک خط میں یہ عبارت درج کی ہے:

"صاحبا، مصرع اول پستر بود۔ بدلش نگاشتہ شد" اس کے بعد ایک علامت دستخط
کی سی ہے اور پھر فقط کی علامت تحریر ہے۔

یہ خط نہ مخلص کا ہے نہ خان آرزو کا کیونکہ مخلص کی جو معتبر تحریریں میں نے دیکھی ہیں،
اور جن کا اوپر ذکر بھی کر چکا ہوں، وہ اس سے بالکل جدا اندازِ خط میں ہیں۔ رہے خان آرزو
تو ان کے قلم کی لکھی ہوئی دو کتابیں مستقل ہمارے کتابخانے میں موجود ہیں ان کے ماسوا
"بہارِ عجم" کی ایک جلد محفوظ ہے، جس کے حاشیوں پر ان کے قلم کے تنقیدی نوٹ ثبت
ہیں۔ ایک نسخہ "علی حزیں کے "تذکرۃ الاحوال" کا بھی آرزو کے اپنے قلم کے لکھے ہوئے
اعتراضات پر مشتمل یہاں ہے۔ ان سب کے پیشِ نظر میں یہ بھی نہایت وثوق کے ساتھ کہہ
سکتا ہوں کہ مذکورۂ بالا تحریر کا آرزو سے کوئی خطی علاقہ نہیں ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آرزو نے
حاضرین جلسہ میں سے کسی سے یہ نوٹ لکھوا دیا ہو۔

دیوان کے آخر میں ایک ورق ہے جس پر یہ عبارت درج ہے:

"بتاریخ نہم شہر رجب المرجب ۲۰ جلوس محمد شاہی روز یک شنبہ طرف صبح بخط مصنف باتمام رسید"

بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ عبارت دیوان کے اتمام کی تاریخ بتاتی ہے لیکن خود دیوان مخلص کے قلم کا لکھا ہوا نہیں ہے اس بنا پر میرا گمان یہ ہے کہ اس آخری ورق سے پہلے کے کچھ صفحات گم ہو گئے ہیں۔ اُن پر کوئی نظم مخلص نے اپنے قلم سے لکھی ہوگی۔ یہ تاریخ اس کی کتابت کو ظاہر کرتی ہے۔ تاہم اس سے یہ اندازہ کر لینا آسان ہے کہ اصل دیوان کی ترتیب ۲۰ سنہ جلوس محمد شاہی مطابق ۱۱۵۱ھ سے قبل ہی عمل میں آچکی تھی۔

تلخیص و ترجمہ

ہندی ادب کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ

اس عنوان سے مہامہوپادھیاڈاکٹر پنڈت لکشمی دھر ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی صدر شعبۂ سنسکرت "ہندی دہلی یونیورسٹی کا ایک فاضلانہ مقالہ "دی اسٹیٹسمین" میں حال ہی میں شائع ہوا ہے قارئین برہان کے لئے ذیل میں اس کا ملخص ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ (س)

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں نے ہندی ادب کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اس پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ جو لوگ اسلامی کلچر کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ صرف ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت کے عروج وزوال کے مطالعہ تک اپنی کوشش کو محدود رکھتے ہیں لیکن میرے خیال میں مسلمانوں کی حکومت کی وسعت اور اس کی ترقی وعروج کا مطالعہ ہندوستان میں اسلامی کلچر کی ترقی اور اس کے نشوونما کی صحیح تاریخ پر مشتمل نہیں ہو سکتا کیونکہ دنیا کی دوسری حکومتوں کی طرح ہندوستان کی مسلم حکومت بھی ان ارباب سیاست کی تخلیق تھی جن کی سیاسی پالیسی اپنے زمانہ کے سیاسی تخیلات کے زیر اثر ہوتی ہے اسلام کے صحیح تصورات وافکار کے ساتھ اس کا لگاؤ نسبتہً کم تھا۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی اچھائیاں یا برائیاں ان کی اپنی تھیں۔ اس لئے ان بادشاہوں کے اعمال وافعال کی روشنی میں اسلامی احکام و مسائل کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا انصاف سے قریب نہیں ہے اگر ہم چاہتے ہیں کہ گذشتہ چھ یا سات صدیوں میں اسلام نے ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں جو حصہ لیا ہے اس کا مطالعہ کریں تو ہم کو اسلام کے روحانی پیشوا جو اس ملک کے عوام کے ساتھ رہتے سہتے تھے اور جنھوں نے اپنے عقیدہ وعمل کے ذریعہ باشندگان ملک کی بڑی شاندار خدمات انجام دی ہیں ان کی

ہندی زبان کی تصنیفات کا مطالعہ کرنا چاہئے خوشی کی بات ہے کہ صوفیائے اسلام کی یہ گرانقدر تصنیفات زمانہ کے دستبرد سے محفوظ رہ گئی ہیں، یہ تصنیفات گنتی میں اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر ہندی زبان کے فضلاء ادبا اس تمام مواد کو جمع کرکے مرتب کریں تو اس کے لئے کئی نسلیں درکار ہوں گی، افسوس ہے کہ فصل پکی ہوئی ہے لیکن اس کو کاٹنے والے بہت کم ہیں خود میں نے جو فہرست مرتب کی ہے اس میں کم از کم ہندی زبان کے پانچسو مسلمان مصنفین کے نام مع ان کی کتابوں کے نام اور تاریخ تصنیف وغیرہ کے درج ہیں اور ان میں سے بعض بعض کتابیں تو اسلام کی بہترین تشریح وتوضیح پر مشتمل ہیں، یہ تصنیفات اس بات کا ثبوت ہیں کہ صوفیا اور ہندی کے مسلمان مصنفین نے ان مواقع سے فائدہ اٹھایا جو انھیں ہندوؤں کے ساتھ ملنے جلنے سے حاصل ہوتے اور اس طرح اپنے اور ہندوؤں کے دونوں کے فائدہ کے لئے خود ہندوؤں کی زبان اور ادب کے ذریعہ ان کے ساتھ ایک وفاقی تعلق پیدا کرلیا، مسلمان حکومت اسباب طبعی کی وجہ سے فنا ہوگئی لیکن اسلام کے صوفیا اور ہندی کے مسلمان شاعروں کی کوششوں کی بدولت اسلام جو ظاہر ہے کہ اس ملک کی تخلیق نہیں ہے آج بھی اس ملک میں باقی ہے اور ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں، ہندی زبان کے ذریعہ اسلام کی روح ہندی گھرانوں کے اندر تک پہنچی اور جیسا کہ میں بتاؤں گا یہی مقصد تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں نے پہلے ہندی زبان کو ایک شکل وصورت دی اور اس کے بعد ترتیب وتہذیب کرکے اس کا معیار اونچا کیا۔

یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ سب سے پہلے جن لوگوں نے روزمرہ کی ہندی بولی کو ادبی مقاصد کے لئے استعمال کیا وہ مسلمان ہی تھے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ روزمرہ کی اس بولی کو برہمنوں نے ایک ناشائستہ زبان سمجھ کر بالکل نظرانداز کر رکھا تھا اور وہ اس کو اپنی توجہ کے لائق نہیں سمجھتے تھے تاریخ ہند کے ایک نہایت نازک دور میں جب کہ ہندوؤں کا قدیم مذہب عوام کے دماغوں پر اپنی گرفت قائم رکھنے میں ناکام ہوگیا تھا اور غیر تعلیم یافتہ طبقات میں بیہودہ رسوم وروایات

جا بکھر گئی تھیں مسلمان مصنفین نے ہندی زبان کے ذریعہ ہندوستان کے لوگوں میں از سر نو مذہبی شعور و بیداری پیدا کرنے کی غرض سے اسلام کے تبلیغی فلسفہ کی تشریح کی اور روحانی ابتری و پراگندگی کے اس زمانہ میں صوفیائے اسلام اور دوسرے مسلمان اہل قلم نے اسلام کے اخوت و محبت انسانی اور توحید کے پیغام کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ پھیلایا اور یہ سب کچھ انھوں نے ہندی زبان میں ہی کیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے یکے بعد دیگرے عوام کی زبان یعنی ہندی میں مختصر افسانے اور کہانیاں لکھیں اور ان کے ذریعہ اس عشق و محبت الٰہی کا پرچار کیا جس کی تعلیم اسلام دیتا ہے چنانچہ قطبن نے مرگوتی لکھی اور منجھن نے مادھومالتی تصنیف کی۔ جائسی نے پدماوتی کا ایک بیش قیمت تحفہ پیش کیا اور عثمان نے چتراوتی اور نور محمد نے اپنے عہد میں اندراوتی سے ضیافت کی۔ اس عالمگیر اخوت و محبت اور امن و عافیت کے پیغام کا ہی یہ اثر تھا کہ ہندوستان کی زوال پذیر روح پھر ایسی ہی شگفتہ و تازہ ہو گئی جیسے کہ صبح کے سورج کی کرنوں کے اثر سے کنول کا پھول۔

ہندی زبان کے ان مسلمان مصنفین کو اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ وہ ہندوؤں کے عیوب اور ان کی کمزوریوں کو بیان کرتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسا کرنے سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہوگا اور مذہب کے متعلق غلط تخیل پیدا ہو جائیگا اس کے برخلاف وہ ہندوؤں سے اس درجہ گھل مل گئے کہ ہندولان کو محبت اور ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس طرح ان کو موقع ملا کہ وہ ہندوؤں کے خیالات و احساسات کو بلند اور اسلامی پیغام امن و عافیت سے انھیں روشناس کریں۔ ہندی کے مسلمان مصنفین نے اپنی کتابوں میں ہولی اور بسنت جیسے ہندو تہوار۔ اور رادھا اور کرشن ایسی شخصیتوں کی بھی بڑی تعریف کی ہے اور ساتھ ہی انھوں نے عشق الٰہی کا جو اسلام کا خاص پیغام ہے بڑے جوش و خروش سے پرچار کیا ہے ان دونوں کے امتزاج سے ہندوستان میں ایک نیا کلچر پیدا ہوا اور اس ملک کو ایک نئی زندگی ملی جو مختلف عناصر کے اتحاد و امتزاج کا ایک خوشگوار نتیجہ تھی

ان مسلمان مصنفین ہندی کے متعلق یہ کہنا مبالغہ سے یکسر خالی ہے کہ ان لوگوں نے ہندوستان کو پایا اینٹ کا بنا ہوا لیکن انھوں نے اپنے ہاتھ سے اس کو سنگ مرمر کا بنا دیا پرتندو ہرش چندر جو جدید ہندی شاعری کا موجد ہے اس نے انھیں مسلمان صوفیا کے متعلق بجا کہا ہے کہ

इन मुसलमान हरिजन पै कोटिन हिन्दू वारिये

یعنی میں ان خدا پرست مسلمانوں کی خاطر کروروں ہندو قربان کردوں۔

اپنے امن و خیرخواہی کے پیغام کو زیادہ سے زیادہ شائع اور عام کرنے کے لئے ان مسلمان مصنفین نے اس زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جو عوام کی زبان تھی اور جس کا نام ہندی ہے چنانچہ جائسی کہتا ہے :-

तुरकी अरबी हिन्दुवी भाषा जती आहि
जामे मारग प्रेम का सबै सराहे ताहि

امیر خسرو نے جدید ہندی شاعری کی ایک شکل ایسی ہی مقرر کی جیسے کہ انشاء اللہ خاں نے ہندی نثر کی تھی ملک محمد جائسی نے دوہے اور چوپائی کے امتزاج سے ایک خاص شکل پیدا کی اور اس میں اپنی مشہور مثنوی پدماوتی لکھ کر تلسی داس کے لئے ہندی رامائن لکھنے کا راستہ پیدا کیا ہندی شاعری کے مرثی اسکول نے تحریکِ ذہنی کے ذریعہ جو ایک سچی شاعری کی روح ہوتی ہے ہندی ادب میں غیر معمولی اضافہ کیا اور ہندی کے مسلمان اہل قلم نے جو عربی اور فارسی کے بھی نامور فاضل ہوتے تھے اچھوتی اور نئی تشبیہات و استعارات اور قدیم ادبیات کے گوناگوں اسالیبِ بیان کے ذریعہ ہندی شاعری کو مالا مال کیا بعض مسلمان ہندی شاعروں نے تو اس قدر اچھوتی تشبیہات پیدا کی ہیں کہ ان کا جواب نہیں ہو سکتا مثلاً ایک شاعر اپنے محبوب کی آنکھ کی تعریف اس طرح کرتا ہے :-

अमी हलाहल मद भरे सेत साम रतनार
जियत मरत झुक झुक परत जेहि चितवन एक बार

یا مثلاً ایک مسلمان شاعر ایک نوجوان ہندو عورت کو شوہر کی ارتھی کے ساتھ ستی ہوتے ہوتے دیکھتا ہے تو فوراً اس کو اس کنول کے پھول کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے جو آگ میں پڑا ہوا ہو۔

अगनिकुंड फूलवे कँवल

یہ دو مثالیں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ مسلمان شاعروں نے اپنے اعلیٰ تخیل اور نفاست کلام سے ہندی شاعری میں کتنا زور پیدا کر دیا تھا

شاعری کے دوسرے اصناف کی طرح مسلمانوں نے ہندی گیت کو بھی بڑی ترقی دی اور اس میں بھی انھوں نے طرح طرح کی ایجادیں کیں۔ ان مسلمانوں کی فہرست بہت طویل ہے مختلف سروں کی طرح ٹھمری۔ ٹپہ اور دادرا مسلمانوں کی ہی ایجاد ہے۔

ہندی کے مسلمان شاعروں کی دو خصوصیات بہت زیادہ نمایاں اور قابل ذکر ہیں ایک اعلیٰ تخیل اور دوسرا حسنِ بیان و محاکات جن شاعروں کے کلام میں یہ دونوں اوصاف بدرجۂ کمال پائے جاتے ہیں ان میں سے چند ایک کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

(۱) امیر خسرو (تیرھویں صدی عیسوی) ہندی میں امیر خسرو کو اس شہد کی مکھی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو رنگ برنگ کے پھولوں سے مٹھاس چوستی ہے اور پھر ان سب کی ترکیب سے شہد بنا کر پیش کر دیتی ہے امیر خسرو کی ہندی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زبان نہایت رسیلی اور شیریں و رواں ہے اور ان کے ہاں الفاظ اور جملوں کی ساخت جو ہندی زبان پر ان کی غیر معمولی قدرت کا نتیجہ ہے اس قدر حیرت انگیز اور عجیب و غریب ہے کہ ان کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔

(۲) جائسی (۱۵۴۰ء) ان کی شاعری سوز و گداز سے پُر ہے۔ جائسی پہلا شخص ہے جس نے ہندی کے لئے ادبیات کی صف میں ایک جگہ پیدا کی اس کی پدماوتی اپنے غیر معمولی بلند تخیل کے باعث ہندی زبان کا ایک لافانی اور بے حد موثر شاہکار ہے۔

(۳) عبدالرحیم خانخاناں (از ۱۵۵۶ء تا ۱۶۲۶ء) خانخاناں بہت سی زبانوں کے چمن سے

رنگ رنگ کے پھول جمع کرتا ہے اور ان سب کا ایک خوشنما ہار بنا کر اسے ہندی شاعری کے گلے کی زینت بنا دیتا ہے۔ اس کی ست سائی اور اسی طرح کی دوسری تصانیف مابعد کے لئے رہنما کا کام کرتی ہے خانخاناں کا عہد ہندی شاعری کا عہدِ زریں ہے جب کہ عظیم المرتبت مغل بادشاہوں کے دربار میں اس زبان اور اس کی شاعری کی بڑی محبت اور توجہ کے ساتھ پرورش اور تربیت کی گئی۔

(۴) رس خان (از ۱۵۵۵ء تا ۱۶۲۸ء) یہ دہلی کا ایک پٹھان تھا ہندی زبان میں اس کی شاعری پُرخلوص عباداتی شاعری کی حیثیت سے اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

(۵) شاہ برکت اللہ (از ۱۶۶۰ء تا ۱۷۲۹ء) اس کی پریم پرکاش ہندی شاعری کا لافانی شاہکار ہے۔ برکت اللہ کی شاعری میں گیت کے سروں کے ساتھ فلسفیانہ افکار کا ایسا حسین امتزاج ہوتا ہے کہ ان کے پڑھنے سے غیر معمولی سرور بھی حاصل ہوتا ہے اور بیساختہ زبان سے واہ بھی نکلتی ہے ذیل کے شعر میں دیکھئے اس نے ایک نہایت ٹھوس حقیقت کو کس سحر طرازی کے ساتھ لطیف و شیریں پیرایہ شعر میں بیان کیا ہے۔

तुम सूरज हम दीप निस, अज गत कहै सुनाये ।
बिन दरसै नहीं रह सकै, देखै रहो न जाय ॥

(۶) شیخ رنگریزن (۱۶۰۰ء) یہ ایک مسلمان خاتون تھی جو شگفتگی اور زندہ دلی کو ہندی شاعری میں اس طرح جمع کر دیتی ہے۔

कनक छुरी सी कामिनी, काहे पर काहे छीन ।
कटि को कंचन काटि बिधि कुचन पर धर दीन ॥

اس مختصر روداد سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہندی شاعری پر مسلمانوں کا احسان بہت بڑا ہے اور ان مسلمان اربابِ قلم کے ہندی زبان کے جتنے کارنامے سامنے آتے رہیں گے اسی قدر مستقبل میں ان کی عظمت کا اعتراف اور زیادہ کیا جائے گا۔ (س)

باب التقریظ والانتقاد

بیان اللسان

از

(مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری لکچرر عربی مدرسہ عالیہ کلکتہ)

بیان اللسان یعنی عربی اردو ڈکشنری مؤلفہ جناب قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی کتابت وطباعت لیتھو قسم متوسط چھوٹی تقطیع عام ڈکشنری سائز۔ ضخامت نو سو صفحات قیمت مجلد گرد پوش آٹھ روپیے ملنے کا پتہ :- مکتبہ علمیہ قاضی واڑہ میرٹھ (۲) مکتبہ برہان جامع مسجد دہلی

تعلیمی مشغلہ کے سلسلہ میں میں نے خود بھی عربی اردو ڈکشنری کی ضرورت محسوس کی اور اور بعض احباب نے بھی مجھ سے اکثر عربی، اردو ڈکشنری کا مطالبہ کیا اور طالب علم تو ہمیشہ یہی خواہش کرتے کہ ان کو کسی مستند مفید ڈکشنری کا نام بتلا دوں جس سے وہ استفادہ کر سکیں، خصوصاً عربی جرائد ومجلات کے مطالعہ کرنے والے اور شائقین ترجمہ قرآن تو انتہائی سرگرداں تھے۔ ان میں سے انگریزی داں تو اپنی ضرورتیں اس طرح پوری کر لیتے تھے کہ پہلے انگریزی عربی ڈکشنری کا مطالعہ کیا اور پھر انگریزی اردو ڈکشنری سے اردو لفظ معلوم کر لیا مجھے بھی ایک مرتبہ ترجمہ کے سلسلہ سے یہی کام کرنا پڑا اور اس وقت محسوس ہوا کہ یہ طریقہ بھی باوجود طول عمل کے خاطر خواہ فائدہ مند نہیں ہے۔

بیان اللسان کے ذریعہ سے یہ مفید اور اہم خدمت انجام پاگئی ہے یہ جدید طرز پر المنجد کے سائز میں عربی الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور طالب علموں کے لئے خاص طور پر بہترین رفیق ہے اس ڈکشنری میں لغات قرآنیہ کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ جدید استعمال

کے معنی بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے شروع میں قواعد کا جو حصہ ہے وہ بھی بہت اہم اور مفید ہے عربی قواعد اختصار کے ساتھ شگفتہ زبان میں بیان کئے گئے ہیں ان قواعد سے جہاں لغت دیکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے وہاں خود عربی قواعد سے واقفیت بھی ترجمہ قرآن پڑھنے والوں کے لئے ایک نعمت ہے اور ان کو بہت سی لغزشوں سے بچانے والی بھی، مگر ان قواعد سے خود فاضل مصنف نے کم فائدہ حاصل کیا ہے ورنہ اس ضخامت میں اس سے زائد ذخیرہ جمع کیا جا سکتا تھا، مثال کے طور پر (باب الالف) میں باب افعال سے آنے والے مصادر بیان کئے ہیں جو مجرد میں بھی مذکور ہیں، بعض مصادر ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے معنے افعال میں تبدیل ہو جاتے ہیں ان کے وہ معنی بھی مجرد کی بحث میں ہونے چاہئیں تاکہ باحث کو تمام معنی ایک جگہ پر مل سکیں، اسی طرح افتعال، استفعال وغیرہ ابواب کا ذکر بھی دو دو جگہ طوالت سے خالی نہیں اور اس سے بڑھ کر تکرار الفاظ نے کتاب کو اور بھی ضخیم بنا دیا ہے جیسے دانیل ص۲۳۹ میں ایک ہی سطر کے بعد مکرر لکھا گیا ہے اور اسی صفحہ پر اُدُد بھی مکرر ہے پھر صرف تذکیر و تانیث کی وجہ سے الفاظ کو مکرر لکھا گیا ہے حالانکہ ایک ہی جگہ مذکر و مؤنث کو جمع کیا جا سکتا ہے یا ایک کو بیان کرنے کے بعد اس کا مؤنث بیان کیا جا سکتا ہے دالی، دالیۃ - دانی، دانیۃ - اسی قسم کے تکرار میں ہیں (ص۲۳۳) مفرد و جمع ہونے کے اعتبار سے بھی کتاب میں متعدد جگہ تکرار دیکھنے میں آتی ہے المداخل اور المدخل کو ایک ہی جگہ جمع کیا جا سکتا تھا

بعض الفاظ کی جمع کا ذکر نہیں حالانکہ اس کی جمع قرآن میں مذکور ہے اور مبتدئین کے لئے اس کا ذکر از حد ضروری ہے جبکہ دوسرے بعض الفاظ کی جمع اور مفرد دو جگہ ذکر کئے گئے ہیں مثلاً لفظ مولیٰ کہ اس کی جمع موالی کو ضرور ذکر کرنا چاہیے تھا اسی طرح ابابیل کا مفرد بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ اکثر محققین نے اس کو جمع لا واحد لہ" میں شمار کیا ہے "لغات القرآن" (مطبوعہ ندوۃ المصنفین) جس سے غالباً مصنف نے مفرد نقل کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"اخفش و فراء کے نزدیک جمع بلا مفرد ہے ابو جعفر رودی کے نزدیک ابالہ واحد ہے کسائی

[illegible] واحد ہے، فراء کے نزدیک اگر کوئی فناشیر اور دنیار کی طرح ایاک کہے تو درست ہو سکتا ہے"
اس میں اول تو اختلاف ہے یہاں تک کہ مختلف اوزان کو پیش نظر رکھتے ہوئے مفرد بیان کیا گیا ہے پھر فراء کے الفاظ تو دیکھئے کہ اگر کوئی کہے یعنی یہ وزن نہیں سنا گیا صرف اگر کوئی کہے تو ہو سکتا ہے۔

بعض الفاظ کے معنی کچھ عجیب طرح سے مختلف جگہوں میں ذکر کئے گئے ہیں کہ باحث یا مترجم ان کو آسانی سے نہیں پا سکتا، لفظ حدث "کے معنی صفحہ ۱۸۹ اور صفحہ ۱۹۰ کے تین کالموں میں چار مختلف جگہوں میں دوسرے مادوں کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں پھر بھی اس کے اکثر تو کیا چند معانی بھی جمع نہیں ہو سکے اور اسی لفظ کا ذکر صفحہ ۱۲ میں ہے احادیث۔ کہانیاں۔ باتیں و: حدیث جس احادیث کے معنی کہانیاں ہیں اس کا واحد احدوثہ ہے نہ کہ حدیث (المنجد صفحہ ۱۱۱) جیسا کہ خود مصنف نے صفحہ ۱۵ میں احدوثہ کے معنی بیان کیے ہیں اور اسی صفحہ پر احداث کو بھی ذکر کیا ہے اس کے بعد ہی مادہ صفحہ ۳۱ صفحہ ۱۰۳ صفحہ ۱۰۱ میں مذکور ہے اسی طرح اکثر مادے مختلف جگہوں میں مذکور ہیں اس سے صرف مبتدیوں کو آسانی ہو سکتی ہے جو عربی قواعد سے بالکل ہی نابلد ہوں۔

جدید الفاظ یا جدید استعمال اس موضوع پر ہندوستان کے علماء نے مختلف رسالے اور کتابچے تحریر کیے ہیں اور سب سے زیادہ مفید اور مستند مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی تصنیف "لغات جدیدہ" ہے اس میں انھوں نے لفظ کی تحقیق بھی کی ہے کہ کس زبان کا اصل لفظ ہے اور اسے کس تغییر سے معرب کیا گیا ہے "بیان اللسان" میں بھی فاضل مؤلف نے جدید الفاظ یا جدید استعمال کے ذکر کو نمایاں طور پر علامت (د) سے ذکر کیا ہے اس جگہ دو مختلف موضوع ہیں جن کے ملانے سے غلط مبحث ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے دونوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کرنا ضروری ہے۔

جدید الفاظ کو عربی ڈکشنری میں شامل کرنے سے پہلے ایک معیار قائم کرنا ہوگا کہ کس جماعت یا فرد کے استعمال سے اس لفظ کو عربی کہا جائے گا ظاہر ہے کہ اس کا معیار عرب ہی ہو سکتے ہیں اگر کوئی ہندی یا فارسی چند روز یا چند ماہ تک اور مصر میں رہ کر کسی عجمی لفظ کو عربی جملوں میں استعمال کرے

تو وہ لفظ عربی نہیں ہو سکتا اسی طرح ردی کے بجائے بکنے والے اخبار و رسائل اگر اس قسم کی حرکت کریں تو اس لفظ کو کبھی بھی عربیت میں قدم رکھنے کا شرف حاصل نہ ہوگا اس موضوع پر واقعات اور امثلہ اگر ذکر کئے جائیں تو دفتر کے دفتر تحریر ہو سکتے ہیں ان الفاظ کو تو دخیل ہونے کا مرتبہ بھی نہ دینا چاہئے چہ جائیکہ ان کو جدید الفاظ کا لقب دیا جائے ہاں الفاظ کی وہ فہرست جو اہل مصر اور شرفار کا استعمال کرتے ہیں اگر ڈکشنری میں شامل کئے جائیں تو اس لفظ کی اصلیت کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے جیسے فارسی کے لئے (ف)، وغیرہ

جدید استعمال میں بھی اوپر کا معیار باقی رکھنا ضروری ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر کس ونا کس جس کا عربیت سے ذرا سا بھی تعلق ہے یا ایک مرتبہ وہ حجاز و مصر کو دیکھ چکا ہے اپنے کو جدید استعمال کا ماہر سمجھتا ہے خاص طور پر مترجمین تو نئی نئی اصطلاحیں روزانہ پیدا کرتے رہتے ہیں اور یہ اصطلاحیں یا تراجم ان الفاظ کے لئے ہیں جن کے لئے عربیت میں پہلے سے الفاظ موجود ہیں۔ مواعید (ص۵۵) ٹائم ٹیبل (د) مواعید تو میعاد کی جمع ہے جس کے معنی خود فاضل مصنف نے ص۵۵ میں میعاد۔ وعدہ کی جگہ۔ وعدہ کی مدت (وعدہ) بیان کئے ہیں ٹائم ٹیبل کے لئے جدول الاوقات استعمال ہوتا ہے یا پھر برنامج برامج مستعمل ہے لفظ مواعید تنہا ٹائم ٹیبل کے معنی نہیں ادا کرتا بلکہ مواعید وصول القطارات کا لفظ اپنے لغوی قدیم معنی کے اعتبار سے ٹائم ٹیبل کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

میزان الحر والبرد تھرمامیٹر ص۵۵ یہ کسی مترجم صاحب کی جدت ہے ورنہ تھرمامیٹر کے لئے مقیاس الحرارت صحیح لفظ ہے ھ۔ع۔ ایم۔اے (د) ص۵۵ یہ کسی ایجیٹ ریٹرنڈ کی تحقیق ہے اور اس سے وہ خود کو عربی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ورنہ ایم۔اے کو م۔ا سے تعبیر کیا جاتا ہے صرف وہ اے۔ع بن سکتا ہے جو کسی ع سے شروع ہونے والے عربی لفظ کے شروع میں استعمال کیا گیا ہو اور ایم۔اے کا اے تو ART آرٹ کا اے ہے جس کو عربی حروف میں آست یا زائد سے زائد آرط کہا جا سکتا ہے اور عارط کبھی نہیں ہو سکتا ہے پھر م۔ع کیسے ہوگا۔

مواصلہ (د) ذرائع آمد و رفت صنکے یہ لفظ اس معنی میں مفرد استعمال نہیں ہوتا بلکہ مواصلات ذرائع آمد و رفت کے لئے صرف جمع ہی کی صورت میں مستعمل ہے اور مینا الجوی فضائی عربی سے زیادہ ہندی ہے عربی میں المینا الجوی ہے اور ہو سکتا ہے یا پھر میناجوی صفت موصوف میں تعریف و تنکیر کا قلم ہندیت کی پیداوار ہے عربی فضا اس کے لئے موزوں نہیں۔

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے الفاظ (جو ڈکشنری میں بھی درج ہیں) ہمارے ان احباب کی ایجاد (وضع) ہے جنہوں نے عربی ممالک میں زبان کا لغوی اعتبار سے مطالعہ نہیں کیا یا جن کی ادبی اور علمی مجلسوں سے دور رہ کر بازاری زبان کو بھی صحیح طور پر سمجھتے ہوئے ضرورت کے وقت خود اجتہاد فرمایا ہے اسی طرح جزیرہ عرب کے ساحلی باشندے جو اکثر ہندی فارسی وغیرہ ہیں اختلاط کی وجہ سے دوسری زبانوں کے الفاظ اپنی گفتگو میں شامل کرتے رہتے ہیں میں نے خود بصرہ کے بازاروں میں عرب نمایندوں کو ملی جلی عربی اردو یا خالص اردو بولتے ہوئے دیکھا ہے اگر ایسے اشخاص کی زبان اور استعمال جدید لفظ یا جدید استعمال ہو سکتے ہیں تو پھر آپ کو اردو فارسی کے تمام الفاظ ڈکشنری میں جمع کرنے ہوں گے بصرہ ہی کے ایک ہوٹل میں کھانے کا اتفاق ہوا تو اس کو میں نے چاول کے لئے ارز۔ رز وغیرہ الفاظ استعمال کیے لیکن وہ سمجھنے سے قاصر رہا یہاں تک کہ غصہ میں میں نے کہا ما تفھم! بھات" اور وہ فوراً چاول لے آیا۔ عدن، حضرموت کے باشندوں کو کوڑا کرکٹ "کچرا" کو کشرا" اور کھچڑی کو کشری" کہتے ہوئے پایا۔ مکہ کے اکثر باشندے پلاؤ" کو بریانی" کہتے ہیں بہرحال اس طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ڈکشنری میں ایسے الفاظ جمع کرنا مناسب نہیں جو عربی نہ ہوں یا ان کو ادبی اور علمی مجلسوں میں استعمال نہیں کیا جاتا ورنہ مطالعہ کرنے والے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے کہ یہ لفظ عربی الاصل ہے اور اگر استعمال کئے جائیں تو ان کے وطن کی طرف اشارہ ضروری ہو۔

فاضل مصنف نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ جہاں صلہ کی وجہ سے معنی بدل جاتے ہیں وہاں صلہ کے ساتھ معنی لکھے گئے ہیں یہ درست ہے عربیت میں واقعی صلہ سے معنی میں بہت بڑی

تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ موصوف نے بہت سے الفاظ کے معانی جو صلہ کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں صلہ بغیر صلہ بیان کئے ہوتے جمع کر دیتے ہیں مثال کے لئے ملاحظہ ہو "سعی" ص۳۳۶

"بیان اللسان" کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ اس کے مؤلف ایک نوجوان شخصیت ہیں اگرچہ ان کے احباب کا بیان ہے کہ یہ خیال زیادہ صحیح نہیں ہیں تاہم اس غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے لئے کتاب میں جنسی اور جذباتی معنی کی فراوانی کافی ہے، قاضی صاحب نے کہیں بھی جذباتی معنی سے درگذر نہیں کیا اور لفظ کے دوسرے غیر جذباتی معنی نظر انداز کر گئے جبکہ جذباتی معنی سے مختلف لغویین اور مصنفین چشم پوشی کر جاتے ہیں ممکن ہے قاضی صاحب اپنی تالیف نوجوان طبقے میں مقبول بنانا چاہتے ہوں ملاحظہ ہو قعو ص۶۲۷ جس کے معنی المنجد نے یوں بیان کئے ہیں قعی یقعی قعا : اشرفت ارسنیۃ انفہ فمالت نحو القصبۃ (القعو) ص۶۵۲

ترجمہ کرنا: تالیف و تحریر کے سلسلہ میں سب سے زیادہ مشکل اور اہم کام ترجمہ کا ہے بعض سطحی نظر والے یہ سمجھتے ہیں کہ ترجمہ کرنا کوئی مشکل بات نہیں دوسرے کے تیار شدہ مضمون کو نقل کرنا ہے ترجمہ کی دقتیں وہی خوب سمجھ سکتے ہیں جن کو اس سے سابقہ پڑا ہو پھر لغت کا ترجمہ کرنا یا معنی بیان کرنا تو صرف معلمین ادب ہی کا کام ہے ایک لفظ کے مساوی معنی دوسری لغت میں شاذونادر ہی ملتے ہیں اسی لئے مترجمین لغت ایک لفظ کے چند معنی لکھتے ہیں جن کا مجموعہ اس لفظ کا مفہوم ہوتا ہے عربی زبان میں تو ایک ہی لفظ مختلف ابواب سے مختلف صلوں کے ساتھ اتنے معنی میں مستعمل ہوتا ہے کہ "المنجد" جیسی لغت کی کتابوں میں کئی کئی کالم صرف ہو جاتے ہیں بہرحال فاضل مؤلف نے اس اہم اور عظیم الشان کام کو جس محنت اور جانفشانی سے انجام دیا ہے اور اس کی ترتیب و تالیف میں ان کو جو دشواریاں پیش آئی ہوں گی ان کا خیال کرتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ کتاب سی تقریظ و تبصرہ کی محتاج نہیں اللہ تعالٰی نے ان کو تا ابد صدقہ جاریہ کا ثواب بخشتا رہے گا۔ میری اس دعا میں اس کتاب سے فائدہ حاصل کرنے والے جو بے شمار ہوں گے، دل سے شریک ہوں گے آمین

ادبیات

غزل

(جناب اَلَم مظفر نگری)

اردو سبھا دہلی کے زیر اہتمام ۱۹/۲۰ اگست کو یوم آزادی کی تقریب پر جو مشاعرہ لال قلعہ میں منعقد ہوا تھا اَلَم صاحب نے یہ غزل اس میں پڑھی تھی۔

بلائے جاں تھا مرا نالۂ رسا کہ نہیں
ہوا سے ٹوٹ گیا دل کا آبلا کہ نہیں

گرا نہ دامن نرگس سے آنسوؤں کو مرے
بہار گل سے ہے شبنم کا واسطا کہ نہیں

عروج زندگی عجز و انکسار نہ پوچھ
میں خاک ہو کے دو عالم پہ چھا گیا کہ نہیں

تعینات کے پردوں سے آ رہے ہو نظر
ہر اک حجاب نظر سے اٹھا دیا کہ نہیں

حرم میں دیر میں ڈھونڈا کیا جسے برسوں
حریم گوشۂ دل میں تجھے ملا کہ نہیں

لحد کو آخری منزل سمجھ کے آیا ہوں
یہاں تو ٹھہرے گی عمر گریز پا کہ نہیں

اٹھنے ہی کو تھا میں پردۂ مجاز مگر
کسی نے چپکے سے دل میں یہ کہہ دیا کہ نہیں

اسے خبر ہے جو ہر راہ میں ہی سجدہ گزار
جبیں نواز ہے ہر اک کا نقش پا کہ نہیں

کسی نظر سے بھی ان کی نہ کر سکا معلوم
ہوا ہے طے ابھی دل کا معاملا کہ نہیں

گریز اور تری مصلحت سے ناممکن
تو ہی بتا کہ میں مانگوں کوئی دعا کہ نہیں

سمجھ رہے تھے تم آساں رہِ وفا کو اَلَم
ہے ذرہ ذرہ یہاں ہمت آزما کہ نہیں

REGISTERED No. D 148.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسن خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبہ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین۔ جو حضرات پچیس روپے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہوں گے ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضے کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ احباء۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احباء میں ہوگا: ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ر تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہیئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ بہر حال ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک)، فی پرچہ دس آنے۔

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر رسالہ برہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب
سعید احمد اکبر آبادی

ندوۃ المصنفین دہلی کی مذہبی اور تاریخی مطبوعات

ذیل میں ندوۃ المصنفین دہلی کی چند اہم دینی، اصلاحی اور تاریخی کتابوں کی فہرست درج کیجاتی ہے
مفصل فہرست جس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی دفتر سے طلب فرمائیے۔

اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ جدید ایڈیشن جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں۔ قیمت ستے، مجلد للعہ

سلسلہ تاریخ ملت۔ مختصر وقت میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ سلسلہ نہایت مفید ہے۔ اسلامی تاریخ کے یہ حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع بھی۔ انداز بیان نکھرا ہوا اور شگفتہ

نبی عربی صلعم تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دلنشیں انداز میں یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ مجلد عم

خلافت راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ) عہد خلفائے راشدین کے حالات و واقعات کا دل پذیر بیان۔ قیمت ۱۲ مجلد ۱۲

خلافت بنی امیہ (تاریخ ملت کا تیسرا حصہ) قیمت ۱۲ مجلد ۱۲

خلافت ہسپانیہ (تاریخ ملت کا چوتھا حصہ) قیمت عہ مجلد عہ

خلافت عباسیہ۔ جلد اول (تاریخ ملت کا پانچواں حصہ) قیمت ۱۲ مجلد للعہ

[خ]لافت عباسیہ۔ جلد دوم (تاریخ ملت کا [چھ]ٹا حصہ) قیمت للعہ مجلد عہ

خلافت مصر تاریخ ملت کا ساتواں حصہ جس میں سلاطین مصر کی مکمل تاریخ صفحات ۴۰۰ قیمت مجلد ۴ بلا جلد

فہم قرآن۔ جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت ۲ مجلد ۳

غلامان اسلام اسی سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان۔ جدید ایڈیشن قیمت عہ مجلد ۶

اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دل نشیں اور سہل کیا گیا ہے۔
قیمت ۶ مجلد عہ

قصص القرآن جلد اول تیسرا ایڈیشن حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے حالات و واقعات تک۔ قیمت عہ مجلد عہ

قصص القرآن جلد دوم۔ حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ کے حالات تک تیسرا ایڈیشن۔
قیمت ۳ مجلد للعہ

قصص القرآن۔ جلد سوم۔ انبیا علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان
قیمت عہ مجلد عہ

برہان

جلد بست و پنجم — شمارہ (۴)

اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء مطابق ذی الحجہ و محرم الحرام سنہ ۱۳۶۹-۷۰ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اللہ اکبر! کیسا انقلاب سا انقلاب ہے۔ کچھ زیادہ نہیں اب سے تین چار برس پہلے عید بقرعید آتی تھی تو ہفتوں پہلے سے گھر گھر میں اس کی خوشیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ بڑے چاؤ چوچلے سے اس کی تیاریاں کی جاتی تھیں۔ بچے اور بچیاں، مرد اور عورت، بوڑھے اور جوان سب مل کر اپنی اپنی حیثیت اور بساط کے مطابق عید منانے اور اس کی خوشی رچانے کا اہتمام و انتظام کرتے تھے۔ لیکن ایک آج کا دن ہے کہ بقرعید قریب آئی اور مسلمانوں پر سہم چڑھنا شروع ہوا۔ ننھے ننھے بچے اور بچیاں تو شاید اب بھی اسی طرح دل سے عید کا استقبال کرتے ہوں کیونکہ ان غنچہ ہائے نو شگفتہ کو اس کا کیا احساس کہ انھوں نے جس چمن میں آنکھ کھولی ہے اب اس کی آب و ہوا بدل چکی اور جس ماحول میں قدرت نے انھیں پیدا کیا ہے اب اس کے زمین و آسمان کا وہ پہلا سا رنگ باقی نہیں رہا۔ لیکن بہر حال بوڑھے اور جوان مردوں اور عورتوں کا عالم یہ ہوتا ہے کہ بقرعید کا چاند نظر آنے کے بعد سے ہی ان کے دلوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور وہ بارگاہ ایزدی میں قلب و روح کی پوری نیاز مندیوں کے ساتھ دعائیں کرتے ہیں کہ "الٰہی جان و مال کی خیر رہے عزت و آبرو پر آنچ نہ آئے اور یہ مقدس تہوار خیریت و عافیت کے ساتھ بیت جائے"۔ کروڑوں مسلمانوں نے ہر سال کم از کم ایک مرتبہ چاند دیکھ کر رویت ہلال کی مشہور دعا "اللھم اھلہ علینا بالامن والایمان والسلامۃ والاسلام" بیسیوں بار پڑھی ہوگی مگر انھیں یہ آج ہی معلوم ہوا ہوگا کہ پیغمبر صادق و مصدوق نے جو "امن" "ایمان" "سلامت" اور "اسلام" ان چار چیزوں کی دعا مانگنے کی تلقین فرمائی تھی تو ان کی زندگی میں کیا اہمیت اور کتنی ضرورت ہے۔ حکومت کی طرف سے پیش بندی کے طور پر جگہ جگہ شہری اور فوجی پولس کے پہرے ہوتے ہیں، ہتھیار بند گارد پیدل اور سوار گشت کرتی رہتی ہے لیکن حفاظت و انتظام کے اس ساز و سامان کو دیکھ کر مسلمان کی ضرورت

حمید کے چہرہ پر احساس حزن والم کی ایک اور شکن پڑ جاتی ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ چیزیں تو بدیسی راج کی نشانی ہیں آج جب کہ میرا وطن آزاد ہے تو کیا پھر بھی اس کی ضرورت ہے کہ اپنی جنم بھومی میں اپنا مذہبی تہوار سنگینوں اور بندوقوں کے پہرہ کے بغیر نہ مناؤں، دل کا ہاتف اندر سے کہتا ہے کہ ان پہروں کے بعد بھی تو امن و سلامتی کے ساتھ اپنا تہوار منالے تو نبا غنیمت جان اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر۔

اس نفسیاتی الجھن اور بیم ورجا کی اس جاں گداز کشمکش کا اصل باعث گائے کی قربانی کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ ہمیشہ سے ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں کشیدگی اور کشاکش کا سبب بنا رہا ہے اور اب ملک کی تقسیم جن حالات میں ہوئی ہے ان کی وجہ سے اس کی نزاکت اور بھی بڑھ گئی ہے چونکہ یہ خالص مذہبی معاملہ ہے اس لئے علماء کا فرض تھا کہ تقسیم کے بعد ہی فوراً اس کے متعلق کوئی متفقہ فیصلہ کر کے مسلمانوں کی رہنمائی کرتے تاکہ گومگو کے عالم میں رہنے کے باعث جان و مال کا جو خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے اس سے نجات ملتی اور صورت حال کا کوئی خوشگوار حل نکل سکتا لیکن افسوس کہ علماء نے ایسا نہیں کیا۔ اور اب ایک ایسا مرحلہ آگیا ہے کہ مگر ان کی خموشی کا یہی عالم رہا تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے نتائج کتنے خطرناک اور افسوسناک ہوں گے۔

جہاں تک اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ گائے کی قربانی نہ فرض ہے اور نہ واجب بلکہ مباح ہے۔ جس میں اقدام اور ترک کرنے اور نہ کرنے دونوں کا اختیار ہوتا ہے پھر اس میں شبہ نہیں کہ کبھی خارجی اور سیر دینی حالات کے باعث کسی امر مباح کا کرنا واجب بھی ہو جاتا ہے اور کبھی ممنوع بھی اور ان حالات کی تشخیص و تعیین اگر مسلمانوں کی حکومت ہو تو حکومت کا بمشورۂ علماء ورنہ صرف علماء کا کام ہے مثلاً اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ شادی کرنا اسلام میں مباح ہے لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ایک صحابی کے متعلق معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک کتابیہ عورت سے شادی

کرلی ہے تو آپ نے ان کو بلا کر ڈانٹا اور حکم دیا کہ طلاق دو" جب اس صحابی نے کہا کہ کیا یہ عورت کے ساتھ شادی کرنا جائز تو نہیں ہے" تو شریعت اسلام کے اس سب سے بڑے شناس و حکیم نے فرمایا کہ اگر تم لوگ اسی طرح غیر ملکی عورتوں سے شادی کرنے لگے تو عرب کی ان دوشیزہ لڑکیوں کا کیا حشر ہوگا! اسی کے ساتھ ایک دوسرا واقعہ حضرت عمر ثانی کے عہد کا سنئے ظاہر ہے کہ ختنہ سنت موکدہ اور اسلامی شعار ہے لیکن اس کے باوجود حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مختصر عہد خلافت میں جب اہل ذمہ کثرت سے مسلمان ہونے لگے تو مروانی عمال و حکام جو جزیہ کے لالچ سے اس کو پسند نہیں کرتے تھے انھوں نے شکایت کی کہ یہ لوگ دل سے مسلمان نہیں ہو رہے ہیں اور دلیل یہ ہے کہ یہ زبان سے اسلام کا کلمہ پڑھتے ہیں مگر ختنہ نہیں کراتے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا" یہ ابھی نئے نئے مسلمان ہیں جب اسلام ان کے دلوں میں رچ بس جائے گا تو یہ خود ختنہ کرائیں گے یہ دو واقعات یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ صرف مباح کا اخذ یا ترک ہی کبھی واجب یا ممنوع نہیں ہوتا بلکہ کسی اسلامی شعار کو بھی کسی خارجی اور وقتی مصلحت کی بنا پر ہنگامی اور عارضی طور پر نظر انداز کیا جا سکتا ہے حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں خصوصاً اور دوسرے خلفاء کے دور میں عموماً اس قسم کے اجتہادات کی مثالیں کثرت سے ملیں گی لیکن اس موقع پر ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔"

اب موجودہ حالات میں گائے کی قربانی کے مسئلہ پر غور کیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ اگرچہ اصل مسئلہ کی حیثیت سے گائے کی قربانی مباح ہے لیکن یہاں حالات اس قسم کے ہیں جن کے پیش نظر اس کو واجب بھی کہا جا سکتا ہے اور بالکل نہیں تو کم از کم چند برسوں کے لئے شرعاً اسے ممنوع بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں ہم دونوں قسم کے حالات کی تفصیل بیان کرتے ہیں تاکہ مسئلہ کا ہر پہلو روشن ہو سکے اور وسعت نظر کے ساتھ اس پر غور کیا جا سکے۔

پہلی قسم کے حالات و اسباب جو قربانی گاؤ کو واجب قرار دینے کا مطالبہ کر سکتے ہیں یہ ہیں کہ

بھارت کی حکومت ایک سیکولر گورنمنٹ ہے اس کے آئین و دستور کی رو سے اس ملک کے مسلمان بھی یہاں کے ایسے ہی شہری ہیں جیسے کہ ہندو اور اس بنا پر بھارت کا دستور مسلمانوں کے شہری حقوق جن میں ان کے مذہبی اور تمدنی واجبات و مطالبات بھی شامل ہیں ان کی مکمل حفاظت و نگہداشت کا اعلان کرتا ہے اور مسلمانوں نے ملک کے اس دستور کے مطابق ہی اس ملک میں وفادار شہری کی حیثیت سے رہنے کا عہد کیا ہے پس اگر کوئی مقامی حکومت یا کسی جگہ کے عمال و حکام مسلمانوں کو قربانی گاؤ سے جبراً روکتے ہیں تو اگرچہ یہ قربانی اصلاً مباح تھی اور اس بنا پر مسلمانوں کو خود یہ حق حاصل تھا کہ وہ چاہتے تو اس کو ترک کر دیتے لیکن اب جب کہ ملک کے آئین و دستور کے خلاف ان کو جبراً اس سے روکا جاتا ہے تو یہ ان کے شہری حقوق میں مداخلت ہے اور آگے چل کر مداخلت فی الدین کی شکل بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ مداخلت فی الدین کا مقابلہ کریں اور جو چیز ان سے جبراً ترک کرائی جاتی ہے اس کو عمل میں لاکر مستقبل میں اس نوع کی مداخلت کا سدباب کریں یہاں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ اس مداخلت کی مقاومت مبنی اس پر ہی ہے کہ ملک کا قانون ان کو ملک کا شہری تسلیم کرتا اور ان کو مذہبی معاملات میں مکمل آزادی دیتا ہے ورنہ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو معاملہ اور مسئلہ کی نوعیت بھی مختلف ہوتی مسلمان کسی حالت میں غدر اور فریب دینے کا مجاز نہیں ہے اگر قانون یہ ہوتا کہ اس ملک میں قربانی نہیں ہو سکتی تو پھر مسلمانوں کو حق تھا کہ وہ اگر اس کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں اور اگر وہ اس قانون کے باوجود ملک میں رہنا ہی چاہتے ہیں تو انھیں لامحالہ جب تک اس ملک میں رہیں گے اس کے قانون کی پابندی کرنی ہوگی۔ اسلام میں دوستی اور دشمنی بالکل کھلی ہوئی ہے اور معاہدہ کا پابند رہنا ہر حال میں ضروری ہے مسلمان اگر دشمن سے جنگ بھی کرتا ہے تو پیچھے سے آکر نہیں بلکہ سامنے کھڑے ہو کر اور حریف پنجہ فگن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے دست و بازو کی قوت آزماتا ہے پس یہ وجوہ ہیں جو قربانی گاؤ پر اصرار کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور جن کی وجہ سے یہ قربانی اب مباح نہیں بلکہ واجب ہو جاتی ہے۔

اب رہے دوسری قسم کے وجوہ واسباب جن کے پیش نظر اس قربانی کو شرعاً ممنوع ہونا چاہئے وہ یہ ہیں کہ ایک طرف قربانی گاؤ صرف مباح ہے نہ فرض ہے اور نہ واجب اور عرب میں تو عموماً اور حجاز میں خصوصاً اس کا رواج بھی بہت کم ہے اور دوسری جانب صورت حال یہ ہے کہ گائے ہندوؤں کے ہاں مقدس سمجھی جاتی ہے جن پر اس ملک کی عظیم اکثریت شامل ہے اگرچہ ملک کا دستور اس جانور کی قربانی پر کوئی روک ٹوک نہیں کرتا لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب تک ہندو اور مسلمان خلوص دل کی صفائی کے ساتھ مل جل کر نہیں رہیں گے اس وقت تک محض ملک کے قانون کی دفعات کے سہارے مسلمان امن اور عافیت کی زندگی بسر نہیں کر سکتے عام حالات میں بھی ذبح بقر سے برادران وطن کی دل آزاری ہوتی اور اب تو ملک کی تقسیم جس منافرت اور عداوت پر ہوئی ہے اس کی وجہ سے دل آزاری انتہائی اشتعال اور غضب کا باعث بن سکتی ہے اور بن رہی ہے جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ بعض مقامات پر ایک گائے کے ساتھ کئی کئی مسلمانوں کی قربانی ہو جاتی ہے اور ان کو سخت نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے قانون اپنی جگہ پر کتنا ہی اچھا اور اس کی قوتِ نفاذ بھی کتنی ہی مضبوط ہو لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان ہندوؤں کے ساتھ خوشگوار تعلقات پیدا کئے بغیر امن اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے ہیں! پس اگر مسلمانوں کا ایک امر مباح کو قطعاً ترک کر دینے کا عزم ان کے لئے یہ خوشگوار فضا پیدا کر سکتا یا اس کے پیدا کرنے میں کسی معقول حد تک ممد و معاون ہو سکتا ہے تو بے شبہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ مباح کی ایک جانب ترک کو ایک عظیم ترین منفعت کے خیال سے ترجیح دے کر اس کو اپنے لئے ممنوع کر لیں۔ محض ایک امر مباح پر اصرار کرنا اور نتائج کا لحاظ نہ کرنا اس کی وجہ سے شدید ترین جانی و مالی نقصانات پہنچتے ہوں یا ان کے پہنچنے کا امکان غالب ہو اسلامی تعلیمات کی رو سے نہ صرف غیر مستحسن بلکہ ایک قسم کی خودکشی ہے جو اسلام میں قطعاً حرام ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے بعض دوستوں نے لکھا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ذبح بقر کو شعائر اسلامی میں شمار کیا ہے ہمیں اس سے انکار نہیں کہ حضرت مجدد نے ایسا لکھا ہے لیکن

حضرت مجدد کے زمانہ میں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اور چونکہ اکبر نے ہندو مذہب کے
زیر اثر آجانے کے باعث گاؤکشی کو بالکل ممنوع قرار دے دیا تھا اس بنا پر حضرت مجدد نے "گربہ
کشتن بروز اول" کے مطابق اس کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ بادشاہ نے
جس رنگ میں ڈوب کر یہ اعلان کیا ہے اگر اس کو ختم نہیں کرایا گیا تو لازمی طور پر اس کا اثر یہ ہوگا کہ
پھر اسلام کے شعائر حقیقی کی بھی خیر نہ ہوگی اور مسلمان اقتدار اعلیٰ کے مالک تھے اس لیے حضرت
مجدد کو اس کا بھی اندیشہ نہیں تھا کہ گاؤکشی کی تجدید سے کسی مسلمان کی جان و مال یا اس کی عزت و
آبرو پر کوئی حرف آئے گا۔ آج کے حالات اس زمانہ کے حالات کا بالکل عکس ہیں اس بنا پر آج کو
کل پر قیاس کر کے کسی مسئلہ کا فیصلہ کرنا عالمانہ وسعتِ نظر کے یکسر منافی ہے علاوہ بریں جو حضرات
اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانی کا نام لیتے ہیں انھیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں مغلیہ
سلطنت کے بانی بادشاہ بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کے نام جو وصیت نامہ لکھا ہے (اس وصیت نامہ
کی نقل بھوپال کی اسٹیٹ لائبریری میں محفوظ ہے) اس میں جہاں اور باتیں لکھی ہیں یہ بھی تحریر ہے کہ
"تمہیں گاؤکشی سے پرہیز کرنا چاہیے تاکہ اس کے ذریعہ تم کو لوگوں کے دل میں مقبولیت حاصل ہو اور
اور اس طرح وہ تمہارے احسان مند و شکر گزار ہو کر تمہاری اطاعت کریں" یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ بابر
صرف ایک بہادر جرنیل اور سیاسی مدبر ہی نہیں تھا بلکہ بڑا خدا پرست اور شعائر اسلام کا احترام و
ادب کرنے والا بھی تھا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ خود عالم تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس نے حنفی فقہ
پر ایک کتاب مرتب کی تھی جس کی شرح اس عہد کے مشہور عالم شیخ زینی نے لکھی تھی جنہوں نے
تزک بابری کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا علاوہ بریں بابر چونکہ علماء و فضلاء کا بڑا قدردان تھا
اس لئے ان حضرات کا اس کی مجلسوں میں جمگھٹا لگا رہتا تھا اس بنا پر یہ ظاہر ہے کہ اگر بابر کو یہ علم
ہوتا کہ گاؤکشی ہندوستان میں اسلامی شعار کی حیثیت اختیار کر گئی ہے تو ناممکن تھا کہ وہ ہمایوں کو
اس کے بند کر دینے کی ہدایت کرتا۔ اب ایک طرف بابر کی وصیت اور دوسری جانب حضرت مجدد
کا ارشاد ان دونوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ گاؤکشی بذات خود اسلام میں

مقصود نہیں ہے اور ہندوستان ایسے ملک میں اس کا اجراء اس پر موقوف ہے کہ اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا ہے یا نقصان؟ بابر کی حکومت نئی نئی قائم ہوئی تھی اور وہ بھی وادیِ پنجاب سے کرنے کے بعد اس کو اپنی حکومت مضبوط کرنے کے لئے ہندوؤں کا اعتماد حاصل کرنا تھا اس بنا پر اس نے گاؤکشی کو بند کرنے کی وصیت کی لیکن اس کے برخلاف اکبری حکومت پر ہندو رنگ غالب آجانے کے باعث بادشاہ کا گاؤکشی کو ممنوع قرار دے دینا مسلمانوں کی ملی عظمت کو زک پہنچانا تھا اس لئے حضرت مجدد نے اس کو شعارِ ملی قرار دے دیا۔

اس سلسلہ میں ہمارے بعض علماء کبھی کبھی دبی زبان سے کہتے ہیں کہ جس علاقہ میں حالات سازگار نہ ہوں وہاں کے مسلمانوں کو قربانی گاؤ نہیں کرنی چاہئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ سرتاسر غلط اور مسلمانوں کے لئے شدید مضر ہے کیونکہ اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کو ان کی دلجوئی منظور نہیں ہے چنانچہ جس علاقہ میں وہ طاقتور ہیں وہاں کھلم کھلا قربانی گاؤ کرتے ہی ہیں کسی علاقہ میں اگر انھوں نے نہیں کی تو محض ڈر کے مارے نہیں کی نہ کہ ہندوؤں کے پاس خاطر سے اور دوسری جانب اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ کمزور علاقہ کے مسلمان اپنی بے بسی اور بے کسی کا احساس کرکے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو ان کے قومی نشو و نما کے لئے زہر ہلاہل سے کم نہیں اس بنا پر ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کو کسی خاص صوبہ، ضلع یا شہر کی بنیاد پر نہیں۔ بلکہ بھارت کے سب مسلمانوں کے اجتماعی مسئلہ کی حیثیت سے طے کیا جائے اور سب کے لئے ایک ہی حکم کا اعلان کیا جائے۔

سطورِ بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصد صرف مسئلہ کی تنقیح اور اس کے ہر پہلو کو روشن کرنا ہے اور بس! ہمارا منصب فتا کا ہے اور نہ یہ مسئلہ دو یا تین علماء کی رائے سے طے ہو سکتا ہے ضرورت ہے کہ جمعیۃ علماء اس کی طرف اقدام کرے اور غور و فکر کے بعد جو کچھ حق ثابت

نظر آئے اس کو بلا خوف لو مة لائم مسلمانوں کے سامنے ایک شرعی حکم کی حیثیت سے پیش کردے۔ اب وقت اتنا نازک آگیا ہے کہ مزید تردد و تذبذب کی اجازت نہیں دی جاسکتی اس بے یقینی اور گوگو کے باعث سب سے زیادہ خسارہ ان غریب مسلمانوں کو اٹھانا پڑ رہا ہے جو زیادہ قیمت ادا کرکے بکرے وغیرہ کی قربانی نہیں کرسکتے اور چونکہ قربانی ان کے نزدیک اسلام کا ایک اہم رکن ہے اس لئے غریب مجبوراً چھپے چوری گائے کرتے ہیں اور اگر وہ اس کی قربانی مجبوراً نہیں کرسکتے تو ان کا ضمیر انھیں ملامت کرتا ہے کہ ان پر قربانی واجب تھی مگر نہیں کی۔

علمائے کرام کا فرض ہے کہ شرعی احکام و مسائل پر غور کرتے وقت جماعتی نفسیات کے عوامل و محرکات کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھا کریں کہ دراصل قوموں کا بننا اور بگڑنا انھیں عوامل کی رعایت و عدم رعایت پر بڑی حد تک مبنی ہوتا ہے اور اسلام خود ان کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے چنانچہ طواف میں کاندھوں کو ہلا کر چلنے کا حکم اسی طرح کی ایک ضرورت کے پیش نظر دیا گیا تھا۔ حالانکہ ظاہر ہے اکڑ کے چلنا اور وہ بھی خدا کے گھر کی دیوار کے سایہ میں قرآن کے حکم "وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا" ترجمہ:- اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو کی صریح خلاف ورزی ہے

خلافت عباسیہ جلد اوّل

تاریخ ملت کا پانچواں حصہ جس میں نو عباسی خلفاء سفاح، منصور، مہدی، ہادی، ہارون، امین، مامون، معتصم اور واثق باللہ کے سوانح حیات ایک خاص اسلوب سے جمع کئے گئے ہیں خلافت عباسیہ کا یہی جز حقیقت میں دورِ عروج تھا اور اس دور میں عباسی خاندان کی قوت و اقتدار کا رعب تمام ہمسایہ سلطنتوں پر چھایا ہوا تھا کتاب کے اس حصہ میں آپ کو نہ صرف ان عظیم الشان خلافتوں کے جامع و مستند حالات و واقعات ملیں گے بلکہ ہر خلیفہ کے عہد حکومت اور اس کے علمی، مذہبی، تمدنی اور اصلاحی کارناموں پر دلپذیر تبصرہ بھی ملے گا جس سے مسلمانوں کی سب سے بڑی حکومت کے مرکز بغداد کی عظمت کا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے صفحات ۲۴۴ قیمت غیر مجلد تین روپے بارہ آنے مجلد للعہ

تدوین حدیث

محاضرۂ چہارم

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

(۹)

آپس میں لاٹھیاں اور جوتے صرف اس لئے چل رہے تھے کہ رکوع سے سر اُٹھاتے ہوئے ہاتھ بھی تم نے کیوں نہیں اُٹھایا یا امام وَلَا الضَّالِّين پر جب پہنچا تو اس پر نہیں کہ تم نے آمین کیوں نہ کہی کیونکہ آمین تو سب ہی کہتے ہیں، جھگڑا اس پر تھا کہ صرف خدا ہی کو تم نے آمین کا یہ لفظ کیوں سنایا، خدا کے بندے جو تمہارے دائیں بائیں کھڑے تھے ان کو بھی اس لفظ کے سننے کا موقعہ کیوں نہیں دیا مسلمانوں ہی کا ایک گروہ دوسرے گروہ کو مسلمانوں ہی کی مسجدوں سے نکال رہا تھا اس لئے نکال رہا تھا کہ امام نماز میں قرآن کے جس حصہ کو پڑھتا ہے تم نے اسے سنا کیوں؟ بجائے سننے کے تم بھی اسی کے دہرانے میں کیوں مشغول ہو گئے جب امام اپنی طرف سے اور تمہاری طرف سے پڑھ رہا تھا اور بات اسی حد تک ختم ہو جاتی تو سمجھا جا سکتا تھا کہ خیر ایک حد پہ پہنچ کر وہ ختم ہو گئی لیکن قصہ تو یہاں تک دراز ہوا کہ مسلمانوں کی دنیا جن لوگوں نے جبراً ان سے چھینی تھی ان ہی کے سامنے سنجوشی ورضا یہ اپنے دین کو لے کر بھی پہنچے جن کی عدالتوں میں پیٹ کے جھگڑوں کے لے جانے پر تو سمجھا جاتا تھا کہ مسلمان مجبور ہیں ان ہی عدالتوں کے حکام کے پاس وہ اللہ کی کتاب اور جن کتابوں میں ان کے رسول کی حدیثیں تھیں ان سب کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے۔ یہ کہتے ہوئے حاضر ہوئے کہ آپ ہی بتائیے کہ ہم دونوں فریقوں میں ان کتابوں کے رو سے واقعی

مسلمان کون ہے، اور مسلمانوں کی مسجدوں کے استعمال کا قانونی حق کسے حاصل ہے، طیش کی آگ اور غصہ کے شعلوں میں ایمانی غیرت اور اسلامی حمیت کا سارا سرمایہ جل کر بھسم ہو چکا تھا، ان فیصلوں پر خوشی کے شادیانے بجائے جاتے تھے جو اللہ اور رسول کے جھٹلانے والوں کی طرف سے کوئی فریق حاصل کرتا تھا اور ان ہی فیصلوں کی آڑ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے والی امت کی ایک جماعت ان عبادت گاہوں سے دھکیلی جا رہی تھی جو نہ عیسائیوں کے گرجے تھے۔ اور نہ یہودیوں کی سنی گاگ، بلکہ یہ کیسا دلخراش منظر تھا کہ مسلمانوں کی مسجدوں سے مسلمانوں ہی کو نکالا جا رہا تھا اس لئے نکالا جا رہا تھا کہ جو مسلمان نہیں تھے ان ہی حکام سے ان کے نکالنے کا فیصلہ خود مسلمانوں نے مسلمانوں کے لئے حاصل کیا تھا۔

سوال یہی ہے کہ زیادہ دن نہیں آج سے تیس چالیس سال پہلے غیروں کی تالیوں اور اپنوں کی گالیوں کے درمیان رسوائیوں اور برسر بازار فضیحتوں کے مذکورہ بالا قصے جن کی آگ نصف صدی کے قریب قریب ہندوستان کے مختلف گوشوں کے تقریباً ہر اس گھر میں بھڑکی ہوئی تھی جس میں قرآن کی پڑھنے والی اور رسول کو ماننے والی امت آباد تھی یہی میں پوچھتا ہوں کہ ارادی مخالفتوں کی اس آگ کے سلگانے میں کام لینے والوں نے کس چیز سے کام لیا تھا؟ ان اختلافات کے سوا آپ ہی بتائیے اور بھی کوئی چیز تھی جن کا ان حدیثوں کے علم و عدم کی وجہ سے پیدا ہو جانا ایک قدرتی بات تھی جو پیغمبر کی ہی طرف سے عمومی رنگ میں اس لئے نہیں پھیلائی گئی تھیں کہ ان کے مطالبہ اور گرفت میں نرمی اسی تدبیر سے پیدا ہو سکتی تھی اور اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے "فلا تحدثوا عن رسول اللہ شیئاً" (رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو) اس کا مطلب بھی مذکورہ بالا تفصیلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ ارادی مخالفتوں کو پیدا کرنے کے لئے حدیثوں کے بیان کرنے سے وہ منع فرما رہے ہیں ورنہ جیسا کہ گذر چکا روایت حدیث سے ممانعت کی تجویز اگر ہم اس کو قرار دیں گے تو خود ان کے طرز عمل صحابہ کے طرز عمل بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے طرز عمل کے خلاف العیاذ باللہ یہ تجویز ہوگی بلکہ آگے انھوں نے جو یہ فرمایا کہ جب تم سے کوئی بات پوچھے کہ تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے" اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس تجویز کا تعلق ان ہی لوگوں سے ہے جو ادادی مخالفتوں کی آگ بھڑکانے کے لئے حدیثوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتے اور پھیلاتے ہیں انھوں نے اسی لئے قاعدہ ہی بنادیا کہ جب کبھی اختلافی اغراض کے لئے حدیثوں کے متعلق کوئی پوچھ گچھ، کھنچ دکاؤ شروع کرے تو اعلان کردینا چاہئے کہ مسلمانوں کو اتفاقی نقطہ پر سمٹے رہنے کے لئے وہی باتیں کافی ہیں جنہیں "البینات" کی شکل میں قرآن نے محفوظ کردیا ہے، حاصل یہی ہوا کہ قرآن کے "البینات" پر متحد ہوجانے کے بعد ضرورت نہیں ہے کہ غیر مبناتی مسائل میں بھی ایک ہی نقطہ پر مسلمانوں کو جمع کرنے کی فضول کوشش کی جائے کہ اس کوشش سے بجائے ختم ہونے کے اختلاف بڑھے گا۔ بڑھتا ہی چلا جائے گا جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلیں تم سے زیادہ اختلاف میں سخت ہوجائیں گی بہرحال دین کے غیر مبناتی حصے کے متعلق صحیح مسلک یہی ہے اور اسی کو ہونا چاہئے کہ باہم مسلمان اس سلسلہ میں ایک دوسرے کے اختلاف کے برداشت کرنے کی صلاحیت اور گنجائش اپنے اندر پیدا کریں، قرآن کے قرآنی اختلاف کو ذریعہ بناکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں اسی گنجائش کے پیدا کرنے کی مشق صحابہ سے کرائی اور ابوبکر صدیقؓ نے اپنی مذکورہ بالا تجویز کو پیش کرتے ہوئے میرا خیال یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی مبارک منشا کی تعمیل پر ان مسلمانوں کو آمادہ کرنا چاہا تھا جو ان کے زمانہ میں موجود تھے اپنے عہد کے لوگوں کو بھی انھوں نے اسی حکم کی تعمیل کی طرف توجہ دلائی اور خبر احاد والی روایتوں کی بنیاد پر اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں فساد اور فتنے سے بچنے کی ایک دوامی تدبیر یہ بتادی کہ جب وہ پیدا ہوجائیں کے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو اس زہر کے ازالہ کی یہی صورت ہے کہ قرآن کے "البینات" پر سمٹ جانے اور جمع ہونے کی دعوت مسلمانوں کو دی جائے، دین کے غیر مبناتی مسائل کے

ناگزیر قدرتی اختلافات، ارادی واختیاری جنگ وجدال کی شکل اختیار نہ کرنے پائیں، اس خطرے کے انسداد کی واحد تدبیر یہی ہے ورنہ "البینات" سے ہٹ کر "غیر مبنائی مسائل" میں بھی ایک ہی مسلک کا پابند مسلمانوں کو بنانے کا ارادہ جب کبھی کیا جائے گا وہ حقیقت پر اجماع واتفاق کی دعوت نہ ہوگی بلکہ مسلمانوں کو مختلف ٹکڑیوں میں بانٹنے کی طرف خطرناک اقدام ہوگا، پس سیدھا۔ صاف، روشن راستہ "لیلھا ونہارھا سواء" کا یہی ہے کہ البینات میں جو ایک ہیں وہ بہر حال ایک ہیں خواہ "غیر مبنائی مسائل" میں وہ جس حد تک مختلف ہوں اس اختلاف سے ان کا اتحاد قطعاً متاثر نہیں ہوتا۔ اختلاف کے ساتھ اتحاد، اور اتحاد کے ساتھ اختلاف کی یہی حکیمانہ درمیانی راہ تھی، جس کی عملی مشق کا موقعہ مسلمانوں کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی ملا، اور ابوبکر صدیق رضؓ کے زمانہ میں قریب تھا کہ راہ سے مسلمان ہٹ جائیں لیکن پُر ہونے سے پہلے فتنے کے اس سرچشمہ پر ہمیشہ کے لئے آپ نے ایک ایسی ڈاٹ لگادی کہ وقت پر اگر اس کی خبر نہ لی جاتی تو بقول سعدی ہاتھیوں سے بھی اس سیلاب کا روکنا ناممکن تھا صدیق اکبرؓ نے اپنے زمانے میں بھی لوگوں کو اسی مسلک پر قائم رکھنے کی کوشش کی، اور آئندہ رہتی دنیا تک کے لئے آپ نے اختلاف کے ساتھ اتحاد کو باقی رکھنے کا یہ کارگر بے خطا نسخہ مسلمانوں کے .. حوالہ فرمایا کہ اتحاد کا معیار ہمیشہ دین کے مبنائی حصہ کو رکھا جائے جس کی تعبیر حضرت والا نے "کتاب اللہ" کے لفظ سے فرمائی۔

اور جیسا کہ شروع میں میں نے عرض کیا تھا کہ اپنی تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال کی طویل تاریخ میں مسلمانوں کی وسیع وعریض امت جو کروڑہا کروڑ کی تعداد میں دنیا کے اکثر حصوں میں پھیلی ہوئی ہے، دین کے غیر مبنائی حصہ میں اختلافات رکھتے ہوئے بھی ان کی اکثریت عظیمہ اہل السنت والجماعت کی ایک ہی جماعت کی شکل میں جو پائی جارہی ہے تو یہ اسی حکیمانہ تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اور جب کبھی غیر دینی یا اندرونی یا بیرونی موثرات کے دباؤ نے مسلمانوں کو

ٹ گلستان سعدی کے مشہور مکتبی شعر۔ سرِ چشمہ باید گرفتن بہ بیل + چو پر شد نشاید گرفتن بہ پیل، کی طرف اشارہ

اس راہ سے منحرف کیا ہے خود ہی صدیقی دعوت جس کا حاصل یہی ہے کہ

"ہمارے اور تمہارے درمیان اشتراک کا نقطہ اللہ کی کتاب ہے آؤ ہم سب اس کی حلال کی ہوئی باتوں کے حلال ہونے پر اور حرام کی ہوئی باتوں کے حرام ہونے پر جمع ہو جائیں" ہمیشہ کام آئی ہے، اور مسلمانوں کی دینی وحدت کی محافظ بن گئی پچھلے دنوں ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی غیر بنیاتی مسائل کے اختلافات شروع ہوئے اور بعض لوگوں میں اس کا جوش پیدا ہوا کہ اختلافی حدیثوں سے پیدا ہونے والے نتائج میں جن پہلوؤں کو اپنی معلومات کی بنیاد پر زیادہ بہتر اور اولیٰ سمجھتے تھے ان ہی پہلوؤں کا پابند ہندوستان کے ہر مسلمان کو بنا دیں لیکن پوری صدی بھی گذرنے نہ پائی تھی کہ ان کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا، اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ "البنیات" پر متحد ہو جانے کے بعد غیر بنیاتی مسائل کے اختلافات کے برداشت کرنے کی گنجائش اب ان میں بھی پیدا ہو چکی ہے اب وہ بھی کسی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں محسوس کرتے جو آمین زور سے نہیں کہتا یا رکوع میں جاتے اور سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ نہیں اٹھاتا حقیقت ان پر واضح ہو چکی ہے بطور نام نہاد کے اپنے مسلک کو ایک خاص نام سے موسوم کر کے جی رہے ہیں شاید یہ نام بھی زیادہ دن تک باقی نہ رہے گا۔[1]

---

[1] پچھلے چند دنوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ نام پر بھی اتفاق ان میں باقی نہیں رہا ہے، بعض اپنے آپ کو بجائے اہل حدیث، یا عامل بالحدیث یا محمدی وغیرہ الفاظ کے کبھی "شافعی" کبھی "حنبلی" وغیرہ بھی کہنے لگے ہیں "حنبلی" ہو جانے کے بعد ہی وہی بات سامنے آ جائے گی جو پہلے سے چلی آ رہی تھی، میں عرض کر چکا ہوں کہ لفظ "حنبلی" کے ساتھ حنفی یا شافعی وغیرہ الفاظ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ سارے حنفی و شافعی وغیرہ مسلمانوں میں جس کی شخصیت قدسیہ "غوثیت کبریٰ" کے مقام سے سرفراز سمجھی جاتی ہے اور مانا جاتا ہے کہ جن کا قدم مبارک "علی رقبۃ کل ولی" ہے یعنی سیدنا الشیخ عبد القادر الجیلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ "حنبلی" ہیں۔ اس موقع پر ایک لطیفہ کا بار بار خیال آ رہا ہے، میں نے براہ راست بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت سنی ہے کہ حضرت کے پیر و مرشد مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی تغمدہ اللہ بغفرانہ کی خدمت میں فرد اہل حدیث کے ایک ممتاز و نمایاں عالم

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اس میں شک نہیں کہ ایک مختصر سی بات کے لئے غیر معمولی طور پر مجھے طول کلامی سے کام لینا پڑا لیکن سچ پوچھئے تو دیکھنے کی حد تک ابو بکر صدیقؓ کے مذکورہ بالا الفاظ مختصر نظر آتے ہیں لیکن سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ "تدوین حدیث" کی تاریخ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ خدمت ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتی ہے عہد صدیقی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے متعلق صرف دو مسئلے اہمیت رکھتے تھے، یعنی ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے۔ یہ تو پہلی خدمت تھی جس کی نگرانی ہر مسلمان کے فرائض میں داخل تھی اسی کے ساتھ دوسری اہم خدمت جیسا کہ بہ تفصیل بیان کر چکا ہوں یہ تھی کہ ان حدیثوں کی اشاعت میں چاہا جاتا تھا کہ عمومیت کا الیسا رنگ نہ پیدا ہونے پائے جس کے بعد نرمی اور مساحت کی وہ کیفیت ان میں باقی نہیں رہ سکتی تھی جسے آنحضرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جن کا حضرت نے نام بھی لیا تھا، غالباً مولانا ابراہیم اروی مرحوم، وہیں حاضر ہوئے مولانا ابراہیم سے جب ملاقات ہوئی تو حضرت گنج مرادآبادی نے پوچھا کہ مولوی صاحب آپ عامل بالحدیث ہیں بولے جی ہاں الحمد للہ، مولانا نے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سونے کے وقت کون سی دعا پڑھتے تھے مولوی صاحب نے کہا کہ اس وقت یاد نہیں ہے پوچھا کہ گھر سے نکلتے وقت کیا پڑھتے تھے بولے وہ بھی یاد نہیں ہے الغرض یوں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اوقات اور مقامات میں جو دعائیں پڑھا کرتے تھے جیسے اکثر مولویوں کو عموماً یاد نہیں ہوتیں مولوی ابراہیم بیچارے کو بھی یاد نہ تھیں تب مولانا نے مولوی ابراہیم کو خطاب کرکے کہنا شروع کیا کہیں مولانا! آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف اختلافی حدیثوں کو یاد کیا ہے لیکن جن حدیثوں کے متعلق کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے ان کے یاد کرنے کی ضرورت کو عمل بالحدیث کے لئے آپ نے ضروری خیال نہ کیا۔ کیا اسی کا نام عمل بالحدیث ہے کہتے ہیں کہ مولوی ابراہیم جھینپ سے گئے مولانا محمد علی مرحوم یہ بھی بیان فرماتے تھے کہ مدینہ منورہ کی حاضری کے زمانہ میں مولوی ابراہیم نے ایک خواب دیکھا اور اسی خواب کے بعد حنفی مسلک پر واپس ہو گئے تھے شاید اس مضمون کا ایک مکتوب بھی مولوی ابراہیم کا لکھا ہوا حضرت مولانا محمد علی کے پاس موجود تھا۔

صلی اللہ علیہ وسلم ان حدیثوں کے مطالبا ور گرفت میں بہر حال باقی رکھنا چاہتے تھے ہر شخص تک ان حدیثوں کو نہ پہنچانا، مکتوبہ مجموعے جو آپ کے زمانے میں لکھے جا چکے تھے ان کا ضائع کرا دینا عمومی طور پر آئندہ ان حدیثوں کے لکھنے سے لوگوں کو منع کر دینا۔ ابو بکر صدیق کا اپنے ہاتھ سے جمع کی ہوئی حدیثوں کو نذر آتش کر دینا، اور اس کے سوا اس سلسلہ میں جن دوسرے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، بتا چکا ہوں کہ غرض و غایت سب کی یہی تھی، اور عہد صدیقی سے ان ہی حدیثوں کے متعلق مسلمانوں کے ذمہ یہ تیسری خدمت سپرد ہوئی کہ مسلمانوں کو لڑانے بھڑانے، ان کی ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے جدا کرنے کا ذریعہ ان حدیثوں کو نہ بنایا جائے، بالفاظ دیگر گویا سمجھنا چاہئے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار بنایا کہ خبر آحاد کی حدیثوں میں انفرادی معلومات کے لحاظ سے قدرتاً جو اختلافات رہ گئے ہیں ان کو ارادی و اختیاری مخالفتوں کی آگ بھڑکانے کا ایندھن اگر کوئی بنانا چاہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے اس غلط استعمال سے اس کو روکا جائے۔ اس میں شک نہیں عملی طور پر تدوین حدیث کی تاریخ میں حضرت ابو بکرؓ کی اس خدمت کا اور اس کی قدر و قیمت کا لوگوں نے بہت کم تذکرہ کیا ہے بلکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ابو بکر صدیقؓ کی طرف مذکورہ بالا روایت جو منسوب کی گئی ہے کھٹکنے کی حد تک تو تاریخ حدیث کے پڑھنے والوں کے سامنے دوسری روایتوں کے ساتھ یہ روایت بھی گذرتی ہی ہو گی لیکن اس کا واقعی کیا مطلب ہے، ٹھہر کر سوچنے کی ضرورت شاید ہی کسی نے محسوس کی ہو لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ عملاً ابو بکر صدیقؓ کی عاید کی ہوئی اس ذمہ داری کو صحابہ نے قبول کیا اور بعد کو بھی تقریباً ہر زمانہ میں مسلمانوں کو اس باب میں ہم صحابہ کرام کی اس روش کا پابند پاتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کے جو مختلف معلومات ان حدیثوں کے متعلق تھے، اور ان میں ہر ایک اسی پر عامل تھا جو وہ جانتا تھا، لیکن عملی اختلاف کے باوجود آج تک کوئی ایسا واقعہ منقول نہیں ہے کہ ان اختلافات کی وجہ سے کسی صحابی نے دوسرے صحابی کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کیا ہو یا ان اختلافات کی بنیاد پر اپنے دین کو کسی صحابی نے دوسرے کے

دین سے الگ قرار دیا ہو، بلکہ جہاں تک میں جانتا ہوں شاید ہی کسی صحابی نے اپنی دینی زندگی کو دوسرے صحابی کی دینی زندگی سے افضل و برتر خیال کیا ہو کم از کم کوئی روایت مجھ تک تو ایسی نہیں پہنچی ہے صحابہ کا یہی طرز عمل تو تھا، جسے ان کے فیض یافتوں یعنی تابعین نے دیکھا تھا۔ کچھ دیر پہلے حضرت قاسم بن محمد کا یہ فتویٰ جو میں نے نقل کیا تھا کہ پوچھنے والے نے امام کے پیچھے قرأت کے متعلق جب حضرت سے سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا

"کہ اگر پڑھو گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں اس کا نمونہ موجود ہے،

اور نہ پڑھو گے تو اس کا نمونہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں تم کو ملے گا۔

اپنی حکمرانی کے زمانہ میں سلف صالح کے جن بزرگوں اور ان بزرگوں کے علم و تحقیق پر بھروسہ کرکے دین کے غیر بنیادی شعبہ میں جن پہلوؤں کو ہندوستان کے مسلمانوں نے افضل و اولیٰ قرار دے کر غیروں کے سامنے اس کفرستان میں اپنے مذہبی نظام کی وحدت و یکرنگی کے دلکش سماں کو سیکڑوں سال تک محفوظ اور قائم رکھا تھا مگر زوال حکومت کے ساتھ ہی نہ معلوم کن اسباب و موثرات کے تحت اچانک بعضوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کا علم اور ان کی تحقیق سلف کے ان بزرگوں کے علم و تحقیق سے زیادہ بہتر اور صحیح ہے جن پر مسلمانان ہند نسلاً بعد نسل بھروسہ کرتے چلے آتے تھے اس خیال کے زیر اثر عام مسلمانوں سے پھٹ کر اگر اپنے علم اور اپنی تحقیق کے وہ صرف پیرو بن جاتے تو شاید شکایت کرنے والوں کو ان سے کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن وہ تو آگے بڑھے اور عہد صحابہ و تابعین کے تربیت یافتہ دماغوں، اسی عہد کے تقویٰ و طہارت سے منور قلوب کے فیصلوں سے بدکا بدکا اور بھڑکا بھڑکا کر وہ اپنے حافظہ کے پیدا کئے ہوتے نتائج کی تقلید کی دعوت احیاءِ سنت یا اتباعِ سنت کے نام سے اس ملک میں مسلمانوں کو دینے لگے، قرآن جس فعل کو جرم ٹھہرا چکا تھا اور مختلف الفاظ میں اس کے حرام ہونے کا قطعی اعلان کر رہا تھا، تفریق بین المسلمین کا یہ فعل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک نہ جرم ہے اور نہ کوئی ایسا کام ہے جو نص قطعی کے رو سے حرام قرار پا چکا تھا۔ یعنی

وہ دین میں جرم کا ارتکاب صرف اسی لئے کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو ایسی باتوں کے پابند بنانے میں شاید وہ کامیاب ہو جائیں جن کی پابندی سے انحراف خود ان کے نزدیک بھی نہ جرم تھا اور نہ گناہ۔ ان جائز پہلوؤں میں جن کا ہر پہلو شرعی حدود سے باہر نہ تھا زیادہ سے زیادہ وہ پہلو بہتر اور افضل تھا جس کے لئے وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

اللہ اللہ خبر آحاد کی حدیثوں کے اختلاف کا فتنہ جو نرم تھا موم سے بھی زیادہ نرم تھا اس میں بھی وہ شدت بھری گئی ایسی سختی اور ایسی شدت کہ پتھر اور لوہا بھی اس کے سامنے شاید پانی نظر آتا تھا، اختلافی حدیثوں کا یہی سرمایہ ان کا گویا اسلحہ خانہ تھا۔ پیغمبر کی ایک ایک حدیث حدیث نہیں بلکہ حرب کا آلہ اور ضرب کے اوزار بن چکی تھی وہ اس پر ان ہی حدیثوں میں سے کسی حدیث کو "السکین" (چھری) بنا کر وار کرتا تھا اور یہ اس پر "حبل" (ڈوری) کی شکل میں کبھی کمند پھینکتا تھا اور اسی جنگ میں کبھی اس صف سے "ظفر مبین" کا شادیانہ بجایا جاتا تھا، اور کبھی اس صف سے "فتح مبین" کا نرسنگھا پھونکا جاتا تھا، تحقیق کے بعد ہمیشہ یہی ثابت ہوتا تھا کہ ہر فریق جنگ کے پہلے گھنٹے پر جس مقام پر تھا وہاں سے نہ ایک قدم آگے بڑھا ہے اور نہ پیچھے ہٹا ہے، بلکہ نہ آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے کہ ایک ہتھیاروں کے نہ ختم ہونے والے لامحدود ذخیرے پر قابض تھا۔

بہر حال کچھ بھی ہو اس سارے طول و طویل قصے کے ذکر سے میری غرض یہ تھی کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے ساتھ ان گستاخانہ بازی گریوں کو دیکھتے ہوئے اللہ کا بندہ جھگڑنے والوں کے اس گروہ کو اگر یہ مشورہ دے کہ جب تمہارا یہی حال ہے تو ایسی روایتوں میں حدیثوں کا بیان کرنا ہی ترک کر دو، تو کیا مشورے کے ان الفاظ کا یہ مطلب لینا صحیح ہے کہ مشورہ دینے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو دنیا سے ناپید کرنا چاہتا ہے۔

ٹ پچھلی صدی میں جو رسالے اور کتابیں اس سلسلہ میں شائع ہوئی ہیں ان ہی کے ناموں کی طرف اشارہ ہے مبالغہ نہیں ہے بلکہ واقعہ ان رسالوں میں ایک رسالے کا نام "السکین" (چھری) تھا، جو مسئلہ اس کے لکھا گیا تھا اسی مسئلہ میں دوسرا رسالہ حبل المتین تھا، باقی الظفر المبین اور الفتح المبین تو اس سلسلے کی مشہور مجموعہ ہیں یہ ایک بڑی طویل تاریخی داستان ہے۔

یا پیغمبر نے اپنی جن حدیثوں سے استفادے کی راہیں امت پر کھلی رکھی ہیں ان کے فوائد سے امت کو محروم کرنا چاہتا ہے۔

کن لوگوں سے کہہ رہا ہے، کیوں کہہ رہا ہے، کن حالات میں کہہ رہا ہے، گفتگو کی ان تمام ماحولی خصوصیتوں سے قطع نظر کر کے مذکورہ بالا دعوی گفتگو کے الفاظ، صرف الفاظ سے تہمت تراشی کی میرے خیال میں یہ بدترین مثال ہوگی۔

پس حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابۂ کرام کو اس واقعہ سے مطلع کرنے کے بعد یعنی تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں بیان کرتے ہو، اور باہم ایک دوسرے سے اختلاف کر رہے ہو، تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے، وہ ان اختلافات میں اور زیادہ سخت ہو جائیں گے، ان الفاظ کے ساتھ جو مشورہ دیا تھا کہ

فلا تحدثوا من رسول اللہ شیئا[1] تم لوگ رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات نہ بیان کیا کرو۔

تو صرف ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کلیتہً حدیثوں کے بیان کرنے سے صحابہ کو روک دینا چاہا خود ہی سوچئے کہ بہتان و افترار کے سوا اور بھی کچھ ہے، صاف اور واضح مطلب اس کا یہی ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ مخالفانہ اغراض کو مواد دینے کے لئے حدیثوں کے بیان کرنے سے لوگوں کو وہ روکنا چاہتے تھے۔ غرض حضرت کی یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان حدیثوں کا صحیح استعمال یہ نہیں ہے کہ ان کے متعلق جس شخص کے جو معلومات و تاثرات ہیں خواہ مخواہ ان کی پابندی کا مطالبہ اپنے معلومات کے زور پر دوسروں سے کرے بلکہ صحیح مسلک

---

[1] فلا تحدثوا کی ابتدا میں جو ف کا حرف ہے عربی زبان کی معمولی واقفیت رکھنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ یہ ترتیب پر دلالت کرتا ہے یعنی اس سے پہلے جو بات بیان کی جاتی ہے اس کے نتیجہ کا اظہار جب کرنا چاہتے ہیں تو اس کے شروع میں ف کے حرف کا اضافہ کرتے ہیں پس صاف مطلب اس کا یہی ہے کہ ان کا یہ حکم اسی واقعہ کے ساتھ مربوط ہے جس سے لوگوں کو آپ نے مطلع کیا تھا اور وہ واقعہ کیا تھا یہی کہ حدیثوں کو اندرونی مخالفتوں کا ذریعہ بنائے جانے لگے ہیں اگر آج ہی اس کی روک تھام نہ کی گئی تو آئندہ اس کے نتائج زیادہ سخت اور زیادہ ہولناک شکلوں میں سامنے آئیں گے ۱۲

ان اختلافات کے متعلق جو اس قسم کی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں یا تفقہ کے سلسلے میں اجتہادی نتائج کے اندر جو اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں مسلمانوں کو اس قسم اختلافات کے متعلق چاہئے کہ ایک دوسرے کے اختلافات کی برداشت کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں دین کے اس غیر مبادی حصہ کے اختلافات کے بارے میں مسلمانوں کو ایک ہی نقطہ پر جمع کرنے کی کوشش غلط کوشش ہے اس کوشش کے لئے ہمارے پاس "البینات" کے احکام و مسائل ہیں ان کے متعلق کسی مسلمان میں خدا نخواستہ کسی قسم کا انحراف اگر محسوس ہو تو بلا شبہ اس وقت فرض ہو جاتا ہے کہ اس کے سامنے قرآن کی آیتیں تلاوت کی جائیں، نصوص صریحہ کو پیش کر کے اس انحراف اور اختلاف سے اس کو روکا جائے کہ ان میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی ہے، دین کا یہی وہ حصہ ہے قرآن میں جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خبر دی گئی ہے کہ "بینات" کے ہوتے ہوئے گذشتہ قومیں جدا جدا ہو کر آپس میں مختلف ہو گئی ہیں جس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ دین کے اس حصہ کو اتنا واضح اور روشن شکل میں رکھا گیا ہے کہ عام و خاص اعلیٰ و ادنیٰ، عالم و جاہل سب ہی اس پر متفق ہو کر ایک ہو سکتے ہیں "البینات" کے ہوتے ہوئے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ دین میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس پر ہم سب اپنے اختلافات کو ختم کر کے سمٹ جاتے ہیں تو سمجھتا ہوں کہ یہی مطلب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان الفاظ کا بھی ہے جو آخر میں فرمایا کہ یعنی

فمن سالکم فقولوا بیننا و بینکم کتاب الله فاحلوا حلاله و حرموا حرامه (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰)	پھر تم سے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دیا کرو، کہ ہمارے تمہارے درمیان اشتراک کا نقطہ، اللہ کی کتاب ہے بس چاہتے کہ اس کتاب سے جن چیزوں کو حلال کیا اس کو حلال قرار دو اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہرالو۔

تابعین کے بعد بھی مسلمانوں کو ہم اسی مسلک کا پابند پاتے ہیں، معلومات کا اختلاف صرف علم تک

محدود تھا لیکن "عمل" میں اختلاف کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ صرف دوسری صدی ہجری کے وسط میں
حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اہم اصلاحی اقدامات کے اعلان کے ماننے والوں میں سے
بعضوں کے اندر پھر ان اختلافات کی کچھ لہریں اٹھی تھیں لیکن زہر کے ساتھ ساتھ سیدنا امام
احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں ایک تریاقی وجود اسلام کو عطا ہوا، آپ نے اپنی بے لاگ
صداقت، بے تھاہ علم، مستحکم تقویٰ کے زور سے ان اٹھنے والی لہروں کو اتنی قوت سے دبا دیا
کہ پھر صحیح معنوں میں ان اختلافات کو پھیلنے پھولنے کا موقعہ مسلمانوں کی عمومیت میں کبھی نہ ملا۔
بعض پیشہ ور مولوی ان میں ارادی مخالفتوں اور مخاصمتوں کا رنگ اپنے خاص اغراض کے تحت
بھرنا بھی چاہتے تھے تو ان کے تعلیمی حلقوں سے آگے اس کا اثر عام مسلمانوں تک بحمد اللہ کبھی نہیں پہنچا
ممکن ہے کہ میرے اس خیال سے بعضوں کو اختلاف ہو لیکن میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ طبقۂ صوفیہ
سے لوگوں کو اور جتنی بھی شکایتیں ہوں اس وقت ان سے بحث نہیں ہے۔ لیکن انصاف کی
یہ بات ہے کہ غیر بنیادی مسائل کے اختلافات کے جس رنگ کو مولویوں کا ایک گروہ پختہ کرنا چاہتا
تھا صوفیہ کا عام گروہ اس کے مقابلہ میں ہمیشہ اس رنگ کو دھیما اور پھیکا کرنے کی کوشش کرتا رہا
کچھ نہیں تو صوفیہ کے گروہ کا مسلمانوں پر بھی ایک احسان کیا کم ہے۔ بہر حال یہ ایک بڑی مفصل اور
مبسوط بحث ہے۔ اہل علم کے لئے تو شاید یہ چند اشارے بھی کافی ہو سکتے ہیں لیکن جن کے لئے یہ
اشارے ناکافی ہیں، ان کو میری کتاب "تدوین فقہ" کا انتظار کرنا چاہئے کہ ان مسائل کی تفصیل کے
لئے وہی کتاب موزوں ہو سکتی ہے امام شافعی کے اصلاحی اقدامات کیا تھے، ان سے بعضوں کو کیا
غلط فہمیاں ہوئیں، حضرت امام احمد بن حنبل نے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کن تدبیروں سے کیا، ظاہر
ہے کہ فقہا اور ائمہ فقہ کے حالات سے ان سوالوں کا حقیقی تعلق ہے ضمناً و ذیلاً تدوین حدیث کے سلسلہ میں بھی ان
کا ذکر کر دیا گیا۔

لہ مختصر یہ ہے کہ امام شافعی حجاز سے تعلیم پا کر جب دار الخلافت بغداد پہنچے تو خود ان کا بیان ہے کہ جامع مسجد میں اس
کے اسی حلقوں میں بیٹھنے کے بعد مجھ پر ظاہر ہوا کہ ہر پڑھانے والا اللہ کا نام لیتا ہے اور نہ رسول کا کسی مسئلہ کی نقل میں جو
پڑھاتا ہے قال الرسول بلکہ ہر ایک قال اصحابنا یعنی ہمارے استادوں نے یہ کہا یہی سنتا ہے صرف ڈیڑھ سو سال کے اندر
(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

بہرحال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں حدیث کے متعلق جو اہم خدمت انجام پائی وہ یہی تھی اسی حال میں پیغمبر کے دین اور پیغمبر کی امت کو چھوڑ کر آپ اپنے محبوب نبی کے بازو میں جا کر سو گئے۔ آپ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا زمانہ آتا ہے (اللّٰھم صل علی نبیک وحبیبک وعلی آلہ وصحبہ وخلفائہ اجمعین)

عہد فاروقی اور حدیث | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے، اس باب میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعض احتیاطی طریقہ عمل کا ذکر عہد صدیقی کے واقعات کی ذیل میں کر چکا ہوں اور کوئی وجہ بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ اشدھم فی امر اللہ کی اشدیت دین کے دوسرے شعبوں میں جیسے نمایاں ہے حدیث کا شعبہ بھی اس سے کیوں مستفید نہ ہوتا۔ عدل و انصاف، سیاست و حکومت اور از یں قبیل دوسرے معاملات میں فاروق اعظم کے بے لاگ فیصلوں کا جیسے لوگ اب تک ذکر کرتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث کی تاریخ میں بھی حضرت عمرؓ کے رعب و داب کا وہی اثر ہے ان کے بہت بعد یعنی تقریباً اس وقت جب دوسری صدی ہجری گذر رہی تھی، مشہور محدث حضرت سفیان بن عیینہ کے حالات میں لکھا ہے کہ حدیث کے طلبہ ان کے حلقہ میں جب آتے تو ان کی طرف خطاب کر کے کہتے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دین کے اصل سرچشمہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے علماء اسلام کی اس تعلق کو دیکھ کر فقہا امام میں بھی پیدا ہوئی اور اعلان کیا کہ علماء جن کا حوالہ دیا جاتا ہے ان میں ہر ایک کے تشریحات اور اجتہادی فیصلوں کو میں پھر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر پیش کر کے جانچوں گا آپ نے بغداد میں بیٹھ کر حنفی مذہب پر تنقید کی اور مصر جہاں ان کے استاد امام مالک کا مذہب زیادہ عروج پر تھا وہاں پہنچ کر مالکی مذہب پر تنقید فرمائی، امام شافعی کو اس کا اجر ملتا رہے گا کہ ہٹنے کے بعد دین کے حقیقی سرچشموں کتاب و سنت کی طرف مسلمان ان ہی کے طرز عمل کی وجہ سے متوجہ رہے ہیں مگر فروعی اختلافات کو امام شافعی کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت جب حاصل ہو گئی تو امام احمد نے مفاہمت و مصالحت کی راہ کھولی ان کی فرقہ ایک ہی مسئلہ کے مختلف پہلو کے جواز و عدم جواز کا عموماً انتساب کتابوں میں جو کیا جاتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر پہلو اس مسئلہ کا ان کے نزدیک شرعی حدود سے باہر نہیں سمجھا جاتا ۱۲

لو ادرکنا و ایاکم عمر لاوجعنا　　　اگر پالیتے ہمیں اور تمہیں عمر تو مار کر دکھ پہنچاتے

ضربا ص۱۲۰ جامع ج۲

دراصل سفیان کا اشارہ اشد یت کے ان ہی واقعات کی طرف ہے جن کا روایت حدیث کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی طرف انتساب کیا گیا ہے، اور اس زمانہ میں بعض خاص اغراض کے تحت ان کی کافی تشہیر کی گئی ہے، مثلاً حضرت ابوہریرہ کے شاگرد ابوسلمہ راوی ہیں کہ میں نے ابوہریرہ سے کہا کہ جس آزادی کے ساتھ آج کل آپ حدیثیں بیان کیا کرتے ہیں کیا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں بھی ایسا کر سکتے تھے جواب میں ابوہریرہ نے جو بات کہی تھی یعنی

لوکنت احدث فی زمان عمر　　　اگر عمر کے زمانے میں اسی طرح میں حدیثیں

مثل ما احدثکم لضربنی　　　بیان کرتا جیسے تم سے بیان کرتا ہوں تو اپنے

بمخفقته الذہبی ص۷ ج۱　　　کوڑے سے عمر مجھے مارتے۔

اور ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو صرف اندیشہ ظاہر کیا تھا سعید بن ابراہیم کے حوالہ سے الذہبی ہی نے یہ دوسری روایت درج کی ہے کہ ان کے والد ابراہیم کہتے تھے کہ

ان عمر حبس ثلاثة ابن مسعود　　　حضرت عمرؓ نے تین آدمیوں کو روک[1] دیا تھا،

وابا الدرداء وابا مسعود　　　ابن مسعود کو ابوالدرداء کو اور ابومسعود انصاری

الانصاری فقال اکثرتم　　　کو اور ان سے کہا کہ تم لوگ رسول اللہ صلی

الحدیث عن رسول　　　اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے بہت

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم　　　زیادہ حدیثیں روایت کیا کرتے ہو،

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اندیشہ واقعہ کی صورت بھی بعض لوگوں کے ساتھ اختیار کر چکا تھا یہ اور اسی قسم کی بعض دوسری روایتوں کو درج کرکے حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم

---

[1] بعض لوگوں نے حبس کا ترجمہ قید بھی کیا ہے یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان تینوں صحابیوں کو قید کر دیا تھا

میں لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"جن لوگوں کو واقعات کا صحیح علم نہیں تھا اور بدعات (نئی باتوں) کے پیدا کرنے کا جن میں زیادہ شوق پایا جاتا تھا سنت (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں) سے جن کے قلوب میں گرانیاں تھیں انھوں نے مذکورہ بالا روایتوں سے جو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہیں، یہ نتیجہ پیدا کرنا چاہا ہے کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں کے دین سے حدیثوں کو بالکلیہ خارج کر دینا چاہتے تھے" ص۱۲۱ جامع ۲۴

پھر اس غلط نتیجہ کی تردید میں حافظ نے ایک طویل بحث کی ہے اور آخر میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں کو ان روایتوں کی صحت میں بھی شبہ ہے، ابن حزم نے بھی کتاب الاحکام میں حضرت عمرؓ کی طرف اس سلسلہ کے منسوبہ روایات کے راویوں پر جرح کر کے ان روایتوں کو مشتبہ و مشکوک قرار دیا ہے مگر میں کہتا ہوں اور پہلے بھی کہا ہے کہ بجز روایت ہونے کے اعتماد کرنے والوں نے ان ہی روایتوں پر جب اعتماد کیا ہے تو انصاف کی بات یہی ہے کہ ان حدیثوں کو بھی چاہتے تھا کہ یہ لوگ نہ بھولتے جو روایات ہی والی کتابوں میں خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں بلکہ یہ واقعہ ہے کہ جن روایتوں سے یہ گروہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے ان کے اسناد کو یعنی جن راویوں سے یہ روایتیں مروی ہیں اور حضرت عمرؓ سے جو حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن راویوں کے توسط سے مروی ہیں دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کی یہ حدیثیں عموماً صحاح ستہ بلکہ بخاری اور مسلم میں پائی جاتی ہیں اور جن روایتوں کو مخالفت حدیث میں یہ لوگ پیش کرتے ہیں کم از کم صحاح کی کتابوں میں ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے ابن جوزی نے تلقیح میں ان حدیثوں کی تعداد جو حضرت عمرؓ سے مروی ہیں، پانسو سینتیس ۵۳۷ بتائی ہے، فرض کیجئے کہ متون کے ساتھ طرق کو بھی اس میں شمار کر لیا گیا ہو لیکن ابونعیم اصفہانی کے اس بیان میں تو اس شبہ کی بھی گنجائش نہیں ہے ابونعیم حافظ کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ

اسند عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من المتون سوی الطرق مائتی حدیث ونیفا [illegible]	یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو سو سے کچھ اوپر حدیثیں مروی ہیں اس تعداد میں صرف متون کو شمار کیا گیا ہے طرق [illegible]

(باقی آئندہ)

دلائل القرآن

از
(جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی)

اعجاز القرآن واتفاق کے حاشیہ پر صاحب نظام القرآنؒ نے اسباب اعجاز کی جانب مندرجہ ذیل حکیمانہ اشارات اور عجیب و غریب نکات کا اظہار فرمایا ہے جس کے مفہوم کو ہم اپنے الفاظ میں پیش کر رہے ہیں ارشاد ہوتا ہے۔

(۱) ممکن ہے کہ کلام میں ایک ایسی لطیف چیز ہو مثل روح کے کہ جس کی ماہیت نہ سمجھی جا سکی ہو لیکن اس کے وجود پر آثار ہدایت سے استدلال کیا جا سکتا ہو کما قال تعالیٰ (اذا دعاکم لما یحییکم) یعنی جب وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف دعوت دے جو ایک بلند زندگی بخشتی ہے۔

قرآن مجید کا موثر ہونا ذوق سلیم سے معلوم ہو سکتا ہے جس کی تائید ان واقعات سے ہوتی ہے جو اس کے عظیم الشان اثر کے متعلق تاریخوں میں درج ہیں اور نیز اہل عرب کی روایات سے بھی پس یہ ایک چمکتی ہوئی روشنی اور ناقابل انکار دلیل ہے جیسا کہ توراۃ میں آنحضرت صلعم کی بشارت کے موقع پر آیا ہے اور مکاشفات یحییٰ میں بھی ہے کہ اس کے منہ سے ایک شمشیر براں نکلے گی تاکہ اس کے ذریعہ قوموں کو زیر کیا جائے۔"

(۲) اس سلسلہ کے ماتحت معرفت حقیقت اعجاز قرآن ناممکن ہے محض اس کے آثار معلوم ہو سکتے ہیں۔ امام عبدالقاہر جرجانی وغیرہم نے غلطی کی کہ قرآن کا اعجاز نحوی اسالیب اور وجوہ بلاغت کو قرار دیا حالانکہ یہ تمام چیزیں اعجاز نہیں۔

(۳) اس رائے کو سامنے رکھتے ہوئے فن بلاغت کا فائدہ یہ ہوگا کہ انسانی کلام کا منتہیٰ اس کے اقسام اسالیب اور ان کے مدارج معلوم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد کلام معجز اور غیر معجز کا فرق نمایاں

طور پر محسوس ہوگا یعنی یہ معلوم ہو جائے گا کہ اول الذکر اپنے اثر ہی کی وجہ سے اور اس روح ہی کی وجہ سے جو دلوں کے اندر پھونکتا ہے اعجاز کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ ثانی الذکر میں یہ چیز نہیں پائی جاتی ہے اگرچہ اس کے اندر کتنی ہی بلاغت پائی جاتی ہو۔

(۴) اس رائے کی بنا پر یہ بحث ختم ہو جاتی ہے کہ بلاغت مصطلحہ پر اعجاز کا مدار نہیں بلکہ کتاب الٰہی کے اندر ایسی بلاغت ہے جس کی حقیقت تک پہنچنا ممکن نہیں لیکن اس کا عجیب اثر ارباب فکر اور اصحاب تقویٰ پر ظاہر ہوتا ہے۔

(۵) لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس کے اندر لفظی و معنوی محاسن بھی بحر بیکراں کی طرح ہیں علماء بلاغت اپنی پوری جدوجہد کے باوجود بھی اس کے کچھ ہی حصہ تک پہنچ سکتے ہیں ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ کائنات کے اندر جو بے پایاں آیات اور نشانیاں ہیں ان کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اعجاز قرآن کوئی ایسی چیز نہیں جس کو بڑی آسانی سے متعین کیا جا سکے بلکہ حضرت مولانا فراہیؒ کے ارشاد کا مقصد محض غور و فکر کی مزید سراغ رسانی ہے۔

آنحضرت صلعم کے زمانہ میں اہل عرب نے بہت سعی کی کہ قرآن عزیز کا معارضہ کر سکیں مگر باوجود اہل زبان ہونے کے معارضہ سے قطعاً عاجز رہے اور قرآن اپنا اثر بڑھاتا اور پھیلاتا رہا جب آپ کا زمانۂ وصال قریب ہوا تو ایک دوسرا قدم اور اٹھایا گیا وہ یہ کہ مکہ کے نبی کے مثل دوسرے خانہ ساز انبیاء (معاذ اللہ) پیدا کئے گئے۔ چنانچہ ۹ و ۱۰ھ کے لگ بھگ یمامہ میں قبیلہ بنو حنیفہ میں مسیلمہ کذاب کا ظہور ہوا۔ یمن میں اسود عنسی۔ قبیلہ اسد میں طلیحہ بن خویلد۔ اور سجاح ذات القلم وغیرہ بنی تغلب میں نبوت کے دعویدار بن گئے

(۱) مسیلمہ نے یہ دعویٰ کیا کہ اس پر آسمان سے وحی آتی ہے جس کا نام (رحمٰن) ہے اس کا نزول رات کی تاریکی میں ہوتا ہے نہ کہ دن کی روشنی میں۔

الفاظ وحی ملاحظہ ہوں۔ کہتا ہے یا ضفدع یا بنت ضفدعین۔ نقی ما تنقین نصفک فی الماء ونصفک فی الطین۔ لا الماء تکدرین ولا الشارب تمنعین۔

سبحان اللہ یہ ہے وحی الٰہی الموسوم بہ قرآن۔ حالانکہ جس کو ذرا بھی عربی زبان کی ممارست ہوگی وہ خفیف

کر دے گا کہ یہ الفاظ زبان جاہلیت کے نہیں ہو سکتے اور نہ اس طرح کی باتوں کا کوئی ثبوت ہے مگر اس کو کیا کہا جائے کہ جاحظ جیسے ادیب اور بصیر کلام عرب کو دھوکا ہو جاتا ہے یا بطور استہزا کہنا پڑتا ہے "لا ادری ما الذی هیج مسلیمة حتی ساء رایه فی الضفدع"

اسی مسلیمہ نے قرآن کی تقلید میں یہ الفاظ کہے والباذرات زرعا، والحاصدات حصدا والذاریات قمحا۔ والطاحنات طحنا۔ والعاجنات عجنا۔ والخابزات خبزا۔ والثاردات ثردا۔ واللاقمات لقما۔ اہالة وسمنا۔ لقد فضلتم علی اهل الوبر وما سبقکم اهل المدر...

جب طلحة النمری نے مسلیمہ کو دیکھا اور باتیں کیں تو کہا اشهد انك كذاب وان محمدا صادق ولكن كذاب ربيعة احب الينا من صادق مضر۔

(۲) اسود عنسی کی وحی کا حال بھی سننے کے لائق ہے وہ کہتا تھا کہ ایک فرشتہ جس کا نام (ذا خمار) ہے آسمان سے وحی لے کر اترتا ہے۔ یہ اسود عنسی فی الحقیقت ایک نہایت فصیح و بلیغ آدمی تھا جو زبردست کاہن اور سجع میں مشہور تھا امتداد زمانہ سے اس کا کلام ضائع ہو گیا یہ بھی نبوت خانہ ساز کے پانچویں دور میں تھا

(۳) طلیحہ کی وحی ایک (ذالنون) نامی فرشتہ لے کر آتا تھا پھر اس شیطان کو جبرئیل کہنا شروع کر دیا گیا۔ اسی کا قول ہے صلوا قیاما فان الله لا یصنع بتعفیر وجوهکم وقبح ادبارکم

(۴) سجاح بنت الحارث التغلبیہ کی وحی کو بھی اسی پر قیاس کر لیا جائے۔

(۵) مشہور شاعر متنبی جس نے بادیہ سماوہ میں ادعاء نبوت کیا اور اپنے کلام کو قرآن کہہ کر نبوت میں پیش کیا تھا نمونہ یہ ہے "والنجم السیار، والفلك الدوار، واللیل والنهار، ان الکافر لفی اخطار ... امض علی سننك واقف اثر من قبلك من المرسلین فان الله قامع بك زیغ من الحد فی دینه وضل عن سبیله الخ۔ بعد کو پھر اپنے اس ارادہ سے باز آ گیا اور شعر و شاعری ہی میں کمال کو پہنچا

مذکورہ بالا شہادتوں کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے اور عربی کے اسی فقرہ کو پھر دہرا دینا پڑتا ہے" ولیس شان القرآن کشان کلام الناس۔ بلکہ قرآن ایسا کلام

ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایسے مخفی طریقہ اور اشارہ سریعہ سے طاری کر دیا گیا جو تحصیل علم کے معروف کسبی طریقوں سے مختلف اور ان الہاموں، سجع اور کہانت کے طریقوں سے جدا ہے جو بعض خواص اور مدعیان نبوت پر نازل اور طاری ہو جایا کرتے ہیں۔

زمانہ شاہد ہے کہ نزولِ قرآن سے لے کر ختم نزول قرآن بلکہ آج تک نہ تو قرآن عزیز کا معارضہ مقابلہ ہو سکا اور نہ نفوذ و اثر وغیرہ محاسن کلام کی جہانگیری کا انکار کیا جا سکا اور نہ رہتی دنیا تک اخلاد عاکمہ نما لیجیکھ کی صداقت پر آنچ آسکتی ہے یہی تو وہ صداقت اور خداوندی الفاظ ومعنی کی شہنشاہی ہے کہ میور جیسے کرم فرما کو مجبوراً اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ "جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو قرآن کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو" ایک اور یورپین محقق لکھتا ہے کہ "ہم ایسے ہی یقین سے قرآن کو یعنی محمد صلعم، کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں جیسے مسلمان اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں" اسی طرح ایڈورڈ گبن، پروفیسر براؤن، مسٹر کارلائل، ڈاکٹر لی بان اور بڑے بڑے سماجی ہیرو ژلک روسو لوتھر، ٹالسٹائی اور مہاتما گاندھی قرآن کے قانون سے متاثر اور کلام خداوندی کے معترف تھے۔ چنانچہ ممالک یورپ میں ونیس، ہمبرگ، لیپ وغیرہ مطابع میں قرآن طبع ہوئے اور بارہویں صدی عیسوی سے اس زمانہ تک ممالک جرمن، فرنچ، روم، انگلستان وغیرہ کے عالموں، ادیبوں نے قرآن مجید کے تراجم اور اقتباس سے جس قدر فائدہ اٹھایا اس کی تفصیل تطویل کا باعث ہے۔

قرآن کریم کا پہلا ہندی ترجمہ | دنیا کے اندر جتنی زندہ زبانیں ہیں ان میں شاید ہی کوئی ایسی بدقسمت زبان ہو کہ اس میں قرآن مجید کا ترجمہ نہ ہوا ہو مگر اولیت کا سہرا جس ملک اور زبان کے سر ہے وہ ہندوستان اور اس کی ہندی زبان ہے۔ مذہبی تعلقات میں یہ چیز حیرت سے دیکھی جائے گی کہ قرآن مجید کا ہندی ترجمہ آج سے ہزار برس پہلے سندھ کے راجہ مہروگ نے منصورہ (واقع سندھ) کے امیر عبداللہ بن عمر کو لکھا کہ ایسے شخص کو میرے پاس بھیجئے جو ہندی میں ہم کو اسلام کا مذہب سمجھا سکے منصورہ میں عراق کا ایک مسلمان تھا جو مختلف زبانیں جانتا تھا ——— امیر نے راجہ کے دربار میں بھیجا اور وہ وہاں تین

ین رہا اور اس کی خواہش سے اس نے قرآن کریم کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا، راجہ روزانہ ترجمہ سنتا تھا
راس سے بے حد متاثر ہوتا تھا[1]۔

اگر مذہبی یعنی آسمانی کتابوں کے لکھنے والے انسان تھے تو قرآن کے سوا اور کون سی کتاب ہے
چھوٹے چھوٹے بچوں کے سینوں میں محفوظ اور چودہ سو سال سے دنیا کے گوشہ گوشہ کو معمور کئے
دئے ہے نہ ایک حرف اور زیر زبر تک کی کمی بیشی ہوئی اور نہ ایک آیت کا معارضہ و مقابلہ کرنا دنیا کی تاریخ
ں پایہ صحت اور معیار تحقیق پر پورا اترسکا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جنہوں نے اس طرح کا ارادہ کیا وہ چند
ں بے جوڑ فقرے لکھ مارے کیا قرآنی چیلنج "فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ" اور "بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ" کا جواب
رگیا؟ ہرگز نہیں۔ اگر مذہبی کتابوں کے لکھنے والے انسان ہوتے تو ان کے کلام میں بھی انسانی جھلک
وتی اور وہ تمام نقائص پائے جاتے جو فطری طور پر غیر معصوم انسانوں کے اندر ممکن ہیں اگر بحث کے
ول ہو جانے کا ڈر نہ ہوتا تو ہم ان تمام مذہبی کتابوں کے جن کے لکھنے اور تصنیف کرنے والے انسان
ے تھے ایک ایک تار پود بکھیر دیتے اور دکھلا دیتے کہ انسانی کلام اور اللہ کے کلام میں اصولی اور امتیازی
ور کیا فرق ہے مگر بے سود ہے کیونکہ بارہا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چکا ہے بقول حکیم سنائی رحمہ اللہ

• عجب نبود گر از قرآں نصیبِ ماست جز حرفے — کہ از خورشید جز گرمی نہ بیند چشم نابینا

معارضہ قرآن کرنے والوں ابن المقفع اور ابو العلا معری کا انجام اس کی تحقیق

امام ابو بکر باقلانی اور حافظ ابن قیم کی تحقیق یہ ہے کہ ابن المقفع نے قرآن کا معارضہ کرنا چاہا تھا چنانچہ اس سلسلہ میں جب سورۂ ہود کی اس آیت پر پہنچا حَتّٰی اِذَا جَاءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ (الی قولہ تعالیٰ) وَقِیْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔ تو اپنے
خیال سے باز آگیا اور قال ھٰذا ما لا یستطیع البشر ان یاتوا بمثلہ و ترک المعارضۃ واحرق ما
ان قد اختلقہ۔ یعنی ابن المقفع نے عاجز ہو کر کہہ دیا کہ انسانی طاقت سے باہر ہے کہ قرآن کے مثل لایا
جاسکے۔ اور معارضہ کرنا چھوڑ دیا اور جو کچھ گھڑ چکا تھا آگ میں جھونک دیا۔

ابو العلاء معری پانچویں صدی ہجری کا مشہور ادیب گذرا ہے جو مذہب میں نہایت آزاد تھا اس

---

[1] تعلقات عرب و ہند بحوالہ عجائب الہند صلا

کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے سورۂ مرسلات کی آیت اِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ کا معارضہ اپنے ذیل کے شعر میں کیا ہے ؎

حمراء ساطعة الذوائب فی الدجی ترمی بکل شرارة کطراف

ترجمہ: کہتا ہے آگ سرخ رنگ کی ہے اس کی مینڈھیاں تاریکی میں بلند و بالا ہیں ایسی چنگاریاں پھینکتی ہیں جو مثل چمڑے کے سرخ خیمہ کے ہیں۔

حضرت امام رازیؒ نے ابوالعلاء کے شعر مذکور کو آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مدنظر رکھا ہے اور حسب عادت تقریباً ۱۲ اعتراضات اس تشبیہ پر کئے ہیں اور شعر کی مٹی پلید کر دی ہے (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر) اپنا خیال یہ ہے کہ جب تک کسی کے کلام کی صحیح توجیہ اور محل متعین ہو سکے خواہ مخواہ اس کی تغلیط کر کے ہدف ملامت نہ بنایا جائے علماء مصر نے ابوالعلا کی کتاب "الفصول والغایات" دنیا کے سامنے پیش کی اس سے ادیب مذکور کے عقائد و خیالات پر روشنی پڑتی ہے اسی کتاب میں ہے خدا کے دربار میں مناجات کرتا ہے

ادعوك وعلى سوء لبحسن، وقلبي مظلم لكي بنير. وقد عدلت عن المحجة الى بنيات الطريق. وانت العدل ومن عدلك اخاف: يامن سجر له زرقة الافق وزرقة الماء وحمرة الفجر وحمرة شفق الغروب: وان كان الدمع يطفي غضبك فهب لى عينين كانهما متاشتى رشتاء، تبلان الصباح والمساء، واعطني في الدنيا منك وجلا افوزبه بالاخرة في الامان وارزقني في خوفك برد الدى وقد فاد بره اهداء الدعوة له بالغدو والآصال الخ

ایک دوسری جگہ لکھتا ہے۔

اقسم بخالق الخيل والريح الهابة بليل، بين الشرط ومطالع سهيل، ان الكافر لطويل الويل، وان العمر لمكفوف الذيل، متعمد امارج السيل، وطالع التوبة من قبيل، تنج وما اخالك بناج الخ

مذکورہ بالا اقتباسات سے واضح ہو جاتا ہے کہ ابو العلاء معری نے ہرگز قرآن کا معارضہ نہیں کیا ہے کیونکہ
اس کا اونچے درجہ کا موحد اور گہرے درجہ کا مومن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ رافعی اعجاز القرآن
میں صاف فیصلہ کر دیتے ہیں۔ وذلک وامثالہ مما اکذب فریۃ علی المعری ارادہ بھا عدو حاذق الخ[۱۳۹]
یعنی اس طرح کی باتیں جو ابو العلاء کی طرف منسوب ہیں ان کے چالاک اور شاطر دشمنوں نے مرحوم کے سر
تھوپ دی ہیں نہ یہ کہ قرآن کا مقابلہ (معاذ اللہ)

اصل یہ ہے کہ دنیا میں جتنے اچھے درجے کے ادیب ہوتے ہیں وہ سب کے سب اونچے درجہ
کے کلام کے حفظ، تتبع اور تقلید سے ہوتے ہیں۔ ہر زبان کے اندر ادیب اور اساتذہ فن کا ہونا جس طرح
مسلم ہے اسی طرح ان کے کلام کو استشہاد میں پیش کرنا اور سند لانا لسانیات میں حجت مانا گیا ہے چونکہ
قرآن عزیز اپنی فصاحت و بلاغت اور ماورار فہم انسانی صداقت کا علمبردار، تاثیر اور نفوذ کا حامل اور
جملہ انسانی کلام میں انسانی کلام اپنی ایک جدا شان، رفعت اور کمال رکھتا ہے اس لئے دنیا کے ادیبوں
زبان اور کلام عرب پر عبور رکھنے والوں کو پہلے دہلہ میں غلط فہمی ہوئی چنانچہ مسیلمہ وغیرہم ماہرین زبان
معارضہ مقابلہ پر اتر آئے اور تحدی قبول کر لی جو کچھ ہوا وہ دنیا کے سامنے ہے قرآن کے اول مخاطبین خالص
عرب تھے اور وہ تھے کہ جن کی زبان کا سکہ چل رہا تھا اور دنیا کے تمام لوگ گونگے اور زبانیں عربی طلاقت
لسانی اور شیوہ بیانی کے سامنے ماند پڑ گئی تھیں جب یہ عاجز ہو گئے تو پھر کس مائی کے لال کو ہمت اور
جرأت ہو سکتی تھی کہ وہ قرآنی چیلنج کا جواب دیتا۔ عجمی پیداوار میں متنبی اور ابن المقفع کا ذکر اوپر گذر چکا ہے
کہ منہ کی کھائی اور سپر ڈال دینی پڑی مگر غریب ابو العلاء معری کا قصہ ان تمام سے بالکل جدا ہے اور وہ یہ ہے
کہ جہاں تک ابو العلاء کے عقائد اور خیالات کا تعلق ہے وہ یقیناً خدا کے بارے میں بڑا متواضع اور کٹر
خدا پرست تھا اور آخرت کی زندگی کا نہ صرف قائل بلکہ قیامت کا خوف رکھتا تھا البتہ ابتدائی زندگی جیسا کہ ہوتی
کی رہی ہے اس کی بھی رہی ہے اعتبار ابتدا کا نہیں ہوتا ہے انتہا اور حسن خاتمہ کا ہوتا ہے اور خاتمہ کا قطعی
علم بجز خدا کے کس کو ہے اس لئے اپنا یہ فیصلہ ہے کہ ابو العلاء نے قرآن کی چھوٹی اور بڑی سورتوں یا آیات
کا جو تتبع کیا ہے وہ اس حیثیت سے نہیں کیا ہے کہ قرآنی چیلنج اور تحدی کا جواب دیا ہے بلکہ قرآن عزیز

ایک ایسی فصیح و بلیغ اور ادبی زبان لے کر دنیا کے اندر آیا ہے جس نے فنی ادب کے سارے کارخانہ کو سرد کر دیا اس سے متاثر ہو کر اس کی تقلید میں خود بھی نظم و نثر میں اس کا اظہار کیا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لئے کہ دنیا کا ہر ادیب فنی اعتبار سے ہر بلند کلام سے متاثر ہوا ہے مگر کیا انسانوں نے انسانوں کے کلام کا پورا پورا مقابلہ کیا ہے اور کتنے ہیں جو ابن المقفع، متنبی، ابوالعلاء، اور جاحظ ہوئے ہیں؟ اور کتنے ہیں کہ سعدی کی گلستاں کا جواب اور کامیاب جواب دے سکے ہیں؟ اور کتنے ہیں کہ مولانا شبلیؒ کی اردو اور مولانا آزاد کی خطابت اور سحر بیانی کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی ہے؟ جب انسانی مبلغ کا یہ حال اور تہی دامنی کا یہ عالم ہو تو خدا کے کلام کا مقابلہ کرنا معارضہ پر آمادہ ہونا اور تحدی قبول کرنا انہیں سوائے دماغی عیاشی کے کیا کہا جا سکتا ہے؟ جس طرح سب نے منہ کی کھائی اگر خدانخواستہ ابوالعلاء معری نے بھی اوروں کی طرح خدا کی جناب میں گستاخی کی ہے تو اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو اوروں کا ہوا اور اس کے کلام کی بھی وہی نوعیت ہوگی جو اوروں کی ہوئی۔

مصحف عبداللہ بن مسعودؓ اور ایک علمی غلطی کا ازالہ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہذلی بنو زہرہ کے حلیف اور قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ آپ کا بیان ہے کہ میں نے اپنے آپ کو چھ مسلمانوں میں کا چھٹا مسلمان پایا اس وقت سطح ارض پر ہم لوگوں کے سوا کوئی اور مسلمان نہ تھا۔ مکہ میں سب سے پہلے آپ ہی نے باعلان قرآن مجید پڑھا جب آپ اسلام لائے تو رسول اللہ صلعم نے اپنی خدمت میں رکھ لیا اور آپ خدمت میں رہنے لگے۔ آں حضرت صلعم نے فرمایا کہ تم کو اندر آنے کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں تمہاری اجازت صرف یہ ہے کہ تم میری بات سن لو اور پردہ اٹھا ہوا ہو۔ چنانچہ اندر آتے جاتے آپ کو جوتہ پہناتے آپ کے ساتھ آگے آگے چلتے جب آپ غسل کرتے تو پردہ کرتے اور جب آپ سوتے تو آپ کو بیدار کرتے حبشہ اور مدینہ دونوں جگہ ہجرت کی اور دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی رسول اللہ صلعم کے ساتھ بدر اور خندق بیعۃ الرضوان اور تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے اور آپ کے بعد معرکہ یرموک میں شرکت کی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو بغیر مشورہ خلیفہ بناتا تو ابن ام عبد کو بناتا۔ حضرت ابن مسعودؓ کا خود ارشاد ہے کہ خدا کی قسم

قرآن کی کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس کے متعلق مجھے یہ علم نہ ہو کہ کہاں اُتری اور کس کے متعلق اگر مجھ کو یہ علم ہو جائے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو قرآن کا علم ہے اور سواری وہاں تک پہنچ سکے تو یقیناً اس کے پاس جا کر علم قرآن حاصل کروں تمام صحابہ اس سے اچھی طرح واقف ہیں کہ میں سب سے زیادہ قرآن کی بابت واقف ہوں حالانکہ میں سب سے بہتر نہیں ہوں (صحاح وغیرہ) غرض آپ کی وفات حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت ۳۲ھ مدینہ منورہ میں ہوئی۔ ایک طرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے یہ فضائل و کمالات اور قرآن سے گہرا تعلق کہ گویا وحی الٰہی کی گود میں پرورش پائی اور دوسری جانب جملہ فرق اسلامیہ کا اجماعی مسئلہ کہ قرآن عہد نبوی صلعم میں مدون اور مرتب ہو چکا تھا اور صحابہ نے اس کو متعدد بار آنحضرت صلعم کو سنا دیا تھا جو بجنسہ آج ہم تک محفوظاً اسی ترتیب پر ہے جو لوح محفوظ میں تھا اور جس کو ہم مدلل طور پر ثابت کر چکے ہیں۔ پھر بھی امام بغویؒ کے مندرجہ ذیل فقروں کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے لکھتے ہیں۔

الصحابۃ رضی اللہ عنھم جمعوا بین الدفتین القرآن الذی انزلہ اللہ علی رسولہ من غیر ان زادوا او نقصوا منہ شیئاً . . . . وکان رسول اللہ صلعم یلقن اصحابہ ویعلمھم فانزل علیہ من القرآن علی الترتیب الذی ھو الآن فی مصاحفنا بتوقیف جبریل ایاہ علی ذلک . . . . فان القرآن مکتوب فی اللوح المحفوظ علی ھذا الترتیب الخ

تیسری جانب یہ کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں تین سورتیں نہ تھیں اور بقول بعض (معاذ اللہ) ابن مسعودؓ اس کے قرآن ہونے کے قائل نہ تھے ابھی تک تو تین سورتوں کی توجیہات میں لوگ بلاوجہ پریشان تھے لیکن ہمارے کرم فرما شاہ معین الدین صاحب ندوی کو چوتھی سورۃ کی کمی کی فکر ہے کہ وہ کون سی سورۃ ہے؟ ملاحظہ ہو معارف جون ۱۹۴۹ء صفحہ ۲۲ اس کمی کی صحیح توجیہ اور تحقیق سے پہلے ہم ایک اور بات صاف کر دینا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ کہ شاہ صاحب موصوف نے حضرت ابی بن کعب کے مصحف کی سورتوں کی تعداد ابن ندیم وغیرہ سے ۱۱۶ نقل فرمائی ہے حالانکہ حسب تصریح

علامہ محمد صبیح مصری صحیح تعداد ۱۱۵ ہے کیونکہ حضرت اُبیؓ سورۃ الفیل اور سورۃ الایلاف کو ایک مانتے تھے۔ بہرکیف ایک سورہ زائد ہو یا دو جو جواب اور حل ایک کا ہوگا وہی دوسرے کا۔ حضرت اُبیؓ کا قنوت اللّٰھم انا نستعینک و نستغفرک الخ کا دو سورہ ماننا اور حفد و خلع کے نام سے موسوم کرنا جس طرح کتابوں میں پایا جاتا ہے اسی طرح یہ روایت ان عمر بن الخطاب قنت بعد الرکوع فقال بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اللّٰھم انا نستعینک و نستغفرک الخ قال ابن جریج حکمۃ البسملۃ انھما سورتان فی مصحف بعض الصحابۃ۔ کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے تاکہ آیندہ توجیہات کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

اصل یہ ہے کہ مورخین حتیٰ کہ ارباب سیر تک کی روایات میں عموماً بے سروپا باتیں ہوتی ہیں نہ راویوں کا پتہ نہ جرح و تعدیل سے سروکار نہ اتصال و انقطاع کی خبر اگر بعض نے سلسلۂ اسناد کا اعتبار کیا ہے تو یہ بھی رطب و یابس کی تفریق کئے بغیر ہر غث و ثمین کو درج کر دیا ہے خواہ وہ ابن ندیم ہوں یا سیوطی، ابن اثیر ہوں یا ابن قتیبہ، ابن سعد ہوں یا ابی الحدید، طبری ہوں یا واقدی وغیرہم ان غیر مستند روایات اور بیانات کو ایک قطعی الثبوت شے کے مقابل لانا کب لائق اعتنا ہو سکتا ہے غور کا مقام ہے کہ کلام ناس اور کلام رب الناس میں جو بون بعید ہے وہ ظاہر ہے نیز جو فرق اسلوب کلام الٰہی اور کلام نبوی میں پہلے ہم بیان کر آئے ہیں اس کو تسلیم کرتے ہوئے دعائے قنوت اللّٰھم انا نستعینک الخ کی قرآنیت کو تسلیم کرنا اور پھر محدثین کرام کا اس قنوت پر گفتگو کرنا اور بعض کا عدم صحت کا حکم دینا سنن و آثار نبوی کے اندر موجود ہے کیا حقیقت رکھتا ہے؟ اور کیا یہ وہی قرآن تھا اور قرآن کی سورہ کہ جس کی تحدی سے خالص اہل عرب عاجز تھے جس کا خبر رسول ہونا محل بحث میں ہو اس کا قرآن کی سورہ کے نام سے نقل کرنا ابن ندیم اور سیوطی ہی جیسے حاطب اللیل کا کام ہو سکتا ہے نہ کہ ایک دقیقہ رس محقق کا۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ سیوطی نے امام زرکشی کی کتاب کو نوچ کھسوٹ کر اتقان کو مرتب کیا ہے اور کتنی باتیں گھٹائی اور بڑھائی ہیں مانا کہ بعض بعض جگہ رد بھی کیا ہے اور کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ یہی حال ابن ندیم کا ہے اور کہنا پڑتا ہے ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

بات یہ ہے کہ اس طرح کی جو روایات ملتی ہیں ان کا مرتبہ خبر آحاد سے آگے نہیں بڑھتا علمائے اصول نے اس کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے اور اس طرح کی جملہ روایات یا تو کسی آیت کی شرح و تفسیر ہے یا قرارۃ اور مذاکرات ہیں جن کو اصحاب مصاحف قدیمہ نے لکھ لیا ہے موطا امام مالک میں بسند صحیح یہ روایت موجود ہے جس میں یہ فقرہ ہے حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطی وصلوۃ العصر وقوموا للہ قانتین۔ یہ روایت بھی اسی قبیل کی ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ نے آں حضرت صلعم سے بطور تفسیر و تشریح کے سنا تھا اور اپنے مصحف میں درج کر رکھا تھا نہ کہ قرآن سمجھ کر اسی طرح کی روایات اور تشریحات کو بعد کے لوگوں نے اپنے مصاحف کے اندر یعنی متن کے ساتھ درج کر لیا ہے چنانچہ کتاب اختلاف مصاحف اھل المدینۃ واھل الکوفہ واھل البصرہ عن الکسائی وکتاب اختلاف المصاحف لخلف، وکتاب اختلاف اھل الکوفہ والبصرہ والشام فی المصاحف للفراء، وکتاب اختلاف المصاحف لابی داؤد السجستانی، وکتاب اختلاف المصاحف وجمیع القراءات للمدائنی، وکتاب اختلاف المصاحف الشام والحجاز والعراق لابن عامر الیحصبی، وکتاب محمد بن عبد الرحمن الاصفہانی فی اختلاف المصاحف ہمارے بیان پر شاہد عدل ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے اور تاریخی حقیقت بھی ہے جس کی تائید میں صحیح روایات موجود ہیں وہ یہ کہ اہل حمص نے یہ خیال کیا کہ ہم لوگ جس قرأت پر قرآن پڑھ رہے ہیں وہ دوسرے لوگوں کی قرأت سے بہتر ہے کیونکہ انھوں نے حضرت مقدادؓ سے قرآن سیکھا تھا۔ اہل دمشق بھی انھیں کی تائید میں تھے۔ اسی طرح اہل کوفہ کا خیال تھا اور یہ لوگ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو ترجیح دیتے تھے اور اہل بصرہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے تمسک کرتے تھے چنانچہ ان کے مصحف کا نام (لباب القلوب) رکھا گیا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اس اختلاف کو محسوس کر کے حضرت حفصہؓ رضی اللہ عنہا کے پاس سے وہ قرآن طلب فرمایا جو عہد نبوی میں لکھا جا چکا تھا اور اس کی نقلیں ممالک اسلامیہ میں بھجوا دی گئی تھیں

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کا یہ وہ کارنامہ ہے جس پر تاریخ اسلام قیامت تک ناز کرسکتی ہے اور یہی وہ بات ہے جس کو قاضی ابوبکر انتصار میں فرماتے ہیں انما قصد جمعھم علی القراءات ... الثابتة المعروفة عن النبی صلعم والغاء ما لیس کذلك ... خشیة دخول الفساد والشبھة علی من یاتی بعد"

لہذا حضرت ابی بن کعب کے مصحف میں ایک یا دو سورتوں کی زیادتی بھی یہیں سے ختم ہوجاتی ہے کیونکہ حسب تصریح ارباب سیر وتاریخ حضرت ابیؓ کی وفات عہد فاروقی میں مدینہ کے اندر ہوگئی ہے اور نقل مصاحف کی تاریخ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ثابت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت عثمانؓ کے سامنے حضرت ابی کا مصحف نہ رہا ہو یقینا تھا جیسا کہ "سعد السعود" لعلی بن محمد میں ہے

• نقلا عن کتاب ابی جعفر محمد منصور ورواية محمد بن زید بن مروان فی اختلاف المصاحف ان القرآن جمعه علی عهد ابی بکر زید بن ثابت وخالفه فی ذلك ابی وعبد الله بن مسعود ... واخذ عثمان مصحف ابی وعبد الله بن مسعود .. . فغسلهما وکتب عثمان مصحفا لنفسه، ومصحفا لاهل المدینة، ومصحفا لاهل مکة، ومصحفا لاهل الکوفة، ومصحفا لاهل البصرة، ومصحفا لاهل الشام۔

ان شہادتوں کے بعد حضرت ابیؓ اور ابن مسعودؓ کے مصاحف کے اندر سورتوں کی کمی بیشی کی پھر کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے فاعتبروا یا اولی الابصار

رہ گئی یہ بات کہ حضرت ابیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے مرتب کردہ مصاحف ابن ندیم اور سیوطیؒ نے خود دیکھے تھے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مرتب کردہ قرآن تو شیخ زنجانی نے ۱۳۵۳ھ میں نجف کے اندر خط کوفی میں لکھا ہوا دیکھا ہے جس کے آخر میں تحریر ہے کتبه علی بن ابی طالب فی سنة اربعین من الهجرة۔ اگر یہ مشکوک ہے تو ابن ندیم و سیوطی کا دیکھنا کیوں نہ مشکوک مانا جائے بس سب مشکوک ہیں اور قطعی وہی قرآن ہے جو حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ وغیرہم کے حروب باہمی میں طلب حکم، خونریزی سے بچنے اور صلح وامان کے لئے اوپر اٹھایا گیا تھا وہی قرآن تھا اور ہے

جو عہد عثمانی میں آفاق عالم میں پھیلوا یا جا چکا تھا اور عہد عثمانی میں صحابہ کا اس پر اتفاق اور اجماع ہو چکا تھا چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی اس لجنۂ عثمانیہ میں موجود تھے ملاحظہ ہو التبیان فی آداب حملۃ القرآن (نووی) اور امامیہ کے مسلم الثبوت مجتہد و محدث علامہ عبداللہ زنجانی کی تاریخ القرآن۔

مذکورہ بالا تحقیقات کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی جانب جو غلط انتسابات ہیں ان کی حقیقت واضح ہو جاتی اور مزید کاوش کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے لیکن حسب وعدہ عروس قرآن کے چہرے سے اس گرد و غبار کو بھی پاک کرنا ایک دینی اور علمی خدمت ہے جو بدقسمتی سے اپنے ہی بزرگوں کے عدم تدبر کی بنا پر اسفار حدیث میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔

(۱) قال ابن حجر فی شرح البخاری قد صح عن ابن مسعود انکار المعوذتین فاخرج احمد و ابن حبان عنہ انہ کان لا یکتب المعوذتین فی مصحفہ۔

(۲) اخرج غیرہ ان عبداللہ بن مسعود کان یحک المعوذتین من مصاحفہ ویقول انھما لیستا من کتاب اللہ۔

(۳) اخرج البزار والطبرانی من وجہ آخر ان ابن مسعود کان لا یقرء بھما وکذلک کان یری ھذا الرای فی فاتحۃ الکتاب۔

اس لئے حضرت ابن مسعودؓ کے مصحف میں سورتوں کی کل تعداد ۱۱۱ ہوتی ہے نہ کہ ۱۱۰۔ جن کتابوں میں ایک سو دس منقول ہے وہ یا تو سہو کاتب ہے یا غلط ہے لہذا تین کے بجائے چار کمی کو ماننا اور معوذتین و فاتحہ کے علاوہ کو پوچھیا ابن ندیم اور سیوطی کی تقلید کی بنا پر ہے نہ کہ تحقیق۔ واللہ اعلم۔

شیخ ابن حجر کی روایت پرستی مشہور ہے اس لئے ہم خود اس سے زیادہ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات سمجھتے ہیں البتہ امام ابو محمد علی بن حزم اندلسی کی تحقیق جن کے متعلق ابن بشکوال کی شہادت ہے کان ابو محمد اجمع اھل الاندلس قاطبۃ لعلوم الاسلام واوسعھم معرفۃ۔

اور حافظ ابو عبداللہ حمیدی کا یہ فقرہ ما رأینا مثلہ (التاج المکلل) جلالت علم و تحقیق کے

نے سب سے بڑی دستاویز ہے۔ مذکورہ بالا روایات پر نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں علامہ ابن حزم فرماتے ہیں ھذا کذب علی ابن مسعود وموضوع۔ یعنی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی جانب جن مذکورۂ بالا سورتوں کے قرآنیت کا انکار بیان کیا جاتا ہے یہ جھوٹ اور گڑھی ہوئی جعلی روایات ہیں۔

شیخ نووی شارح مسلم کا ارشاد ہے ان المسلمین اجمعوا علی ان المعوذتین والفاتحۃ من القران، ومن جحد منھا شیئا کفر۔ وما نقل عن ابن مسعود باطل لیس بصحیح (شرح المہذب)

امام نووی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ ابن مسعودؓ سے جو نقل کیا جاتا ہے لغو اور باطل ہے اور ہرگز اس طرح کی روایات صحیح نہیں ہیں۔ اور جو قرآن کے کچھ حصہ کا انکار کرے وہ کافر ہے۔

امام فخرالدین رازیؒ فرماتے ہیں ان ابن مسعود کان ینکر کون سورۃ الفاتحۃ والمعوذتین من القران، وھو قول فی غایۃ الصعوبۃ . . . . والاغلب علی الظن ان نقل ھذا المذھب عن ابن مسعود نقل باطل

ظاہر ہے کہ صحابہ کے عہد مبارک میں جب متواتراً ان سورتوں کا قرآن ہونا مسلم ہو چکا تھا تو پھر انکار کے کیا معنی گویا معاذ اللہ، قرآن کا متواتر ہونا اس وقت ثابت نہ تھا حالانکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں لہذا تواتر کے بعد انکار کفر کے مرادف ہے اور یہ بات ابن مسعودؓ کی طرف جو منسوب کی جاتی ہے بے اصل اور لاطائل ہے۔

احادیث کے تتبع سے بھی مذکورہ بالا تحقیقات پر روشنی پڑتی ہے خود موطا امام محمد میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ روایت موجود ہے واذا صلی وحدہ قرء فی الاولیین بفاتحۃ الکتاب وسورۃ الخ۔ اس سے تو معلوم ہوا کہ ابن مسعودؓ اسی طرح فاتحہ کو قرآن کی سورہ مان رہے ہیں جس طرح دوسری سورتوں کو۔ فتامل وتدبر۔

ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں کہ جب عثمان غنیؓ نے تمام ممالک محروسہ میں عہد نبوی کے مدون قرآن مجید کی نقلیں بھیج کر آئندہ کے سارے جھگڑے ختم کر دئے تو پھر ابن مسعودؓ کے مصحف میں کمی کا سوال کوئی وقعت نہیں رکھتا کیونکہ ابن مسعودؓ کی وفات ۳۲ھ میں ہوئی ہے اور حضرت عثمان کی شہادت کا واقعہ

[illegible] کے بعد غالباً [illegible] کا ہے اور ظاہر ہے کہ نقل قرآن کی تاریخ شہادت سے بہت پہلے کی ہے
یعنی [illegible] یا باختلاف روایت [illegible] پس اگر کسی کو اصرار ہی ہو کہ مصحف ابن مسعودؓ میں مزید چند
سورتوں کی کمی تھی اور اپنے ثبوت میں انھیں کمزور اور واہیات، باطل اور موضوع روایتوں اور تاریخی کتابوں
سے استدلال کرے تو ہم کو یہ حق حاصل ہے کہ جہاں سے تم کو یہ بے سر و پا باتیں ملی ہیں وہیں یہ فقرہ بھی
ہے فوقف فیعلم عبد اللہ یامرھم بالھدی والتزام الطاعۃ یعنی لجنۂ عثمانیہ میں اصحاب ابن مسعودؓ
کو جب حضرت عثمانؓ کے مصحف "الامام" میں کچھ توقف ہوا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنی
پارٹی کو عثمان غنیؓ کے مصحف کی اطاعت کا حکم دیا اور خاموشی پر مجبور کر دیا۔ لیجئے "جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی"
البتہ شیخ ابن حجر کا یہ فرمانا "صحح ابن مسعود انکار المعوذتین" کو کیسے غلط مان لیا جائے
کیونکہ حافظ ابن حجر کا تبحر مسلم ہے تو پھر ابن حجر، قاضی ابوبکر باقلانی، صاحب روح المعانی، صاحب
فواتح الرحموت، فرید وجدی اور صاحب شرح مواقف وغیرہم کی توجیہات کو کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے
ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو بھی ان سورتوں کے کلام اللہ ہونے میں قطعاً شبہ نہ تھا وہ
وہ مانتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور لاریب آسمان سے اترا ہے مگر ان کے نازل کرنے کا مقصد رقیہ
اور علاج تھا معلوم نہیں کہ تلاوت کی غرض سے اتاری گئی یا نہیں اس لئے ان کو مصحف میں درج کرنا
اور قرآن میں شامل کرنا جس کی تلاوت نماز وغیرہ میں مطلوب ہے خلاف احتیاط ہے حالانکہ عبداللہ بن مسعودؓ
کے اس فعل سے بھی کسی صحابی نے اتفاق نہیں کیا۔ اسی بنا پر اجماع ہو گیا۔ فتلک الآحاد مما لا یلتفت
الیہ لہٰذا قرآن آج بھی وہی ہے جو لوح محفوظ میں تھا باقی غلط خلاصہ یہ کہ یہ ہے صحت قرآن کی علمی و تاریخی
تحقیق کا ایک ادنیٰ اشارہ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ۔

ان بزرگوں کے اسماء گرامی جنہوں نے کم سے کم تین حفظ کیا

اغانی اور اصابہ کے اندر موجود ہے کہ فرزدق کو جریر ہمیشہ پاؤں میں بیڑی پڑے ہونے کا
عار دلایا کرتا تھا لوگوں نے اس کا سبب پوچھا۔ فرزدق شاعر نے کہا کہ ایک بار
میں اپنے والد کے ہمراہ جنگل کی طرف گیا وہاں حضرت علیؓ نے میرے باپ سے کہا کہ اپنے لڑکے کو قرآن مجید
حفظ کراؤ چنانچہ جب تک میں نے حفظ نہیں کیا بیڑی پڑی رہی۔ چنانچہ فرزدق نے ایک سال میں حفظ

کیا اور ذیل کے شعر میں اپنے اسی واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے ؎

وما صب حلی فی حدید مجاشع مع القید الا حاجۃ لی ارید ھا

مجاشع کی بیڑی جو میرے پیروں میں پڑی تھی اس کی وجہ صرف ایک مقصد تھا جسے میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔

باقی اسماء یہ ہیں۔ ہشام بن کلبی نے تین روز میں قرآن حفظ کیا (تذکرۃ الحفاظ)۔ سفیان بن عیینہ نے چار سال کی عمر میں حفظ کیا (قسطلانی)۔ قاضی ابو محمد اصفہانی نے پانچ سال کی عمر میں حفظ کیا (ملا علی قاری)۔ امام شافعیؒ نے سات سال کی عمر میں حفظ فرمایا (تاریخ الخمیس)، سہل بن عبداللہ تستری نے چھ سال کی عمر میں حفظ کیا (خزینۃ الاصفیاء)۔ میر سید اشرف سمنانی نے سات سال کی عمر میں حفظ کیا (خزینۃ الاصفیاء)۔ جلال الدین سیوطی نے آٹھ سال کی عمر میں حفظ کیا (حسن المحاضرہ) مولانا سید صدامین نصیر آبادی نے نو برس کی عمر میں ایک سال کے اندر اندر حفظ کر لیا (یادگار سلف)

مذکورہ بالا اسماء حفاظ کے نقل کرنے کا مدعا ہے کہ آج درسِ قرآن کا بڑا زور اور شور ہے مگر حفظ قرآن پر کوئی توجہ نہیں درس قرآن ضرور بہتر چیز ہے مگر آج درس کون دے رہا ہے؟ وہ جس نے نہ تو اساتذہ سے پڑھا اور نہ ادب عربی سے اتنی ممارست ہے کہ تفسیروں کو سمجھ سکے یہ نہایت خطرناک قدم ہے اور جس کا مشاہدہ آج ہر ہر قدم پر ہو رہا ہے۔ یہ فریضہ اہل علم کا ہے نہ کہ کالج کے صاحبزادوں کا۔ سچ ہے ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی "اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی" البتہ قرآن سے نصیحت حاصل کرنا بالکل آسان ہے لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ قرآن محض ایک سطحی کتاب ہے بھلا اس علیم و خبیر کے کلام کے متعلق ایسا گمان کیوں کر کیا جا سکتا ہے جس پر عمریں بیت گئیں اور صدیاں گذر گئیں مگر اللہ تعالیٰ کے غیر متناہی علوم کے عجائب و اسرار ختم نہ ہو سکے خود اس کتاب الٰہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک انسان یا کمیٹی کی بنائی ہوئی نہیں بلکہ اس خدا کی اتاری ہوئی ہے جس کے احاطۂ علمی سے زمین و آسمان کی کوئی چیز باہر نہیں ہو سکتی، اس کلام کی معجزانہ فصاحت و بلاغت، علوم و معارف اخبار غیبیہ، احکام و قوانین، اور وہ اسرار خفیہ جن کی تہ تک بدون توفیق الٰہی کے عقول و افہام انسانی

کی رسائی نہیں ہو سکتی اور اس کتاب کی تاثیر اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ کسی محدود علم والے آدمی یا سازشی جماعت کا کلام نہیں مستشرقین یورپ اور ان کے مقلدین کا مبلغ علم سطحی اور قشر تک محدود ہے ان کی ساری کاوش عقلی نظریات، احصار و ترتیب، جمع اور تفریق قرآن تک ہے لیکن مغز قرآن سے ان کو دور کا علاقہ نہیں نہ قرآن کی موسیقیت و جاذبیت، اسلوب اور اعجاز سے کوئی سروکار ہے اور نہ تاثیر اور کلام کی قدوسیت سے بہرہ۔ بقول سنائی ؒ؎

عروسِ حضرت قرآں نقاب آنگہ براندازد ۔۔۔ کہ دار الملک ایماں را مجرد بیند از غوغا

پھر عروسِ قرآن اپنے جمال جہاں آرا کے نقاب کشائی کی تقریب کرے تو کیوں کر کرے یا تو پھر اصمعی جیسے ماہر کلام عرب سے پوچھو کہ قرآن کیا ہے جو نہ حافظ تھا اور نہ اسرار تشریعی کا عالم مگر جب سورۂ مائدہ کی یہ آیت کریمہ کسی نے پڑھی السارق والسارقۃ الخ اور بجائے عزیز حکیم کے غفور الرحیم پڑھ دیا تو چونک اٹھا اور کہا کہ ذرا قرآن لاؤ یہاں غَفُوْرُ الرَّحِیْم کا موقع نہیں ہے کیا بات ہے چنانچہ قرآن دیکھا تو عزیز حکیم تھا پھڑک اٹھا کہ اگر یہ نہ ہوتا تو خدا کے کلام ہونے میں مجھ کو شک ہو جاتا خیر اس باریک نکتہ کو تو اصمعی ہی سمجھ سکتا ہے یا جس کو اللہ تعالیٰ کلام پر بصیرت و حذاقت بخشے لیکن آج بھی جب ایک حافظ پڑھتے پڑھتے بھول جاتا یا الٹ پلٹ کر دیتا ہے تو غیر حافظ کو کھٹک پیدا ہو جاتی ہے اور بغیر مراجعت قرآن چین نہیں آتا۔ یہ صرف کلام الٰہی اور اس قرآن کی خصوصیت ہے جو لفظاً و معنیً اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے۔ جس کے آج ہزاروں لاکھوں حافظ موجود اور بقول حضرت ربیع بن انس صدورھم اناجیلھم (خازن) ان کے سینے گویا کتب منزلہ ہیں۔ بَلْ ھُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ۔ جس طرح جمع صدر پر شاہد عدل اسی طرح وَقَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اکْتَتَبَھَا فَھِیَ تُمْلٰی عَلَیْہِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا جمع کتابی پر واضح شہادت ہے اگر زمانہ نے مساعدت کی اور پیش نظر کاموں سے فرصت ہو گئی تو ان شاء اللہ بعض دوسرے اہم مباحث اضافہ کر کے دلائل القرآن کو مکمل کروں گا سردست اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا۔ والسلام علی من اتبع الہدیٰ

دربارِ الٰہی اسلام کی نظر میں

از

(جناب مولوی محمد ظفیر الدین صاحب استاذ دارالعلوم معینیہ سالم)

زیر ترتیب کتاب "نظام مساجد" کے دو باب مختلف عنوانوں کے تحت آپ "برہان" میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، آج اسی کتاب کا ایک تیسرا باب پیش خدمت ہے۔ (برہان)

مساجد کے اجتماعی نظام کی مختصر تفصیل گذشتہ صفحات میں آپ نے ملاحظہ فرمائی، جس سے ان گھروں کی دینی اور دنیوی اہمیت کا اندازہ ہوا ہوگا، اور آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ان کا وجود ہمارے لئے کس قدر ضروری ہے اور قدرت نے اس سلسلہ کو قائم و دائم فرما کر ہم پر کتنا احسان کیا

اب بتانا ہے کہ اسلام نے ان مقدس درباروں کو کیسے سراہا ہے اور ان کی قدر و منزلت کس پیرایہ میں بیان کی ہے، یکسر ان کو مشکوٰۃ نبوت کی روشنی میں دیکھئے اور کتاب الٰہی میں تلاش کیجئے

سب سے پہلے اس سلسلہ میں کتاب الٰہی کی چند آیتیں درج کی جاتی ہیں جن میں صاف لفظوں میں ان کی شرافت و قبولیت کا اعلان کیا گیا ہے، اور ان کی ظاہری و باطنی وقعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،

مساجد خدا کی ہیں | دنیا اور دنیا کی ساری مخلوقات اللہ تعالیٰ کے قبضہ و قدرت میں ہیں اور سب کی سب اسی کی قدرت سے خلعتِ وجود سے ممتاز ہیں، دنیا کا کوئی ذرہ ایسا نہیں ہے، جس کو کہا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ نہیں، لیکن جس کو اللہ تعالیٰ خود کہہ دے "یہ میرا ہے" اس کی قسمت کا کیا کہنا اس کی عزت و قبولیت اپنا ایک خاص مقام حاصل کر لیتی ہے جو دوسرے کے حصہ میں نہیں ہے

انہی میں یہ مقدس دربار بھی ہیں جن کو ہم "مسجد" کے مختصر لفظ سے تعبیر کرتے ہیں ان کی نسبت رب العزت نے اپنی جانب فرمائی ہے اور ان کو اپنے ذکر کے لئے مخصوص فرمایا ہے، جیسا کہ اس کی ارشاد

کی شرکت منظور نہیں۔

اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (جن۔۲) مسجدیں اللہ ہی کی ہیں پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔

بلاشبہ یہ نسبت ساری دوسری نسبتوں سے بڑھ کر ہے اور اس نسبت سے جو شرافت اور بزرگی حاصل ہوتی ہے وہ اور شرافتوں سے بالاتر، پھر تخصیص کی مزید عزت اس کی وقعت و اہمیت کا زبردست مظاہرہ ہے۔

مساجد کی خدمت | کسی کو جب اپنا بنا لیا جاتا ہے تو پھر یہ گوارا نہیں ہوتا ہے کہ اس کو اس کے حوالہ کر دیا جائے، جو اس کا مخالف ہو، کیونکہ جب اس کو مالک سے عقیدت نہیں، دل میں اس کی خشیت و محبت نہیں اور وہ اس کے احکام پر اطاعت کا سر رکھنے والا نہیں ہے تو یقینی طور پر وہ اپنی مفوضہ خدمت کو حسن و خوبی ادا کرنے میں کوتاہی سے کام لے گا، پس یہ بات ظاہر ہو گئی کہ مشرکوں اور نافرمانوں کو جب مسجد اور اس کے مالک سے قلبی لگاؤ نہیں تو اس مسجد کی خدمت رب العزت ان کے ہاتھ میں کیوں کر چھوڑے گا، ارشاد فرمایا

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ (توبہ۔۳) مشرکوں کی لیاقت نہیں ہے کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں جس حالت میں کہ وہ اپنے اوپر کفر و انکار کا اقرار کر رہے ہیں۔

یہ دربار الٰہی کے احترام کا اظہار ہے تاکہ ان گھروں کی قدر و منزلت دلوں پر نقش ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ یہ گھر اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں ان کی وہی خدمت کریں جو خدا کے دوست ہوں جن کے دل میں اس کی خشیت و محبت گھر کر چکی ہو تاکہ وہ ان کے بنانے میں عقیدت و محبت کی پونجی صرف کر سکیں اور یہ سمجھ کر خدمت کے لئے کمر باندھیں کہ یہ دنیا کے پروردگار کا گھر ہے اور اس کے جاہ و جلال اور اس سے عرش دنیا کا دربار،

حق خدمت مومن کامل کو | یہی وجہ ہے کہ رب ذو الجلال والاکرام نے جن کو حق تعمیر تفویض کیا ہے، ان کے لئے ظاہری

اور معنوی دونوں طرح کی پابندی رکھی ہے یعنی ان کا دل اور باطن بھی مومن ہو اور ظاہر اور جسم بھی، قلب ایمان کی دولت سے معمور ہو تو جسم عمل کی دولت سے مالامال۔

إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَوٰةَ وَآتَى الزَّكَوٰةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ (توبہ-۳)

اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا انہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں پس انہی سے توقع ہے کہ مقصود کو پہنچ جائیں۔

"ایمان باللہ" لاکر بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے اس کو سچی عقیدت ہو، اور اپنے کو صحیح معنیٰ میں احکام الٰہی کے تابع قرار دے لے اور "آخرت پر ایمان" سے یہ ظاہر فرمایا گیا کہ اس کو اپنے سارے کاموں کے حساب و کتاب کی ذمہ داری کا پورا احساس بھی ہو اور پھر اس میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب و عقاب کا یقین بھی، یہ دل اور نیت کی اصلاح کی شرط ہے باقی ظاہری طور پر بھی وہ ایسا ہو جس سے خدا پرستی نمایاں ہو، بدنی اعتبار سے بھی اور مالی لحاظ سے بھی، جس کو "اقامت صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کاموں میں شہرت و عزت اور ریا و سمعہ کا فریب آجاتا ہے اس لئے یہ بھی فرما دیا گیا کہ یہ سب کسی اور کے خوف سے نہ ہو بلکہ جو کچھ ہو، رب العزت کی خشیت سے ہی ہو جس کو "وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ" کے مختصر جملہ میں بیان فرمایا ہے، ماحصل یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت چاہے وہ ذہنی ہو چاہے خارجی اللہ تعالیٰ کی خشیت غالب رہے،

کوئی جب ان ساری خصوصیتوں سے سرفراز ہو کر دربار الٰہی کی خدمت انجام دے گا تب کہیں جاکر وہ اس کام میں حق راستہ کو پائے گا اور یہ کھلی حقیقت ہے کہ ان میں سے شاید کوئی خصوصیت بھی مشرک میں نہیں پائی جاتی، بخلاف مومن کے، کہ وہ کسی نہ کسی درجہ میں ضرور ان کا حامل ہوتا ہے بار بار غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسجد کی خدمت کے لئے ان قیود کو کیوں بیان فرمایا، کیا ان

سے مسجدوں کی عظمت و شوکت کا اظہار نہیں ہوتا ہے۔

یعمر کے معنی | "یعمر" کا لفظ بہت سے معنوں کو شامل ہے۔ کرخیؒ فرماتے ہیں

انما یعمر مساجد اللہ ای بنحو البناء	انما یعمر مساجد اللہ کے معنی ہیں جیسے بنانا، فرش
والتزین بالفرش والسراج	اور روشنی سے زینت دینا، عبادت کرنا اور
وبالعبادۃ وترک حدیث الدنیا	دنیا کی باتیں مسجد میں نہ کرنا۔

(جمل ص ۲۷۱ ج ۲)

مسجد کی تعظیم و تکریم اور اس میں عبادت | اوپر کی آیتوں میں مسجدوں کی بنیادی حیثیت ظاہر کی گئی ہے اب ان کے عملی پہلو پر نظر کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کیا مقصد رکھا ہے اور وہ ان گھروں میں کیا چاہتا ہے کیونکہ کسی چیز کی تعمیر خود مقصود بالذات نہیں ہوتی، بلکہ اس کے اغراض و مقاصد اور اس کے مصالح و حکم مطلوب ہوتے ہیں، ارشاد ربانی ہے۔

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ	ان گھروں میں حکم دیا اللہ نے کہ ان کی تعظیم کی جائے
وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا	اور ان میں اس کا نام لیا جائے اور صبح و شام اس
بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (نور۔ ۵)	کی پاکی بیان کریں۔

اس آیت میں "بیوت" سے مراد مسجدیں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بیان فرمایا ہے کہ ان کی تعمیر کے بعد یہ فریضہ ہے کہ ان کی تعظیم و تکریم کا حق ادا کریں اور اس میں یہ بھی ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی یاد ہوتی رہے اور دن رات اس کی تقدیس بیان کی جائے اور ہمہ دم اسے تسبیح و تہلیل سے آباد رکھا جائے، اگر اس میں کوتاہی ہوئی تو پھر مسجد کا حق پورا پورا ادا نہ ہوا اور یہ سب اس طرح سے ہو کہ دل و دماغ پر یہ امر مستحضر رہے کہ ہم اللہ کے گھر میں ہیں، تاکہ دربار الٰہی کے آداب میں فرق نہ آنے پائے، بلکہ آداب کا خیال اس کی لذت کو دو چند کر دے اور اگر یہ نہ ہو تو پھر اس کو یقین کر لینا چاہئے کہ تعظیم و تکریم کے لوازمات اس کو میسر نہیں ہیں۔

بہر حال یہ بات تو روشن ہوگئی کہ مسجدوں کا وجود اس لئے عمل میں آیا کہ ان میں ذکر اللہ کی

گو نج ہواوراں میں پہنچ کر رب العزت کا دھیان تازہ ہو جائے، اور جس جگہ اتنا اہم کام ہو کہ اسی نے اس کا وجود عمل میں آیا ہو اس کی اہمیت کتنی ہوگی یہ ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

اخلاص للٰہیت | پھر اللہ کی یاد ہو تو کس طرح ؟ کہ ظاہر سے زیادہ باطن پر اثر انداز ہو، یاد الٰہی میں یہاں کسی کی ذرہ برابر آمیزش نہ ہونے پائے، اور دل اخلاص کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا ہوا ہو، یوں تو یاد خدا جہاں بھی ہو خالص ہی ہو لیکن خصوصیت سے اس جگہ اور بھی خلوص وللٰہیت کا جذبہ کارفرما ہونا چاہئے، کہ یہ دربار الٰہی ہے، اور محبوب حقیقی کا جلوہ آنکھوں کے سامنے ہے،

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ	اور تم اپنا چہرہ ہر مسجد کے پاس سیدھا رکھا کرو اور
وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (اعراف ۳)	اللہ تعالیٰ کی عبادت مخلص بن کر کیا کرو۔

مسجدوں کی بڑائی کے ذکر کا یہ بھی ایک پیرایہ ہے کہ وہاں پہنچ کر دل میل کچیل سے پاک کر لو اور نیت کے کل پرزے اخلاص کے آب زمزم سے دھو ڈالو تاکہ کہیں سے شرک کی بو نہ آنے پائے کیونکہ یہ وہ دربار ہے جہاں خدا سے سرگوشی ہوتی ہے اور یہی وہ گھر ہے جس کو دنیا کی جنت سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہیں،

طہارت ونفاست | باطن میں جس عقیدہ نے جڑ پکڑ لی، ظاہر میں اس کے برگ وبار پیدا ہونے ضروری ہیں جس کی عزت ہم دل میں کریں گے یقینی طور پر عمل سے اس کو ظاہر بھی کرنے کی کوشش کریں گے یہی وجہ ہے کہ درجۂ کمال میں ایمان واسلام ایک ہو جاتے ہیں، ایک طرف تصدیق بالجنان کا حکم ہے تو دوسری طرف عمل بالجوارح کا بھی مطالبہ موجود ہے، تو جب قرآن نے مساجد کے باطنی احترام کا حکم فرمایا، تو ساتھ ہی ظاہری احترام کو بھی نہ چھوڑا، ارشاد فرمایا

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ	اے آدم کے بیٹو! مسجد کی ہر حاضری کے وقت
كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف ۳)	اپنا لباس زینت پہن لیا کرو۔

یعنی جب عرض ونیاز کے لئے، مناجات اور سرگوشی کے لئے دربار الٰہی میں آؤ تو صاف ستھرا لباس زیب تن کر لیا کرو، جو پاک وصاف اور شرعی حدود کے مطابق ہو، تم احکم الحاکمین کے سامنے

اس کے دربار میں حاضری دے رہے ہو تو ظاہری آداب کا بھی پورا پورا لحاظ رکھو، تاکہ ظاہری طور پر بھی کسی کو بے ادبی کا شبہ نہ ہو سکے، یہ درست ہے کہ وہ پہلے دل کی گہرائی کو دیکھتا ہے مگر دل کی صفائی کا اثر جسم پر ہونا بھی ضروری ہے اس میں ذرہ بھر شک نہیں کہ دل کی ویرانی کے ساتھ جو زیب و زینت ہوتی ہے وہ کسی درجہ میں مطلوب نہیں۔

لیکن موجودہ دور میں دین کی عدم محبت کی وجہ سے لباس میں جو بے پروائی ہوتی ہے وہ بھی کسی درجہ میں پسندیدہ نہیں ہے، اس آیت سے مسجد کے لئے حسن ھیئت کا حکم بھی مستفاد ہوتا ہے جو مسجد کی بزرگی و احترام کا ایک دلنشین طریقہ ہے، تفسیر ابن کثیر میں ہے اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نماز کے وقت ھیئت اچھی سے اچھی ہونی چاہئے،[۱]

صاحب تفسیرات احمدی لکھتے ہیں

ومن السنة ان یاخذ الرجل	سنت ہے کہ نماز کے لئے اچھی سے اچھی ھیئت
احسن ھیئة للصلوٰة وفیہ	اختیار کرے اور اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ نماز
دلیل علی وجوب ستر العورة	میں ستر عورت واجب ہے۔

فی الصلوٰة (ص۲۱۱)

بہر حال قرآن پاک نے مسجدوں کی تعظیم و تکریم کے دونوں پہلو بیان کئے ہیں اور ان کی قدر و منزلت کو ہر طرح ذہن نشین کرنا چاہا ہے

مسجد کا مخالف سب سے بڑا ظالم ہے مسجدوں کی عظمت شان کا یہ بھی طریقہ ہے کہ جو ان کی مخالفت کرے وہ عنداللہ معتوب قرار پائے اور واقعہ ہے کہ جس کو خدا ظالم کہے اس سے بڑھ کر معتوب عنداللہ کون ہو سکتا ہے چنانچہ ایک آیت میں یہی بیان ہے کہ جو دربار الٰہی کی مخالفت کسی طرح بھی کرتے ہیں وہ سب سے بڑھ کر ظالم ہیں، کیونکہ ان کی عظمت کا حال تو یہ ہے کہ جب ان میں داخلہ ہو تو خشیت الٰہی اس پر چھائی ہوئی ہو،

---

[۱] ابن کثیر ج۲

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا ۚ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (بقرہ - ۱۴)

اس سے بڑھ کر اور کون ظالم ہوگا، جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں ذکر اللہ کو بند کرادے اور اس کی ویرانی کی کوشش کرے، ان لوگوں کو تو کبھی بے باک ہو کر ان میں قدم بھی رکھنا نہ چاہتے، ان کی دنیا میں بھی رسوائی ہوگی اور آخرت میں بھی ان کی سزا سخت ترین ہوگی

شانِ نزول میں اگرچہ یہ آیت خاص ہے مگر اپنے حکم میں عام ہے، اور تمام مسجدوں کا یہی حکم ہے، جو کوئی بھی مقاصدِ مساجد کی تکمیل میں مانع بنے گا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی یاد کو قصداً روکے گا موردِ عذاب ہوگا، اور عند اللہ وہ بڑا ظالم قرار پائے گا، اس میں شبہ نہیں ہے کہ اپنے حال کے اعتبار سے کفر و شرک ہی ظلم عظیم ہے مگر اس لحاظ سے کہ تخریبِ مساجد کے خواہاں دوسروں کو ہدایت سے روکتے ہیں اور اسلام کے ایک بڑے شعار کو مٹاتے ہیں وہ اپنے اس فعل میں کفر و شرک سے بھی بڑھ کر بُرے کام کے مرتکب ہوتے ہیں، کیونکہ یہ دربارِ الٰہی روئے زمین پر اسلام کا ایک بڑا شعار ہیں اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں مساجد کی اہمیت کا ایک اور طرزِ بیان اختیار فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ربّ العزت ان مقدس گھروں کی حفاظت و نگرانی فرماتا ہے کوئی قوم جب حد سے تجاوز کرتی ہے اور معابد کے مٹانے کے درپے ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تباہ و برباد کر ڈالتا ہے اور اس طرح اپنے معبدوں کی نگرانی کر کے اسے بچا لیتا ہے،

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا (حج - ۶)

اگر ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ لوگوں میں ایک دوسرے کا زور نہ گھٹاتا تو اپنے اپنے زمانہ میں نصاریٰ کے عبادت اور خلوت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں بکثرت اللہ تعالیٰ کا نام لیا جاتا ہے منہدم ہو گئے ہوتے۔

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوا، ہر زمانہ میں اس وقت کی شریعت کے مطابق جو گھر بھی بنائے گئے اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت فرمائی اور ان کو دشمنوں کے دست برد سے بچایا اور ہمارا یہ دور جو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا دور ہے اور یہ آخری شریعت ہے اس کے مطابق جو صحیح معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے گھر ہیں ان کی منجانب اللہ حفاظت ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی، بعض حفاظت ایسی ہوتی ہے جس کو ہم محسوس نہیں کر پاتے ہیں اور بعض کو ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں۔

تاریخ میں مسجد حرام پر ابرہہ بادشاہ کے حملہ کی داستان تازہ ہے اور اس کا جو حشر ہوا وہ قرآن پاک جیسی اَن مٹ کتاب میں مندرج، ارشاد ربانی ہے

وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ (الفیل)

یہ کس قدر کھلی حفاظت تھی، جو تاریخ میں اب تک تازہ ہے،

مسجد سے متعلق قرآن پاک کی یہ چند آیتیں جو مصرح ہیں پیش کر دی گئیں، ضمناً جو تذکرہ آیا ہے اسے یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے، ان میں بار بار غور کیجئے اور ہر پہلو سے ان میں فکر و نظر سے کام لیجئے۔

اب آئیے رحمت عالم صلعم کے چند ارشادات بھی ملاحظہ کر لیں تاکہ ان درباروں کی وقعت و حرمت کھل کر سامنے آجائے اور جو پہلو اجاگر نہ ہو سکا ہے اس پر ایک ہلکی روشنی پڑ جائے، کیا عجب ان سے وہ گرہیں کھل جائیں، جو اب تک نہ کھل سکی تھیں۔

مسجد اللہ کو پیاری ہے | حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رب العزت کے یہاں شہروں میں محبوب ترین مسجدیں ہیں اور مبغوض ترین بازار[1]،

مسجد میں آنے والے اللہ کے مہمان ہیں | ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مسلمان صبح شام مسجد میں حاضر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں مہمانی کا کھانا تیار کرتا ہے، جو جنت میں

[1] مسلم باب فضل المساجد ص ۲۳۲ ج ۱

صبح و شام مہمانی پیش کی جائے گی[۱]۔ مسجدیں چونکہ اللہ تعالیٰ کا گھر کہلاتی ہیں اور یہ مسلم ہے کہ عموماً میزبان مہمان کی دعوت کرتا ہے، تو بات سمجھنے کی ہے کہ نمازی گویا اللہ تعالیٰ کے مہمان ہوتے، لہٰذا اللہ تعالیٰ یہاں کے بدلہ وہاں جنت میں مہمانی پیش کرے گا۔

نور کامل کی بشارت | ایک بار آپ نے ان لوگوں کو جو تاریکی میں بھی مسجد حاضر ہوتے ہیں نور کامل کی بشارت سنائی۔

بشر المشائین فی الظلم الی المساجد — تاریکی میں مسجد جانے والوں کو نور کامل کی بشارت

بالنور التام یوم القیامۃ رواہ — دو جو قیامت کے دن حاصل ہوگا۔

الترمذی (مشکوٰۃ باب المساجد)

مسجد کی حاضری رحمت الٰہی کا ذریعہ ہے | ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ سات شخصوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں اس دن پناہ دے گا جس دن اس سایہ کے سوا کوئی اور سایہ ہی نہ ہوگا، ان سات میں ایک وہ شخص ہوگا کہ وہ جب مسجد سے نکلتا ہے تو واپسی تک اس کا دھیان اسی طرف لگا رہتا ہے[۲]، ایک حدیث ہے کہ جو شخص مسجد میں داخل ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں ہے[۳] رب العزت اسے نقصان، خسران وغیرہ سے محفوظ رکھتا ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا جس شخص کو دیکھو کہ مسجد سے محبت کرتا ہے اور اس کی خدمت کرتا ہے، اس کے مومن ہونے کی شہادت دو[۴]۔

حدیث میں "تعاھد" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی مسجد کی نگہداشت و خبرگیری کرنا، اس کی محافظت و مرمت کرنا، جھاڑو دینا، نماز پڑھنا، عبادت میں مشغول رہنا، ذکر کرنا، علوم دینی کا درس دینا۔ ان تمام معنی کو یہ لفظ شامل ہے[۵]۔

مجاہد فی سبیل اللہ | ایک دفعہ آپ نے مسجد جانے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ رحمت الٰہی میں غوطہ لگانے والے ہیں[۶] ایک دوسری حدیث میں ہے کہ وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہیں[۷]۔

---

[۱] مشکوٰۃ باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ عن البخاری والمسلم [۲] ایضاً [۳] ایضاً عن ابی داؤد [۴] ایضاً عن ابن ماجہ وغیرہ
[۵] مجموعہ فتاویٰ لکھنوی ص۱۰۱ ج ۳ [۶] کنز العمال ص۱۱۹ ج ۴

مساجد اللہ کے گھر ہیں | مسجدوں کی عظمت کو مختلف پیرایوں میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے چنانچہ ایک حدیث میں ان کو اللہ تعالیٰ کے گھر سے تعبیر کیا گیا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

المساجد بیوت اللہ وقد ضمن اللہ	مسجدیں خانۂ خدا ہیں، اور جن کا گھر ہے اللہ تعالیٰ
لمن کانت المساجد بیته بالروح	نے اس کے لئے مہربانی، آرام اور پل صراط سے
والراحة والجواز علی الصراط	گذار کر جنت میں پہنچانے کی ضمانت لی ہے۔

الی الجنة (کنز العمال ج ۴ ص ۱۱۲)

یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ گھر اور چہار دیواری میں سکونت کا محتاج ہے، ان تمام چیزوں سے اللہ تعالیٰ پاک ہے مطلب یہ ہے کہ ان گھروں پر اس کا خاص فیضانِ رحمت ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں مسجدوں کو آخرت کا بازار کہا گیا ہے۔

مساجد جنت کے باغ ہیں | ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دلنشین طریقہ سے فرمایا۔ تم جب جنت کے باغوں سے گذرو تو آسودہ ہو کر کھا پی لو، صحابۂ کرامؓ نے دریافت کیا، کہ جنت کے باغات کون؟ ارشاد ہوا "مساجد" پھر پوچھا گیا آسودہ ہو کر وہاں کھانا کیوں کر؟ ارشاد فرمایا، سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کا ورد۔[1]

مساجد دنیا کی بہترین جگہ | دربارِ رسالت میں ایک یہودی پہنچا اور اس نے پوچھا کہ دنیا میں سب سے بہتر جگہ کون سی ہے؟ رحمت عالم صلعم نے یہ سن کر سکوت فرمالیا اور کہا مرا یہ سکوت روح الامین کی آمد تک ہے، آپ ابھی اسی حال میں تھے کہ حضرت جبریل امین تشریف لے آئے، حضورؐ فرماتے ہیں کہ میں نے وہ سوال ان پر پیش کر دیا، جبریل امین فرمانے لگے مرا علم اس سلسلہ میں آپ سے زیادہ نہیں ہے ہاں پروردگار عالم سے معلوم کر کے بتا سکتا ہوں، پھر تھوڑی دیر میں حضرت جبریلؑ آ کر کہنے لگے اے اللہ کے پیارے رسولؐ! میں دربار ایزدی میں حاضر ہوا، اور اس قدر قریب ہوا جتنی قربت کبھی نہ ہوئی تھی آپ نے پوچھا وہ نزدیکی کیسی تھی، روح الامین نے جواب دیا، مرے اور رب العزت

[1] مشکوٰۃ باب المساجد عن الترمذی

کے درمیان ستر ہزار نوری پردے حائل تھے، پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے سوال کے جواب میں فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دنیا کی بدترین جگہ بازار ہیں اور اس کی بہترین جگہ مساجد[1]

مسجد کی برکت حضرت معاذ بن جبلؓ ایک جلیل القدر صحابی ہیں ان کا بیان ہے کہ ایک دن خلاف معمول صبح کی نماز میں تاخیر ہوگئی، معلوم ہوتا تھا کہ آفتاب نکل آئے گا، اتنے میں آنحضرت صلعم تشریف لائے، اقامت کہی گئی اور آپ نے نماز پڑھائی اور بہت ہلکی نماز پڑھائی، سلام پھیرتے ہی آواز دی، تم لوگ اپنی اپنی جگہ ٹھہر جاؤ، راوی کا بیان ہے کہ پھر آنحضرت صلعم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تاخیر کی وجہ بیان کرتا ہوں، بات یہ ہوئی کہ میں رات میں نیند سے بیدار ہوا، جو کچھ نماز میرے لئے مقدر تھی وضو کر کے ادا کی، پھر حالت نماز ہی میں غنودگی کی کیفیت طاری ہوگئی اور بوجھل سا ہوگیا کہ مٹا اپنے کو پروردگار عالم کے پاس پایا، جو اپنی احسن صفت کے ساتھ جلوہ گر تھے، ارشاد باری ہوا اے محمد! میں نے کہا لبیک رب۔ حکم ہوا: بتاؤ ملاً اعلیٰ کے فرشتے کس باب میں جھگڑتے ہیں اس سوال کو تین بار فرمایا میں نے ہر بار یہی کہا "لا ادری" (میں نہیں جانتا) آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت مجھ پر ڈالا۔ تا آنکہ اس کا نمایاں اثر میں نے محسوس کیا، اس کے بعد ہر چیز مجھ پر منکشف ہوگئی، اور میں نے ان کو خوب اچھی طرح جان لیا، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد! آپ کہتے ہیں کہ میں نے لبیک کہا، حکم ہوا ملاً اعلیٰ کس بات میں الجھ رہے ہیں۔ اب میں نے کہا "کفارات" میں (یعنی گناہوں کا کفارہ کون عمل بنتا ہے) ارشاد باری ہوا، وہ کیا ہیں؟ میں نے جواب میں کہا

(۱) کھانا کھلانا (مسکینوں محتاجوں کو)

(۲) نرمی سے بات چیت کرنا (زیر دستوں اور ٹوٹے ہوئے دل والوں سے)

(۳) اور نماز پڑھنا رات میں، جب لوگ خواب استراحت کے مزے لوٹ رہے ہوں، پھر آپ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا مانگو جو چاہتے ہو، آپ فرماتے ہیں، کہ میں نے اس وقت یہ دعا مانگی۔

---

[1] مشکوٰۃ باب المساجد عن ابن حبان

"اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِيْنِ وَاَنْ تَغْفِرَلِيْ وَاِذَا اَرَدْتَ فِتْنَةً فَتَوَفَّنِيْ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ وَاَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ يُّقَرِّبُنِيْ اِلٰى حُبِّكَ"

اس کے بعد آپ نے فرمایا یہ سب حق ہے پس اسے یاد کرلو اور پڑھو[۱]

مساجد شعار اسلام ہیں مسجد شعار اسلام سے ہے، حدیث میں ہے کہ تم جب کوئی مسجد دیکھو، یا اذان سن لو تو پھر قتال نہ کرو، دوسرے یہ کہ مسجد محل صلوٰۃ اور مرکز عبادت ہے جہاں رحمت الٰہی کا جھینٹ ترشح ہوتا رہتا ہے اور یہ مسجد اسی وجہ سے کعبہ کے مشابہ ہو جاتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو پاک صاف ہو کر گھر سے فرض نماز کے لئے نکلتا ہے اس کا اجر محرم حاجی کے برابر ہے[۲]

نیت کی پاکی حضرت ابو ہریرہ رضی کا بیان ہے کہ میں نے رحمت عالم صلعم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو میری اس مسجد میں کسی پاک اور اچھی نیت سے آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنے والوں کی مانند ہے، اور جو کسی اور نیت سے آتا ہے اس کی مثال اس شخص جیسی ہے، جو دوسرے کی متاع للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہو[۳]، ایک دفعہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مسجد میں جس ارادہ سے آتا ہے وہی اس کے حصہ میں آتا ہے[۴]

صاحب اشعۃ اللمعات نے "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" والی پہلی حدیث کے ضمن میں مثال دے کر بتایا ہے کہ مسجد میں کتنی مختلف نیتوں سے آدمی آسکتا ہے اور پھر ہر ایک کا اجر بتایا ہے اور اور تمام نیتوں کا اجر حدیث ہی سے ثابت کیا ہے تفصیل دیکھنا ہو تو وہاں ملاحظہ فرمائیے،

قرآن اور احادیث میں مسجدوں کے متعلق جو کچھ آیا ہے امید ہے اس کا خلاصہ اس مختصر مضمون میں آگیا ہے، دانا و بینا اور عقل والوں کے لئے اس میں بڑی وسعت ہے،

یہ جو کچھ لکھا گیا وہ یکسر مساجد کے متعلق، مگر مسجد کی عظمت ایک اور طریقہ سے بھی سمجھنے

---

[۱] مشکوٰۃ باب المساجد عن الترمذی واحمد [۲] حجۃ اللہ البالغہ جلد اول صہ ۱۹۲ [۳] مشکوٰۃ باب المساجد [۴] الجزء الاول باب فضل القعود فی المسجد

کی کوشش فرمایئے کہ یہ عظیم الشان دربار، دینی اور دنیوی اعتبار سے کتنا بلند ہے

مسجد کی قربت | اس گھر کی بڑائی کا یہ حال ہے کہ اس کا فیض و کرم پڑوس کو بھی نہیں محروم کرتا، رحمت کی چھینٹیں اُڑ کر ان پر بھی پڑتی رہتی ہیں، جس سے ان کا درجہ بھی کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے ارشاد نبوی ہے۔

فضل الدار القریبة من المسجد	مسجد سے جو گھر قریب ہیں اس کی فضیلت
علی الشاسعة کفضل الغازی	دور والے گھر پر ایسی ہے جیسی غازی کو گھر
علی القاعد (کنز العمال ص۱۳۷ ج ۴)	میں بیٹھنے والے پر فضیلت حاصل ہوتی ہے

دیکھا آپ نے، کہ پڑوس کا مرتبہ بھی کتنا اونچا ہو گیا، یہ قریب اور آس پاس کے مکانات اپنے دوسرے مکانات سے سبقت لے گئے، اور ایسا کیوں نہ ہو، جہاں رحمت الٰہی کی بارش ہوتی ہے، جو جلوہ گاہِ خدا ہے اور جس کو دنیا کی جنت کہا گیا ہے۔ یقیناً اس کا پڑوس بھی اس سے کچھ نہ کچھ نفع اندوز ہوگا ہی۔

تسکین خاطر | مگر اس کے ساتھ قدرت کا یہ انصاف بھی ہے کہ جو دور رہتے ہیں ان کو بھی محروم نہیں کیا ہے بلکہ ان کو بھی کسی نہ کسی طرح یہ حصہ عطا کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

ان اعظم الناس اجراً فی الصلوٰة	زیادہ اجر ان کے لئے ہے جو دور دور سے چل کر آتے
ابعدھم الیھا ممشی فابعدھم	ہیں اور جو مسجد آکر جماعت سے نماز پڑھتے ہیں وہ
والذی ینتظر الصلوٰة حتی یصلیھا	تنہا نماز پڑھ کر سونے والے سے بہتر ہیں۔
مع الامام اعظم اجراً من الذی	
یصلیھا ثم ینام	

(مسلم باب کثرة الخطا الی المساجد و فضل المشی الیہا ص۲۳۵)

اس حدیث میں ان کے لئے تسلی و تسکین کا مواد فراہم کیا گیا ہے جو مسجد سے دور بستے اور رہتے سہتے ہیں، اور پڑوس کی محرومی کا تدارک اس ثوابِ عظیم سے کیا گیا ہے جو دور سے چل

کر آنے میں ہوتا ہے، اور اس چلنے کے ثواب کی کثرت کا یہ حال ہے کہ کوئی قدم ثواب سے خالی نہیں ہے۔

مسجد میں آنے کا ثواب | حضرت جابر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ ہمارا گھر مسجد سے دوری پر تھا، ایک موقع سے میں نے ارادہ کر لیا کہ اپنا گھر بیچ ڈالوں اور چل کر مسجد نبوی کے پڑوس میں (جس حد تک ممکن ہو) بسوں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس ارادہ سے روک دیا اور فرمایا

ان لکم بکل خطوۃ درجۃ — بے شک تمہارے لئے ہر قدم پر ایک درجہ ہے

(مسلم باب کثرۃ الخطا الی المساجد ج ۱ ص ۲۳۵)

حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ مسجد نبوی کے پڑوس میں کچھ جگہ خالی ہوئی، قبیلہ بنو سلمہ جو مسجد سے دوری پر آباد تھا اس کا ارادہ ہوا کہ پڑوس میں آکر آباد ہو، اور پہلی جگہ چھوڑ دے یہ خبر جب آنحضرت صلعم کو ہوئی تو آپ نے ان سے اس کے متعلق سوال کیا، انھوں نے اثبات میں جواب دیا، آپ نے جب ان کا یہ ارادہ ملاحظہ فرمایا تو ان سے کہا

یا بنی سلمۃ دیارکم تکتب آثارکم — اے بنی سلمہ! اپنے مکانوں کو لازم پکڑو، تمہارے نشان قدم لکھے جائیں گے، اپنے مکانوں کو لازم پکڑو۔ تمہارے نشان قدم لکھے جائیں گے۔

(مسلم باب کثرۃ الخطا الی المساجد و فضل المشی الیہا ج ۱ ص ۲۳۵)

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ آپ نے ان کو ترغیب دی کہ جہاں تھے وہیں رہیں دوری سے نہ گھبرائیں یہ دوری بھی باعث ثواب بنتی ہے یعنی وہاں سے چل کر جب مسجد آنا ہوتا ہے تو چلنا زیادہ پڑتا ہے اور اسی اعتبار سے ثواب میں اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ یہاں ہر قدم پر نیکی لکھی جاتی ہے، پھر یہ بھی ایک پر لطف بات ہے کہ آدمی جب گھر سے باوضو مسجد کے لئے نکلتا ہے تو گویا وہ نمازہی میں ہوتا ہے اس طرح اجر میں کچھ اور اضافہ کی توقع ہے۔

ایک دفعہ آپ نے فرمایا

الا بعد فالابعد من المسجد — مسجد سے تو جس قدر دور ہوتا اور وہ آتا ہے اس

اعظم اجراً کو اتنا ہی ثواب ملتا ہے

(ابو داؤد باب ما جاء فی فضل المشی الی الصلوٰۃ)

حضرت اُبَیّ بن کعبؓ ایک انصاری کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ یہ صاحب مرے علم میں مسجد سے (نمازیوں میں) سب سے دور رہتے تھے، مگر ان کا حال یہ تھا کہ ہر وقت بہ پابندی مسجد حاضر ہوتے تھے، کبھی بھی ان کی جماعت نہیں چھوٹتی تھی ایک مرتبہ ان سے کہا گیا کہ کاش آپ سواری کے لئے ایک گدھا خرید لیتے، تاکہ آپ کو رات کی تاریکی اور تپتے دن میں مسجد آنے میں آرام رہتا، انھوں نے یہ سن کر فرمایا، مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ میں مسجد کے بغل ہوتا اور چلنے کی مشقت سے بچتا، بلکہ مری تو خواہش یہ ہے کہ آنے جانے میں جو قدم اٹھیں ان تمام کے نشان قدم مرے نامۂ اعمال میں لکھ دئے جائیں آنے کے بھی اور واپسی کے بھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا آمد ورفت دونوں کے ثواب اللہ تعالیٰ نے تم کو عطا کیے۔[۱]

ایک دفعہ رسول الثقلین صلعم نے ارشاد فرمایا کوئی جب پاک وصاف ہو کر یاد ضو کسی مسجد کے لئے چلتا ہے کہ فریضہ ادا کرے تو ایسے شخص کا ایک قدم گناہ کو مٹاتا ہے اور دوسرا درجہ کی بلندی کا ذریعہ ہوتا ہے۔[۲]

سفر کی واپسی میں مسجد کی حاضری | مساجد کی ایک عظمت شان یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے جب واپس ہوتے تو سب سے پہلے مسجد ہی میں تشریف لاتے اور دو رکعت نماز ادا فرماتے پھر لوگوں سے مل جل کر گھر تشریف لے جاتے آپ کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا واپسی سفر میں یہی دستور ہو گیا تھا کہ مسجد میں اترتے نماز ادا کرتے، پھر منزل مقصود کی طرف چلتے اب بھی مسلمانوں کے یہاں یہی طریقہ مسنون ہے۔[۳]

اعتکاف جو ایک سنت طریقہ ہے اور بیش قیمت فوائد پر مشتمل ہے اس کے لئے بھی مسجد کی عظمت

---

[۱] مسلم باب فضل الصلوٰۃ المکتوبۃ فی جماعۃ ج ۱ ص ۲۳۵ [۲] ایضاً [۳] مسلم باب استحباب رکعتین فی المسجد لمن قدم سفر ج ۱ ص ۲۴۸

ادبیات

نذرِ غالب

(جناب الم مظفر نگری)

وہ نگاہیں یوں علاجِ دردِ پنہاں ہوگئیں — میری نظروں سے ملیں اور رگِ جاں ہوگئیں

بجلیاں پھر طورِ پر شاید نمایاں ہوگئیں — میرے غم خانے کی سب شمعیں فروزاں ہوگئیں

ضبطِ غم کی کوششیں مرنے کا ساماں ہوگئیں — گھٹتے گھٹتے۔ دل میں آہیں کاہشِ جاں ہوگئیں

دیکھیں وہ کیا حریمِ حسن کی تابانیاں — جو نگاہیں پردۂ جلوہ سے حیراں ہوگئیں

قید میں بھی اشکِ رنگیں نے سجا دی بے بہا — سب قفس کی تیلیاں شاخِ گلستاں ہوگئیں

وقتِ ماتم بھی وہ، ہم چپ، اہلِ میّت بیقرار — کون ان سے یہ کہے زلفیں پریشاں ہوگئیں

چند تصویریں ازل میں تھیں جو محفوظِ حجاب — میری خاطر رونقِ بازارِ امکاں ہوگئیں

ساحلِ مقصد پہ جا پہنچی ہیں وہ سب کشتیاں — ناخدا کہتا ہے جن کو غرقِ طوفاں ہوگئیں

[illegible] اب قیدِ جسم لیں کرائے جوشِ جنوں — جسم کی ساری رگیں زنجیرِ زنداں ہوگئیں

[illegible] وحشی کی مشقیں گلکاریاں ممکن نہیں — یہ بہاریں وہ ہیں جو پابندِ زنداں ہوگئیں

کتنی مدت میں چھٹا قیدِ قفس سے ہمصفیر — گلشنِ ہستی کی بنیادیں بھی ویراں ہوگئیں

کام آئیں حشر کے دن عشق کی ناکامیاں — اے زہے قسمت جوابِ فردِ عصیاں ہوگئیں

اس چمن میں کس طرح ٹھہریں بتا اے ہم نوا — جب فضائیں بھی یہاں کی دشمنِ جاں ہوگئیں

کارگاہِ زندگی میں جبرِ فطرت سے الم
جتنی تدبیریں تھیں سب تقدیرِ انساں ہوگئیں

جس آشیاں پہ ناز تھا وہ آشیاں نہیں

(جناب مشیرؔ جھنجھانوی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی علیگ)

رنجِ قفس، فراقِ نشیمن گراں نہیں
اب میرے دل میں کاوشِ سوزِ نہاں نہیں

جو پردہ درمیاں تھا وہ اب درمیاں نہیں
پنہاں تری نظر سے مرا آستاں نہیں

دل جل گیا مگر مرے لب پر فغاں نہیں
اس آگ میں لپٹ تو ہے لیکن دھواں نہیں

گلشن کا ذکر کیا ہے لرزتی ہے کائنات
محدودِ آشیاں مری آہ و فغاں نہیں

حالِ دلِ تباہ سنیں آپ خود سے
یہ ماجرائے غم ہے کوئی داستاں نہیں

دیدۂ حرم کی قید سے ہو کاش بے نیاز
تیری نظر نظر ہے تو جلوے کہاں نہیں

فطرت نے یہ سمجھ کے اُلٹ دی نقابِ رُخ
دنیا ہے ناشناس کوئی رازداں نہیں

کیوں کر سکون ہو دلِ حسرت نصیب کو
اب گردِ کارواں بھی پسِ کارواں نہیں

ہر موجِ بحرِ عشق ہے ساحل لئے ہوئے
اہلِ نظر کے واسطے ساحل کہاں نہیں

اک راز ہے کمالِ محبت میں بے خودی
دنیا سمجھ رہی ہے جہاں۔ میں وہاں نہیں

رودادِ انقلابِ چمن کیا کہوں مشیرؔ
جس آشیاں پہ ناز تھا وہ آشیاں نہیں

مشکلات القرآن | از مولانا داؤد اکبر اصلاحی تقطیع خورد ضخامت ۱۰۹ صفحات طباعت و کتابت بہتر قیمت دو روپیہ پتہ:- ابو الخیر صاحب مدرسۃ احیاء العلوم مبارکپور اعظم گڈھ (یوپی)

مولانا حمید الدین الفراہی مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے حقائق و مطالب پر غور و فکر کرنے کی نعمت و دولتِ خاص سے نوازا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی پوری زندگی کتاب الٰہی کے فہم و ادراک میں صرف کردی اور اس میں شبہ نہیں کہ مولانا مرحوم نے اپنی عمر بھر کی کوششوں کے جو نتائج متعدد تصنیفات کی شکل میں یادگار چھوڑے ہیں مجموعی اعتبار سے قرآن مجید کے فہم اور اس کے مشکلات کے حل میں بہت ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں مولانا کی تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑی حد تک قرآن کو قرآن سے ہی سمجھنا چاہتے ہیں مولانا نے اپنے اس ذوق کو اپنی تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ وہ مخلص خادمین قرآن کی ایک ایسی جماعت بھی چھوڑ گئے جو انھیں کے طریق تاویل و تفسیر کی روشنی میں کتاب حکیم کی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں مولانا داؤد اکبر اصلاحی بھی انھیں میں سے ایک ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب موصوف کے بارہ مقالات کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر مقالہ قرآن مجید کی کسی ایک آیت کی تفسیر اور اس سے متعلق ضروری مباحث پر مشتمل ہے ان سب مقالات میں مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا انداز فکر نمایاں ہے جو ہمارے نزدیک کہیں کہیں تفسیر بالرائے کی حد میں داخل ہو گیا ہے اور اس اعتبار سے اس پر کلام کی کافی گنجائش ہے مثلاً مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ الآیۃ میں ان کا پہلا دعویٰ کہ اس آیت کے جتنے شان نزول ہیں وہ قرآن اور عقل دونوں کے خلاف ہیں اور اس سلسلہ میں جو حدیث بیان کی جاتی ہے اس

کا بھی لغوی مفہوم صحیح نہیں ہے متقدمین مفسرین کے خلاف جرأت بیجا ہے پھر "حیی" اور "احیا"
کے جو معنی انھوں نے خود بیان کئے ہیں ان کی نسبت انھیں خود اعتراف ہے کہ یہ معنی غریب
ہیں اس بنا پر جب تک سیاق وسباق میں کوئی قرینہ قویہ موجود نہ ہو یہ معنی مراد نہیں لئے جا سکتے
اور افسوس ہے کہ کوئی قرینہ اس کے لئے ایسا قوی موجود نہیں ہے اسی طرح ذبح بقرہ اور قتل
نفس پر بحث کے سلسلہ میں کَذَالِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى کی تفسیر میں فاضل مصنف کا حیات
سے پُر امن زندگی اور موت سے پریشان زندگی مراد لینا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اول تو یہ "کذالک"
خود اس کی طرف اشارہ ہے کہ حیات اور موت سے مراد ان کے حقیقی معنی ہیں اگر معنی وہ ہی مراد ہوتے
جو مولانا نے بیان کئے ہیں تو اس میں کوئی عجوبہ بات نہ تھی اور اس بنا پر اس واقعہ کو "کذالک" فرما کر
حیات بعد الموت کے لئے بطور استشہاد پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی پھر فاضل مصنف نے "ولکم
فی القصاص حیوۃ" اور ایک اور آیت سے جو استشہاد کیا ہے وہ بھی صحیح نہیں کیونکہ
قصاص والی آیت میں حیوۃ سے مراد پُر امن زندگی نہیں بلکہ حقیقی زندگی ہی ہے اسی طرح
"فَکَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا" میں "کانما" خود اس کا قرینہ ہے کہ "احیا" سے مراد حقیقی طور
پر زندہ کرنا ہے یہ اور اس قسم کی اور بھی متعدد تفسیریں ہیں جن سے ہم کو اختلاف ہے اور
اس اختلاف کے لئے قوی وجوہ بھی ہیں جن کے بیان کرنے کی نہ یہاں ضرورت ہے اور نہ گنجائش
لیکن اس سے کتاب کی افادیت اور اہمیت میں فرق نہیں آتا اس میں شبہ نہیں کہ فاضل مصنف
کا قرآنی ذوق بہت سلجھا ہوا اور شگفتہ ہے۔ اس مجموعہ کے سب مضامین کافی غور وفکر اور تلاش
وتحقیق کے بعد لکھے گئے ہیں پھر انداز بیان بھی دلچسپ اور عام فہم ہے جس میں کوئی گنجلک نہیں
جو کچھ لکھا ہے دل لگا کر لکھا ہے خصوصاً بعض مقالات مثلاً حضرت موسیٰ کے واقعہ ایذا رسانی کی تحقیق
"والنجم اذا ھوی" اور بعض اور مضامین بہت قابل قدر اور فاضلانہ ہیں امید ہے کہ ارباب
ذوق اس کی قدر کریں گے۔

ہزار سال پہلے | از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی تقطیع متوسط ضخامت

۱۱۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد للعہ، پتہ:۔ انجمن ثمرۃ التربیت سورتیان دیوبند
دارالعلوم دیوبند کے سورتی طلبا ر نے ثمرۃ التربیت کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے
جس کا مقصد طلباً میں تحریر و تالیف کا ذوق پیدا کرنا اور اچھی کتابوں کا شائع کرنا ہے خوشی کی بات
ہے کہ اس دوسرے مقصد کا آغاز انجمن نے ایک ایسی فاضل ہستی کے رشحاتِ قلم سے کیا ہے جو
خود ناظورۂ دارالعلوم کی انگشتری کا ایک چمکتا ہیرا ہے اس کتاب میں فاضل مصنف نے تیسری
اور چوتھی صدی ہجری کے نامور مسلمان سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کی کتابوں کی مدد سے ایک
ہزار سال پہلے کے ہند، چین، مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کی اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں کے
حالات ۔ رسوم و عوائد ۔ اوہام و تخیلات ۔ سماجی اور اقتصادی معاملات و تعلقات اپنے مخصوص
انداز میں بیان کئے ہیں اور واقعات کے بیان کے ساتھ ان سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان
کا بھی ذکر ہوتا گیا ہے اس اعتبار سے یہ کتاب معلومات افزا مفید اور دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز و
نصیحت آموز بھی خاص ہند اور چین کے حالات میں مسلمانوں کے ساتھ اس زمانہ کے ہندوؤں اور
بودھوں کے شگفتہ و خوشگوار تعلقات کی جو تصویر اس کتاب میں نظر آتی ہے اس سے یہ حقیقت
بالکل صاف نمایاں ہو جاتی ہے کہ آج کل دونوں قوموں میں جو کشیدگی بلکہ منافرت پائی جاتی ہے
اس کی وجہ خواہ کچھ ہو لیکن بہر حال مذہب اس کی بنیاد ہرگز نہیں ہو سکتا جیسا کہ فاضل مصنف
نے خود مقدمہ میں لکھا ہے یہ کتاب دراصل موصوف کی چند منتشر اور غیر مرتب یادداشتوں کا
مجموعہ ہے جو پہلے قسط وار رسالہ دارالعلوم میں چھپتا رہا اور پھر طلبار کے اصرار سے مولانا نے
اس کو نظر ثانی اور ترتیب کے بغیر ہی کتابی صورت میں چھاپنے کی اجازت دے دی۔ اس بنا پر اس
میں نہ وہ ترتیب اور ربطِ مضامین ہے جو ایک پہلے سے سوچی ہوئی تالیف میں ہونا چاہئے
اور نہ وہ جامعیتِ معلومات ہے جو مولانا موصوف ایسے وسیع النظر عالم کی تصنیف سے متوقع
ہو سکتی ہے ۔ تاہم کتاب موجودہ حالت میں بھی لائقِ مطالعہ اور دلچسپ ہے اور اگرچہ کتابت
وطباعت کی غلطیاں بھی بکثرت رہ گئی ہیں لیکن پہلا کارنامہ ہونے کے لحاظ سے طلبا کی انجمن

حوصلا افزائی اور داد کی مستحق ہے

نوائے حیات | طبع دوم از جناب یحییٰ اعظمی صاحب تقطیع کلاں ضخامت ۲۰۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ہے پتہ :- دارالمصنفین اعظم گڈھ۔

جناب یحییٰ اعظمی اردو کے مشہور اور معیاری شاعر ہیں۔ موصوف شاعری کے شبلی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کے کلام میں اس اسکول کی تمام خصوصیات مثلاً خیالات میں فکر اور عظمت بیان میں صفائی اور ستھرائی، روانی اور سلاست۔ تراکیب میں شکوہ و متانت پورے طور پر پائی جاتی ہیں ابتذال اور روشِ عام سے بچنے کا یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی کے جنہوں نے اس مجموعہ پر آٹھ صفحات کا مقدمہ لکھا ہے "اس پورے مجموعہ کلام میں کوئی ایک شعر یا مصرعہ بھی ایسا نہیں ہے جو تخلص یا شاعر کے نام کی شرکت سے آلودہ ہو"

اس مجموعہ میں غزلیں تو برائے بیت ہی ہیں اگرچہ جتنی بھی ہیں کیف سے خالی نہیں پورا ہوئے نظموں اور قطعات پر ہی مشتمل ہے جو مختلف عنوانات مثلاً حمد و نعت۔ صلوٰۃ و سلام۔ اقبال۔ ہم عصر۔ قومی، ملی و سیاسی، اخلاقی، ادبی اور نیچرل مناظر سے متعلق لکھی گئی ہیں اردو کے علاوہ فارسی کی بھی چند نظمیں اور قطعات ہیں اس میں شبہ نہیں کہ یہ مجموعہ کلام ہمارے ادبیات کے عناصرِ صالحہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے جس میں دعوتِ عمل بھی ہے اور حسنِ خیال حسنِ ادا بھی جو شاعری بھی ہے اور حکمت بھی جس میں کیف و رنگینی بھی ہے اور لطافت سخن کا کیف درد و اثر بھی ہے اور حوصلہ و امید بھی جیسا کہ ہم نے کہا لائق مصنف کی زبان شگفتہ اور بامحاورہ ہے لیکن اس کے باوجود یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بعض بعض متروک الاستعمال الفاظ مثلاً "تک" کے بجائے "ٹک" سکھانے کے بجائے "سکھلانا" (ص ۷۰ و ۱۵۰) سے اجتناب نہیں کیا گیا ہے اسی طرح بعض تراکیب بھی صحیح نہیں ہیں مثلاً "سراپا درد مندِ حیات" اور "اشرف المخلوقیت (ص ۷۰ و ۱۵۰) کہ "سراپا درد مندیٔ حیات" اور "اشرف المخلوقاتیت" ہونا چاہیے تھا۔

امور بیٹیاں | از محترمہ بیگم صلاح الدین سید احمد اردوی تقطیع خورد ضخامت ۹۶ صفحات کتابت و طباعت

بہتر قیمت ۱۲ ار پتہ:- ادارۂ علمیہ دعنی رام روڈ نئی انارکلی لاہور۔

اس مختصر کتاب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی حضرت ہاجرہ سے لے کر مصر کے مشہور لیڈر سعد زاغلول پاشا مرحوم کی بیوی صفیہ خانم تک مختلف اسلامی ملکوں کی اٹھائیس نامور خواتین کے حالات اور ان کی زندگی کے بعض اہم واقعات بہت مختصر طور پر بیان کئے گئے ہیں کہیں کہیں بعض شخصیتوں کے متعلق جو تاریخی مباحث پیدا ہو گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت ہاجرہ کون تھیں؟ باندی ہاجرہ کشمیری کی اللہ مجذوبہ ہندو تھی یا مسلمان؟ ان کی طرف بھی اشارے کئے گئے ہیں۔ زبان صاف ستھری اور سلیس ہے کتاب بحیثیت مجموعی اور پھر ایک خاتون کے قلم سے ہو تصنیف کے میدان میں نووارد ہیں داد اور قدر افزائی کی مستحق ہے۔

تفسیر مظہری

تمام عربی مدرسوں، کتب خانوں اور عربی جاننے والے اصحاب کے لئے بیش بہا تحفہ

ارباب علم کو معلوم ہے کہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی یہ عظیم المرتبہ تفسیر مختلف خصوصیتوں کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتی لیکن اب تک اس کی حیثیت ایک گوہر نایاب کی تھی اور ملک میں اس کا ایک قلمی نسخہ بھی دستیاب ہونا دشوار تھا۔

الحمد للہ کہ۔ سالہا سال کی ازحد کوششوں کے بعد ہم آج اس قابل ہیں کہ اس عظیم الشان تفسیر کے شائع ہو جانے کا اعلان کر سکیں اب تک اس کی حسب ذیل جلدیں طبع ہو چکی ہیں جو کاغذ و دیگر سامان طباعت و کتابت کی گرانی کی وجہ سے بہت محدود مقدار میں چھپی ہیں۔

ہدیہ غیر مجلد جلد اول تقطیع ۲۲×۲۹ ساٹھ روپے، جلد ثانی ساٹھ روپے، جلد خامس ساٹھ روپے، جلد ششم آٹھ روپے، جلد ثالث زیر طبع، جلد رابع ۵ م، جلد ہفتم زیر کتابت

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

قصص القرآن - جلد چہارم - حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات کا بیان - دوسرا ایڈیشن جس میں ختم نبوت کے اہم اور ضروری باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔

قیمت ۵ مجلد ۶

اسلام کا اقتصادی نظام - وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے - چوتھا ایڈیشن

قیمت للعہ مجلد ۵

مسلمانوں کا عروج و زوال -

جدید ایڈیشن قیمت للعہ مجلد ۵

مکمل لغات القرآن - مع فہرست الفاظ لغت قرآن پر بے مثل کتاب - جلد اول طبع دوم

قیمت للعہ مجلد ۵

جلد ثانی - قیمت للعہ مجلد ۵

جلد ثالث - قیمت للعہ مجلد ۵

مسلمانوں کا نظم مملکت - مصر کے مشہور مصنف ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم اے پی ایچ ڈی کی محققانہ کتاب النظم الاسلامیہ کا ترجمہ

قیمت للعہ مجلد ۵

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت

جلد اول اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب قیمت للعہ مجلد ۵

جلد ثانی - قیمت للعہ - مجلد ۵

قرآن اور تصوف - حقیقی اسلامی تصوف اور مباحث تصوف پر جدید اور محققانہ کتاب

قیمت عہ مجلد ۳

ترجمان السنہ - جلد اول - ارشادات جامع و مستند ذخیرہ - صفحات ... تقطیع

قیمت عہ مجلد للعہ

ترجمان السنہ - جلد دوم - اس جلد کے قریب حدیثیں آگئی ہیں -

قیمت للعہ مجلد للعہ

تحفۃ النظار یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن معہ تنقید و تحقیق از مترجم و نقشہ جات

قیمت ۳

قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی قرون وسطیٰ کے حکمائے اسلام کے شاندار علمی کا

جلد اول مجلد عہ

جلد دوم مجلد ۳

وحی الٰہی

مسئلہ وحی اور اس کے تمام گوشوں کے پہلی محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ پر لیسے انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہو گہرائیوں میں سما جاتا ہے -

جدید ایڈیشن قیمت عہ مجلد

رجسٹرڈ ایل نمبر
REGISTERED No. D 148.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

خاص ۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص
یت سے حرمت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر
گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے ۔
ن ۔ جو حضرات پچیس روپے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہوں گے
ب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا ۔ ادارے کی طرف سے ان
خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے ۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض
ت اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضے کے بغیر پیش کیا جائے گا ۔
اونین ۔ جو حضرات اٹھارہ روپے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین
ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے
ش کیا جائے گا ۔
باء ۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احباء میں ہوگا ۔ ان کو رسالہ بلا قیمت
و طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی ۔ یہ حلقہ خاص طور پر
طلباء کے لئے ہے ۔

رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ ر تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔
(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے
اترتے ہیں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں ۔
(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں ۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے
وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں ۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائے گا ۔
اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی
(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہیئے ۔ خریداری نمبر کا حوالہ بہرحال ضروری ہے
(۵) قیمت سالانہ چھ روپے ۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ دس آنے ۔
(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے ۔

مولوی محمد ظفیر پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا ۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب
سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

جلد بست و پنجم — شمارہ (۵)

نومبر ۱۹۵۰ء مطابق صفر المظفر ۱۳۷۰ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تَاَثُرات

ایک خبر ہے کہ ابھی حال ہی میں پنڈت نہرو لکھنؤ تشریف لے گئے تو اپنے ایک بیان میں انھوں نے اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار فرمایا

"میں بہت دنوں کے بعد لکھنؤ آیا ہوں یہاں تو بڑی تبدیلی معلوم ہوتی ہے جو مکانوں اور دکانوں کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ یہاں کی بولی میں جو تبدیلی ہوئی ہے اس کا اثر میں نے محسوس کیا ہے میں یہاں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کر رہا ہوں ۔ نہ جانے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں آپ اسے سمجھیں گے بھی یا نہیں؟ یہاں جو اشتہار چسپاں دیکھے ہیں اور نوٹس دیکھے ہیں ان کا تو میں ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں یا تو دہلی میں رہ کر بہت کچھ بھول گیا ہوں یا اس شہر نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ میں خود بہت پیچھے رہ گیا ہوں۔ (ہماری زبان مورخہ یکم نومبر ۵۲ء)

بھارت کے وزیر اعظم اور انٹرنیشنل شخصیت کے مالک ہونے کے باوجود ہمارے پنڈت جی کتنے بھولے اور اسٹار ہیں کہ ان کو آج تک یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہونے کے بعد کسی قوم کے انتہائی ترقی یافتہ ہونے کی دنیا میں صرف دو ہی علامتیں ہیں ایک یہ کہ زبان بگڑنے کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن بھی بگڑ جائے اور دوسرے یہ کہ اس ملک کا سب سے بڑا شہری اور اس قوم کا سب سے بڑا آدمی بھی اس ماحول میں اپنے آپ کو "اجنبی" محسوس کرنے لگے اور یہ آج کوئی نئی بات تو نہیں ہے ۔ ابھی پوری ایک صدی بھی نہیں ہوئی کل کی سی بات ہے کہ انگریزوں نے اس ملک کے لوگوں کو جو ان کے خیال میں ناشائستہ ۔ غیر مہذب اور اوہام پرست تھے تہذیب و تمدن اور ترقی و شائستگی کے زیور سے آراستہ کرنا چاہا تھا تو انھوں نے بھی تو یہی کیا تھا کہ یہاں کے لوگوں کی زبان بدلی ۔ صورت اور شکل بدلی اور یہاں تک

کہ اُن کا دل اور دماغ بھی بدل ڈالا ہیں جب بدلنا ہی معیار ترقی ہوگیا تو اب اس کی بحث ہی فضول ہے کہ تبدیلی نے شکل کیا اختیار کی ہے بہرحال جمود تو باقی نہیں رہا۔

جو شخص پنڈت جی کے خلوص اور ان کے اس جذبۂ بیقرار سے واقف ہے کہ وہ کس طرح اپنے ملک کو امریکہ اور انگلینڈ کی طرح خوشحال۔ اور ترقی یافتہ بنا دینا چاہتے ہیں وہ اس درد اور سوز و گداز کو محسوس کر سکتا ہے جو ان کے اس فقرہ میں کہ " میں یہاں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کر رہا ہوں " چھپا ہوا ہے۔ ہمیں پنڈت جی کے ساتھ اس معاملہ میں پوری ہمدردی ہے لیکن ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ یہ حالت رہنے والی نہیں ہے پنڈت جی آخر بھارت کی ناؤ کے کھیون ہار بھی تو ہیں غالباً مولانا حالی اس قسم کے موقع کے لئے کہہ گئے ہیں۔

رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا　　　کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی

خدا قبر ٹھنڈی رکھے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی ان کی بعض باتیں اُس وقت سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور دل انھیں قبول نہیں کرتا تھا لیکن آج حرف بحرف ان کی تصدیق ہوتی جا رہی ہے فرمایا کرتے تھے کہ " گاندھی جی دنیا کے بہت بڑے انسان اور بلند پایہ روحانی بزرگ ہیں میرے دل میں ان کی بڑی عظمت و محبت ہے لیکن میرے نزدیک ان سے یہ بہت بڑی بھول ہوئی ہے کہ انھوں نے سیاست کے ساتھ مذہب اور کلچر کا رشتہ جوڑ دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ملک میں سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ ماضی پرستی اور رجعت پسندی بھی ترقی کر رہی ہے مولانا فرماتے تھے کہ ایک مذہبی ملک میں سیاست کے ساتھ مذہب کا اتنا تعلق تو نہ صرف مناسب بلکہ ضروری ہے کہ لوگوں اور قوموں سے معاملہ کرتے وقت مذہب کے بنیادی اصولِ اخلاق کا لحاظ رکھا جائے یعنی جھوٹ نہ بولا جائے کسی کو فریب نہ دیا جائے کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کی جائے لیکن ہندوستان ایسے ملک میں جہاں مختلف قومیں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے آباد ہیں وہاں سیاست پر گفتگو کرتے وقت مذہب کا نام

لینا یا کسی خاص فرقہ یا قوم کے کلچر اور اس کی روایات کہن کا چرچا کرنا ملک کو سیاست میں آگے بڑھانے کے بجائے پیچھے ہٹا دینے کا سبب ہو سکتا ہے اور اس سے فرقہ وارانہ فضا پیدا ہو کر قوم میں رجعت پسندی کے جراثیم پیدا کر سکتی ہے۔

مولانا اس سلسلہ میں ترکی کا حوالہ دیکر فرمایا کرتے تھے کہ اگر کمال اتاترک کو مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا نسخہ ہاتھ نہ آتا تو ترکی کا اس درجہ ترقی یافتہ ہونا تو کجا اس کا زندہ رہنا دشوار ہو جاتا لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ ترکی سے مذہب رخصت ہو گیا ہے سخت غلطی ہے کیونکہ ترک بہر حال مسلمان ہیں اور اسلام ان کے جسم و جان میں اس درجہ پیوست ہو چکا ہے کہ وہ اگر اس کو چھوڑنا بھی چاہیں تو نہیں چھوڑ سکتے البتہ ہاں اگر سیاسیات میں ترک ہمیشہ کی طرح مذہب اور خلافت کا نام لیتے رہتے تو ملکی اور سیاسی معاملات میں ان کا نقطۂ نظر کبھی ترقی پسندانہ نہ ہوتا اور دوسری جانب ترکی کی حریف طاقتیں اس کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھ کر کبھی اسے پنپنے اور سیاسی طور پر مضبوط ہونے کا موقع نہ دیتیں۔

ملک میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک غلامی سے آزاد ہو گیا لیکن چونکہ اس سیاسی شعور کے ساتھ مذہبی پرستی۔ رجعت پسندی اور کلچرل عصبیت بھی پھلتی پھولتی رہی تھی اس لئے اس کا انجام یہ ہوا کہ بھائی بھائی سے جدا ہو گیا ارباب وطن اپنے دیس میں پردیسی ہو گئے اور انسانی شرف و مجد کو خاک و خون میں تڑپنا پڑا۔ اور پھر معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو گیا ہے بلکہ ہر ترقی پسندانہ نظریے کو نفرت اور دشمنی کی نظر سے دیکھا جانے لگا ہے۔ چنانچہ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت جس کی پورے ملک پر حکومت بھی ہے۔ اس کے دیرینہ سال و بیدار مغز صدر کا کھلم کھلا یہ ارشاد اور پورے ملک سے اس کی اپیل کہ وہ گوشت نہ کھائیں۔ نمک اور گھی نہ کھائیں۔ مکھن اور شہد نہ کھائیں۔ جوتے نہ پہنیں کسی دوا کا استعمال نہ کریں۔ ٹیکہ یا انجکشن نہ لگوائیں یہ سب کچھ اسی سیاست کے ساتھ مذہب اور کلچر کے سمبندھ کا نتیجہ ہے چونکہ یہ صدر کانگریس کا ارشاد ہے اس لئے بھارت کے ہر شہری کا فرض ہے کہ اس پر عمل کرے اس بنا پر اگر اس ملک کے ۳۳ کروڑ انسان سب کے سب ان ہدایات پر عمل کرنے لگیں تو ذرا سوچئے اس ملک کا نقشہ کیا ہوگا اور موجودہ اقوام عالم کے مرقع میں اس کو کونسا مقام ملے گا

تدوین حدیث

محاضرۂ چہارم

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)

(۱۰)

مان لیجئے کہ دو سو حدیثیں سہی، خیال تو کیجئے کہ جس شخص کا مسلک یہ قرار دیا جاتا ہو کہ وہ دنیا سے حدیثوں کے قصے ہی کو ختم کر دینا چاہتا تھا، وہی کیا ڈیڑھ نہیں دو دو ڈھائی سو حدیثوں کا خود راوی بن سکتا ہے؟

اور تعداد کا یہ قصہ تو محدثین کی خاص اصطلاح کی بنیاد پر ہے، ورنہ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں فن حدیث کے بعض نکات کا ذکر کر کے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت کرنے والوں میں حضرت عمرؓ کا شمار صحابہ کے اس طبقہ میں کرنا چاہئے جنہیں مکثرین کہتے ہیں، یعنی جن کی حدیثوں کی تعداد ہزار یا ہزار سے بالا ہو۔ شاہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

"پس ایں عزیزاںؒ از مکثرین باشند و شواہد ایں مقدمہ بسیار است لکن بسط مقال در آن باب فرصتے می طلبد" صفحہ ۲۱۲ ازالہ

(یعنی ان بزرگوں کو چاہئے کہ طبقہ مکثرین (ہزار یا ہزار سے بالا حدیثوں کی روایت کرنے والوں) میں ان کو شمار کیا جائے اس دعویٰ کی تائید میں بہت سی شہادتیں پیش ہو سکتی ہیں، مگر اس کی تفصیل کے لئے فرصت کی ضرورت ہے)

ؒ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں چند اور صحابیوں کو بھی شمار کیا ہے "عزیزاں" کے لفظ سے سب کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن میں حضرت عمرؓ بھی شریک ہیں ۱۲

خلاصہ یہ ہے کہ جن روایتوں کو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کرکے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ حدیثوں کی روایت کے قصے ہی کو ختم کردینا چاہتے تھے قطع نظر ان کمزوریوں کے جو ان روایتوں کی سندوں میں پائی جاتی ہیں میں پوچھتا ہوں کہ ان کے مقابلہ میں صحاح کی ان حدیثوں کو کیسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے جن کی اتنی بڑی تعداد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے کتابوں میں ملتی ہیں۔ اور یہ بحثیں تو اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب خواہ مخواہ یہ مان لیا جائے کہ حضرت عمرؓ کی طرف یہ روایتیں جو منسوب کی گئی ہیں ان کا مقصد وہی ہے جو حدیث کے مخالفین ان سے سمجھانا چاہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ معمولی تامل سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ لوگوں کو روایتوں کے اکثار سے منع فرماتے تھے، یعنی چاہتے تھے کہ کمّاً وکیفاً حدیثوں کے بیان کرنے میں کثرت کی راہ لوگ نہ اختیار کریں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن صحابیوں کو آپ نے روکا تھا، ان پر الزام حضرت کا یہی تھا کہ تم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے بیان کرنے میں اکثار کی راہ اختیار کی آپ کے الفاظ انکم اکثرتم الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بہ کثرت حدیثوں کی روایت کو وہ روکنا چاہتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے کس لفظ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ سرے سے کلیتہً روایت حدیث کے رواج ہی کو وہ مسدود کرنا چاہتے تھے بلکہ اسی سلسلہ میں قرظہ بن کعب صحابی سے شعبی نے یہ قصہ نقل کیا ہے اور مخالفین حدیث اس کو بھی عموماً اپنے خیال کی تائید میں پیش کرنے کے عادی ہیں۔ یعنی شعبی کہتے تھے کہ حضرت قرظہ بن کعب نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ

خرجنا فشیعنا عمر الی صرار	ہم مدینہ سے نکلے، تو میری مشایعت میں
ثم دعا بماء فتوضاء ثم قال	حضرت عمر صرار نامی مقام تک آئے پھر آپ
اتدرون لم خرجت معکم	نے پانی طلب کیا اور وضو کیا، پھر فرمایا تم

قلنا أردت أن تشيعنا وتكرمنا قال إن مع ذلك لحاجة خرجت إنكم تأتون بلدة لأهلها دوي بالقرآن كدوي النحل فلا تصدوهم بالأحاديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فتشغلوهم جودوا القرآن وأقلوا الرواية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم امضوا وأنا شريككم. جامع ص ۱۲۰/۲ وتذكرة الحفاظ

لوگوں نے سمجھا ہی کہ تمہارے ساتھ میں بھی (مدینہ سے نکل کر یہاں تک) کیوں آیا ہوں نے عرض کیا ہم لوگوں کی مشایعت کے لئے آپ تشریف لائے اور ہماری عزت افزائی فرمائی حضرت عمرؓ نے تب کہا کہ اس کے سوا ایک اور ضرورت بھی تھی جس کے لئے میں مدینہ سے نکل کر تمہارے ساتھ یہاں تک آیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم ایک ایسے شہر میں پہنچو گے جس کے باشندوں میں قرآن کی تلاوت اس طرح گونجتی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گونج پیدا ہوتی ہے، تو دیکھنا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو بیان کر کرکے تم لوگ ان لوگوں کو قرآن کی مشغولیت سے، روک نہ دینا قرآن کو استوار کرتے چلے جائیو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے حدیثوں کے بیان کرنے میں کمی کیجیو۔

اب جاؤ، اور میں تمہارا ساتھی ہوں،

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان تین صحابیوں والی روایت میں حضرت عمرؓ نے حدیثوں کے اکثار کی جہاں شکایت کی وہیں قرظہ کی اس روایت میں اپنے منشا کو ظاہر کرتے ہوئے قطعی طور پر حدیثوں کی روایت سے لوگوں کو منع نہیں کیا۔ بلکہ فرمایا کہ

اقلوا الرواية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم — اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے حدیثوں کے بیان کرنے میں کمی کیجیو،

ممانعت تو خیر دور کی بات ہے، میں تو حضرت عمرؓ کے ان الفاظ کو روایت حدیث کا حکم سمجھتا ہوں، البتہ یہ حکم ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے، یعنی کثرت کی راہ نہ اختیار کی جائے۔ ورنہ اقلال اور کمی کی شرط کی تکمیل کرتے ہوئے اپنے مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ حضرت عمرؓ حدیثوں کی روایت کا یقیناً حکم دے رہے ہیں، حافظ ابن عبدالبر نے بھی ان روایتوں کا تذکرہ کرکے یہی لکھا ہے کہ

هذا يدل على نهيه عن الاكثار وامره بالاقلال من الرواية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ص۱۲۲ — حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا الفاظ یہ بتلاتے ہیں کہ روایت حدیث میں کثرت اور زیادتی کو وہ روکنا چاہتے تھے اور اس کا حکم دے رہے ہیں کہ روایت حدیث میں کمی کی راہ اختیار کی جائے۔

پھر آگے چل کر وہی لکھتے ہیں اور بالکل سچ لکھتے ہیں کہ

ولو كره الرواية وذمها لنهى عن الاقلال والاكثار — اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت مطلقاً ان کے نزدیک ناپسند ہوتی اور اس فعل کو وہ کلیتہً برا خیال کرتے تو چاہیے تھا کہ روایتوں کے بیان کرنے میں کثرت و زیادتی اور قلت و کمی دونوں ہی سے لوگوں کو روک دیتے

باقی اکثار سے کیوں منع کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی بات کے منسوب کرنے میں منسوب کرنے والوں پر جو ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں

ان تعداد لوگوں سے عہدہ برآ ہونے کی توقع احتیاط کے اسی طریقے سے ممکن ہے حافظ ابن عبد البر نے بھی اسی توجیہ کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ کثرت روایت سے ممانعت اور قلت روایت کا حکم حضرت عمرؓ نے اسی لئے دیا تھا کہ کثرت کی صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بات کے منسوب ہو جانے کا زیادہ اندیشہ تھا۔ نیز اس کا بھی خوف تھا کہ جو حدیثیں لوگوں کو اچھی طرح محفوظ نہ ہوں اور پوری طرح اپنی یاد پر نہ ہو اس قسم کی حدیثوں کے بیان کرنے پر لوگ جری ہو جائیں گے۔

آخر میں اپنے اس بیان کو حافظ نے ان الفاظ پر ختم کیا ہے۔

ان ضبط من قللة بہ اتمہ الکثر منضبط المستکثر وھو ابعد من السھو والغلط الذی لا یؤمن مع الاکثار ص۱۲۲ جامع ۲۲	روائت میں کمی اور قلت کی راہ اختیار کرنے والوں کے لئے ضبط و احتیاط کی توقع روایتوں میں کثرت کی راہ اختیار کرنے والوں سے بھی زیادہ ہے، نیز بھول چوک اور غلطی سے وہ محفوظ نہیں رہ سکتا جو روایت میں کثرت کی راہ اختیار کرے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقصد یہ قطعاً نہ تھا کہ کلیۃً لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت کرنے سے روک دیا جائے بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان ہی حدیثوں کی حد تک لوگ اپنے بیان کو محدود رکھیں جن کے متعلق پورا اطمینان ہو کہ جو کچھ انھوں نے دیکھا یا سنا ہے وہی وہ بیان کر رہے ہیں۔ ایک خاص حدیث جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو بیان کرتے ہوئے لوگوں سے کہا تھا کہ

من عقلها ووعاها وحفظها فليحدث بها حيث انتهى	جس نے اس حدیث کو اچھی طرح حافظہ میں جمالیا، اور اس کو سمجھ لیا اور یاد کر لیا چاہتے

به راحلته ومن خشي ان لا يعيها فاني لا احل له ان يكذب علي ص۱۲۲

کو وہی اس کو ان مقامات تک بیان کرتا جائے جہاں تک پہنچ کر اس کا اونٹ رک جائے مگر جسے اندیشہ ہے کہ حدیث کو دل میں پورے طور پر جما نہیں سکا ہے میں اس کے لئے کبھی اس کو جائز نہ قرار دوں گا کہ میری طرف جھوٹ کو وہ منسوب کرے۔

حافظ نے حضرت عمرؓ کے ان الفاظ کو جو صحاح ستہ بلکہ بخاری و مسلم میں بھی موجود ہیں، پیش کرتے ہوئے پوچھا ہے کہ اگر حضرت عمر کا وہی مسلک ہوتا، جسے مخالفین حدیث ان کی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں تو لوگوں کو اس حدیث کے بیان کرنے کا حکم کیوں دیتے بلکہ ان کے آخری الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو اپنی یاد پر پورا اطمینان اور بھروسہ نہ ہو صرف ان ہی کو روکنا ہی حضرت عمرؓ کا اصل مقصود ہے، حافظ کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ

يخرج معناها على ان من شك في شئ تركه ومن حفظ شيئا واتقنه جاز له ان يحدث به وان الاكثار يحمل الانسان على التقحم في ان يحدث بكل ما سمع من جيد وردي وغث وسمين ص۱۲۳

حضرت عمرؓ کے ان الفاظ سے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ حدیث کے متعلق کسی قسم کا شک اگر رکھتا ہے تو چاہئے کہ اس حدیث کی روایت ترک کر دے اور جس نے حدیث کو یاد رکھا ہے اور اچھی طرح سے اس کو محفوظ کر لیا ہے اس کے لئے جائز ہے کہ لوگوں سے اسے بیان کرے، بہرحال اکثار یعنی روایت میں کثرت و زیادتی کے جس طریقہ کا حضرت عمرؓ انسداد کرنا چاہتے تھے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جن

لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ بھلی بری درست
ونادرست جو بات بھی ان کے کان تک پہنچی اسے
بیان کرنے لگتے ہیں، وہی اس حکم کے مصداق
ہیں اور ان ہی سے اس حکم کا
تعلق ہے

آخر دینی زندگی کی جو سہری تعمیر خبر آحاد کی ان حدیثوں پر جب موقوف نہیں ہے، اسی لئے ہر مسلمان تک ان کا پہنچانا یوں ہی غیر ضروری ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تبلیغ میں عمومیت کی راہ اسی لئے اختیار نہیں فرمائی ایسی صورت میں کھلی ہوئی بات ہے کہ جو کچھ بیان کر رہا ہے بیان کرنے والے کو جب اس پر پورا اطمینان نہیں ہو تو خواہ مخواہ ان کے بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے، بلکہ مسلمانوں پر جو ذمہ داریاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی روایت کرنے میں عائد کی گئی ہیں، ان کا اقتضار یہی ہے کہ ایسی روایت سے آدمی دامن کش ہو کر گذر جائے مشہور حدیث نبوی جس میں فرمایا گیا ہے کہ

کفی بالمرءِ کذبا ان یحدث بکل ماسمع — کسی شخص کے جھوٹ کے لئے یہ کافی ہے کہ جو کچھ سنے اسے بیان کرتا چلا جائے۔

اس میں جیسا کہ حافظ ابن عبدالبر نے بھی لکھا ہے، احتیاط کے اسی طرز عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہی نقطۂ نظر تھا جس کا ذکر بعض صحابہ اس وقت کرتے تھے، جب لوگ ان سے کہتے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں کیوں نہیں بیان کرتے، بخاری میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے حوالہ سے یہ مکالمہ نقل کیا گیا ہے، یعنی عبداللہ بن زبیر کہتے تھے کہ میں نے اپنے والد زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک دفعہ عرض کیا کہ آپ کو میں دیکھتا

ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں بیان کرتے، جواب میں حضرت زبیر نے فرمایا کہ

اما انی لم افارقه منذ اسلمت ولکنی سمعته یقول من کذب علی متعمدا فلیتبوء مقعده من النار

واقعہ یہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں کبھی جدا نہ ہوا لیکن میں نے ان ہی سے سنا ہے کہ قصداً مجھ پر جو جھوٹ باندھتا ہے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنا لے۔

حالاں کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیثوں کی کافی تعداد مروی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو پھر بھی حضرت سے کمی روایت کی شکایت تھی، ان ہی شکایتوں کو سن کر آپ فرماتے

انی لیمنعنی ان احدث حدیثا کثیرا ان النبی صلی اللہ علیه وسلم قال من تعمد علی الخ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو میں کثرت سے جو بیان نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ من تعمد والی روایت مجھ کو اس سے روکتی ہے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ روایت کی کثرت میں حضرت انسؓ کو اس کا اندیشہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جائے بعض صحابی جب زیادہ عمر اور بوڑھے ہو گئے تھے لوگ ان سے عرض کرتے کہ رسول اللہ کی کچھ حدیثیں بیان کیجئے تو فرماتے

کبرنا ونسینا والحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم لشدید (ابن ماجه)

ہم اب مسن ہو گئے، بھول گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے حدیث کا بیان کرنا بڑا سخت معاملہ ہے۔

قرظہ بن کعب جن کو کوفہ رخصت کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اقلال روایت کی وصیت کی تھی ان کے متعلق بھی لکھا ہے کہ جب وہ کوفہ پہنچے، اور لوگوں نے ان سے عرض کیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں کچھ بیان کیجئے تو انھوں نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ

نہانا عمر بن الخطاب ص۱۲۱ ج۲ جامع — ہمیں عمر بن الخطاب نے اس سے منع کیا ہے

بعض روایتوں میں ہے کہ قرظہ نے کہا کہ عمرؓ کی اس وصیت کے بعد

ما حدثت بعد ہا حدیثا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ص۱۲۱ ج۲ جامع — حضرت عمرؓ کی ممانعت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے میں نے کوئی حدیث نہیں بیان کی

حدیثوں کے باب میں احتیاط ہی کی روش تھی جس کی پابندی بعد کو لوگ کرتے رہے، امام مالک کے متعلق ان کے شاگرد رشید امام شافعی تو کلیہ ہی بیان کرتے تھے کہ

کان مالک اذا شک فی الحدیث ترکہ کلہ الدیباج المذہب ص۲۲ — امام مالک کو جب کسی حدیث میں شک پیدا ہو جاتا تو اس کو کلیۃً ترک کرتے (یعنی اس حدیث کو بیان ہی نہیں کرتے تھے)

لوگوں نے لکھا ہے کہ حضرت امام مالک کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ میں نے ان کے کمرے سے سات صندوق نکالے، جن میں صرف ابن شہاب زہری کی حدیثوں کے مسودات بھرے ہوئے تھے، مسودوں کی حالت یہ تھی کہ

ظہورہا وبطونہا ملأی — یعنی ہر ورق کے دونوں صفحات بھرے ہوئے تھے

ان کو باہر نکال کر لائے اور امام مالک کے شاگردوں کے حوالہ کیا۔ لوگوں نے پڑھنا شروع کیا۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان کو معلوم ہوا کہ ان مسودوں میں جو کچھ

لکھا ہوا ہے، امام مالک نے ایک چیز بھی کسی کے سامنے ان سے بیان نہ کی تھی ان ہی کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ

لما مات مالک اصیب فی بیتہ صنادیق عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما لیس فی الموطاء منہ شیٔ الا حدیثین	جب امام مالک کی وفات ہوئی تو گھر میں چند صندوق پائے گئے جن میں حضرت عبداللہ بن عمر کی روایتیں تھیں ایسی روایتیں جن میں سے ان کی کتاب موطا میں صرف دو حدیثیں پائی جاتی ہیں۔

امام مالک کی کتاب موطا کے متعلق لوگوں نے لکھا ہے کہ شروع میں دس ہزار حدیثوں پر یہ کتاب مشتمل تھی، لیکن ہر سال امام مالک اس پر نظر ثانی کرتے اور جس روایت میں معمولی شک بھی ہوتا، اس کو کتاب سے ساقط کر دیتے۔ اس طریقہ سے بڑا حصہ روائتوں کا موطا سے خارج ہوگیا، ص۲۵ دیباج۔ امام مالک خود بیان کرتے تھے کہ ابن شہاب زہری سے میں نے جتنی حدیثیں سنی ہیں ان میں ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس کا میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔

الخطیب نے امام بخاری کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ

ترکت عشرۃ آلاف حدیث لرجل فیہ نظر و ترکت مثلہا او اکثر بغیرہ فیہ نظر ص۲۵ ج۲ تاریخ بغداد	کسی شخص (راوی) کی روایت کردہ دس ہزار حدیثوں کو میں نے اس لئے چھوڑ دیا کہ اس شخص میں کوئی بات محل غور و فکر نظر آتی تھی اور اسی قدر یا اس سے زیادہ مقدار والی حدیثوں کو میں نے اسی لئے ترک کر دیا کہ ان کے بیان کرنے والے میں بھی کوئی بات قابل غور نظر آئی،

احتیاط کرنے والے اس سلسلہ میں کن حدود تک پہونچ گئے تھے اس کا اندازہ اسی

واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے جس کا ذکر ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں کیا ہے، تیسری صدی ہجری کے ایک محدث ابن رستم ہیں جن کا نام احمد بن مہدی بن رستم تھا، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ

افتقد من کتبہ کتاب قبیصہ ثم وجد علیہ فترک قرأتہ ج ۱ ص ۴۲	قبیصہ (تابعی) کی روایت کردہ حدیثوں کا مکتوبہ مجموعہ گم ہو گیا، بعد کو گم ہونے کے بعد وہی نسخہ ابن رستم کو مل گیا، (مگر اس لئے کہ درمیان یہ نسخہ غائب ہو گیا تھا) اس کی مندرجہ روایتوں کا پڑھنا چھوڑ دیا۔

یعنی ان کو شبہ ہوا کہ جس زمانہ میں کتاب غائب رہی، ممکن ہے اس میں کسی نے کچھ کمی و بیشی کر دی ہو، صرف اس شک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس حصہ کا پڑھنا ہی انھوں نے ترک کر دیا اس میں شک نہیں کہ حدیثوں کی روایت میں احتیاط کی ان نزاکتوں کا احساس خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا پیدا کرایا ہوا تھا، عرض کر چکا ہوں کہ من کذب علی متعمداً والی روایت قریب قریب تواتر کے درجہ میں جو پہونچ گئی ہے اس کی وجہ یہی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عموماً صحابہ میں روایت حدیث کی ذمہ داریوں کو مختلف طریقوں سے راسخ کرانا چاہتے تھے، صحاح کی کتابوں میں تو مجھے یہ روایت نہیں ملی لیکن امام ابو جعفر طحاوی نے مشکل آلآثار میں اپنی متصل سند کے ساتھ اس کو درج کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی مجلس میں ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے ایک حدیث بیان کی، مجلس میں حضرت مالک بن عبادہ صحابی بھی شریک تھے، آپ نے فرمایا کہ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عھد الینا فی حجۃ الوداع فقال علیکم بالقرآن وانکم سترجعون	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حجۃ الوداع) (آخری حج) میں ہم لوگوں کو اس عہد کا پابند بنا فرمایا کہ چاہئے کہ قرآن کو پکڑے رہو، قریب

الی قوم یشتہون الحدیث عنی فمن عقل شیئاً فلیحدث بہ ومن افتری علی فلیتبوء بیتاً او مقعداً فی جہنم (مشکل الآثار)

ہے کہ تم ایسے لوگوں کے پاس واپس کئے جاؤ گے جو چاہیں گے کہ میری حدیثیں ان سے بیان کرو پس اس سلسلہ میں جس کسی نے کسی بات کو سمجھ لیا ہے اور یاد کر لیا ہے اسے چاہئے کہ اس حدیث کو بیان کر دے (اور یاد رکھو) کہ قصداً میری طرف جو جھوٹ کو منسوب کرے گا اسے اپنا ٹھکانہ یا (فرمایا) کہ اپنا گھر چاہئے کہ جہنم میں بنالے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وداعی وصیت کے ان الفاظ میں اور حدیثوں کی روایت کرنے میں حضرت عمرؓ لوگوں پر جن الفاظ کے ساتھ تاکید فرماتے تھے۔ کچھ فرق ہے اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی مبارک وصیت کی تجدید حضرت ابوبکرؓ بھی اور حضرت عمرؓ بھی اپنے اپنے عہد خلافت میں فرماتے رہے، صحابہ کو بھی روایت حدیث کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی اور صحابہ کے بعد مسلمانوں کی جو جماعت حضرت عمرؓ کے سامنے آئی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے استفادے کا موقع تو کیا ملتا، ان میں بڑی تعداد ایسوں کی تھی جنہوں نے پیغمبر کو دیکھا بھی نہ تھا مگر حضرت عمرؓ کی دارو گیر کی غیر معمولی سختیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ جب بڑے بڑے صحابہ میں کامل اطمینان کے بغیر حدیثوں کی روایت کرنے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی تو دوسروں کے لئے جسارت کا موقعہ ہی کیا تھا یہی وجہ تھی جو امیر معاویہ اپنی حکومت کے زمانہ میں لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ

(باقی آئندہ)

امام دارقطنی

از

(جناب مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری استاذ مدرسۂ عالیہ کلکتہ)

دارقطنی چوتھی صدی کے ان مشہور محدثین میں سے ہیں جن کو مورخ کبھی فراموش نہیں کرسکتا اور بغیر ان کے تذکرہ کے چوتھی صدی کی تاریخ نامکمل ہوگی۔

نام و نسب نام علی کنیت ابوالحسن اور حافظ بغدادی کے نام سے مشہور ہیں[1] اب وطن کی نسبت سے دارقطنی کہتے ہیں، سلسلۂ نسب یہ ہے ابوالحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی بن مسعود بن دینار بن عبداللہ الدارقطنی البغدادی[2] بعض تذکروں میں مسعود اور دینار کے درمیان ایک اور نام نعمان کا اضافہ ہے[3]

وطن دارقطن بغداد میں ایک بڑا محلہ کرخ اور نہر عیسٰی بن علی کے درمیان واقع ہے[4] اسی محلہ میں عباسی خلیفہ المقتدر باللہ کے زمانہ[5] میں ماہ ذی القعدہ ۳۰۶ھ مطابق ۹۱۹ء[6] میں پیدا ہوئے طاش کبریٰ زادہ م ۹۶۲ نے لکھا ہے کہ ولد سنۃ خمس او ست ثلثمائۃ لیکن یہ شک صحیح نہیں کیونکہ تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ ان کی پیدائش ۳۰۶ھ میں ہوئی اور خود دارقطنی کا بھی بیان ہے ولدت سنۃ ست و ثلثمائۃ لہٰذا دارقطنی کے اس بیان کے بعد کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی ہے۔

دارقطن ارباب علم و فضل کا گہوارہ رہا ہے اسی محلہ میں محمد بن احمد بن عبداللہ بن زیاد القطان[8] اور اکتسابِ فیض کرتے رہے اور اسی خطۂ پاک کے محمد بن زیاد بن ہارون الدارقطنی م ۳۵۱ھ[9] اور ابوالفرج محمد

---

[1] کشف الظنون [2] بستان المحدثین [3] تعلیق المغنی [4] معجم البلدان [5] دول الاسلام الذہبی ج ۱ [6] ابن الفقیہ [7] اعلام ج ۲ [8] مفتاح السعادہ ج ۲ [9] کتاب الاوقات والتبع، نسخہ خطیہ کتب خانہ علم و حکمت بہار شریف۔

[10] معجم الادباء ج ۱۷ [11] ایضاً ج ۱۸

بن الحسن الدارقطنی ہیں سمعانی صاحب کتاب الانساب جب ادھر سے گذر رہے تھے تو ان کے رفیق شیخ سعد اللہ بن محمد المقری نے دارقطن میں اپنی مسجد دکھائی تھی[1]

تعلیم | دارقطنی نے ابتدائی تعلیم بغداد میں حاصل کی پھر علوم وفنون کی تحصیل کے لئے کوفہ بصرہ شام، واسط اور مصر وغیرہ کی بادیہ نوردی کی۔ وقت کے ائمہ فن اور اساطین حدیث سے فیض واکتساب کرکے ائمہ وقت کی صف میں شامل ہوئے علم حدیث اور معرفت علل اسمائے رجال میں وہ کمال پیدا کیا کہ محدثین کے بیان کے مطابق یہ فن انہی پر ختم ہوگیا[2]۔"

حلقۂ درس | تکمیل علوم وفنون کے بعد مسند درس پر جلوہ افروز ہوتے اور اس میں بھی ایسی شہرت ہوئی کہ اطراف وجوانب سے تشنگان علوم جوق در جوق ان کے حلقۂ درس میں شامل ہونے لگے اور اس درسگاہ نے بڑے بڑے علماء اور فضلاء کو پیدا کیا۔

اساتذہ | ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز البغوی م ۳۱۰، ابوبکر محمد بن حسن نقاش م ۳۵۱ ابوسعید اصطخری، ابوسعید القزاز، محمد بن الحصین الطبری، ابوبکر بن مجاہد، ابراہیم بن عبدالصمد م ۳۲۵، ابوبکر بن ابی داؤد م ۳۱۶، یحییٰ بن محمد بن صاعد م ۳۱۸، ابن درید، ابن یبرود علی بن عبداللہ بن مبشر، محمد بن القاسم المحاربی، ابوعلی محمد بن سلیمان المالکی، ابوعمر القاضی ابوجعفر احمد بن اسحاق بن بہلول التنوخی م ۳۱۰، ابن زیاد النیسابوری م ۳۲۴، قاضی بدرالدین الہیثم، احمد بن القاسم الفرائضی، حسین محاملی، عمر بن احمد بن علی القطان، محمد بن عبداللہ بن غیلان، محمد بن اسحاق ابن عبدالرحیم، الحسن بن رشیق العسکری م ۳۷۰، ابواحمد حمزۃ بن محمد الدہقان العقبی، ابوزید محمد بن محمد بن احمد الفاشانی الفقیہ م ۳۷۱، ابوبکر محمد بن محمد بن احمد الامکانی، ابوبکر احمد بن محمد بن عیسی، ابوبکر محمد بن علی بن الحسین النقاش نزیل تنیس م ۳۶۹، حسین بن احمد بن رستم المعروف بابن زنبور الماذرائی، ابوبکر محمد بن جعفر الصیرفی اسماعیل الخطبی م ۳۵۰، محمد الدارقطنی م ۳۵۱، احمد بن سہل ابوبکر الرملی المعروف بابن النابلی ابن عقدہ م ۳۳۲، ابن الانباری م ۳۲۸، ابوحفص عمر بن احمد المروزی م ۳۲۵،

[1] تذکرہ ج ۳ [2] انساب [3] اشعۃ اللمعات

ابو بکر احمد بن سلیمان البغدادی م ۳۴۸، الختلی ابو عبد اللہ عبد الرحمن، علی بن الفضل السطحی م ۳۴
محمد بن حمدویہ المعروف بالخازی م ۳۲۱، احمد بن عبید، محمد بن عبد اللہ البغدادی م ۳۵۴
دعلج بن احمد م ۳۵۱، عبد الباقی بن قانع البغدادی م ۳۵۱، ابو احمد حامد بن احمد بن محمد بن
احمد المروزی م ۳۴۸، ابو بکر محمد بن عمر بن محمد بن العبانی م ۳۵۵، ابو سعید احمد بن محمد الحمی المروزی
م ۳۵۰، حمزہ بن محمد ابو القاسم الکنانی المصری م ۳۵۷، ابو اسحاق ابراہیم بن حماد الازدی م ۳۲۳
ابو عبد اللہ الحسین بن اسماعیل م ۳۳۰، محمد بن نوح م ۳۲۱، محمد بن احمد بن حفص م ۳۳۱
ابو طالب احمد بن نصر بن طالب م ۳۲۳، ابو الحسین علی بن محمد بن عبید م ۳۳۰، ابو الطیب
محمد بن جعفر بن دران البغدادی م ۳۵۷، ابو محمد عبد اللہ م ۳۷۳۔ ابن مہران ابو مسلم عبد الرحمن
بن محمد بن عبد اللہ البغدادی م ۳۷۵، محمد بن المظفر بن موسیٰ بن عیسیٰ ابو الحسین البغدادی
م ۳۷۹ ابراہیم بن عبد الصمد بن موسیٰ بن محمد بن ابراہیم وھو اخر من روی الموطا عن
ابی المصعب تمام مورخین اور تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ دار قطنی نے بغوی سے بھی علم حدیث
اخذ کیا ہے اور بغوی کی وفات ۳۱۷ھ میں ہوئی اور دار قطنی کی پیدائش ذوالقعدہ ۳۰۶ھ ہے
اس لحاظ سے بغوی کی وفات کے وقت دار قطنی کی عمر زیادہ سے زیادہ چار سال کی ہوتی ہے
چنانچہ ابو یوسف قواس کا بیان ہے کہ جب ہم بغوی کے پاس جاتے تھے تو دار قطنی بچے تھے
ان کے ہاتھ میں روٹی اور اس پر سالن ہوتا تھا اگر اس وقت کے سماع کو صحیح تسلیم کر لیا جائے
تو ان کے حافظہ اور ذوق و شوق کا ثبوت فراہم ہوتا ہے لیکن پھر بھی بغوی سے روایت میں
دار قطنی تدلیس کرتے ہیں ابن طاہر کا بیان ہے کہ للدار قطنی مذہب خفی فی التدلیس
یقول فیما لم یسمعہ من البغوی قری علی ابی القاسم البغوی حدثکم فلان
نسخہ ابو بکر البرقانی م ۴۲۵ ان کا نام صاحب تعلیق المغنی نے ابو بکر محمد بن احمد ابن غالب
المعروف بالبرقانی لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں محمد، ابو بکر برقانی کے والد کا نام ہے خود برقانی کا

ئ طرح التثریب ۲ تذکرہ ج ۳ ۳ تعلیق المغنی

نہیں اور طرح التشریح امیں ہے ابومنصور محمد بن محمد بن احمد البرقانی، لیکن یہ بھی درست نہیں، یہاں نسبت میں اختلاط ہے یہ ابومنصور، برقانی نہیں بلکہ نوقانی ہیں، مشتبہ النسبۃ للذہبی میں ہے اس لئے اب صحیح نام ونسب اس طرح ہوا ابوبکر احمد بن محمد بن احمد بن غالب الخوارزمی البرقانی^۱ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ عبدالغنی منذری صاحب ترغیب وترہیب ...... از وے (از دارقطنی) تلمذ وشاگردی کردہ اند لیکن منذری ترغیب وترہیب والے دارقطنی سے بہت متاخر ہیں اور ان کا نام عبدالعظیم زکی الدین م ۶۵۶ ہے اور جو دارقطنی کے شاگرد ہیں وہ عبدالغنی بن سعید الازدی المصری م ۴۰۹ھ صاحب کتاب المؤتلف والمختلف ہیں اور دوسرے تلامذہ | حافظ ابونعیم اصبہانی صاحب حلیۃ الاولیاء م ۴۳۰ھ حاکم صاحب مستدرک م ۴۰۵ھ تمام رازی صاحب فوائد مشہورہ م ۴۱۴ ابوحامد اسفرائنی ابوذر عبد بن احمد ہروی م ۴۳۴ھ، ابومحمد خلال، ابوالقاسم بن محسن، ابوطاہر بن عبدالرحیم، قاضی ابوالطیب طبری، ابوبکر بن بشران، ابوالقاسم حمزۃ السہمی م ۴۲۷ھ، ابومحمد جوہری، ابوالحسن بن الآبنوسی، عبدالصمد بن مامون، ابوالحسین بن المہدی بالیدم ۴۶۵ھ، ابوجعفر محمد بن احمد بن محمود السمنانی، ابوسلیمان داؤد بن حبیب السینیزی، عبدالواحد ابن الحسن المقری الابہری عبدالوہاب بن عبداللہ المعروف بابن الاودعی، ابومسعود صالح بن احمد، ابن النابلسی، ابوعبدالرحمٰن محمد بن الحسین السلمی م ۴۱۲ھ الحسن بن علی التمیمی الواقدی م ۴۴۴ھ

مشتبہ النسبۃ للذہبی میں ہے

البرقانی بالفتح برقان من قری خوارزم منہا الحافظ ابوبکر احمد بن محمد بن احمد بن غالب صاحب التصانیف^۲	برقانی باء کے فتح کے ساتھ برقان خوارزم میں ایک گاؤں ہے، اسی گاؤں کے حافظ ابوبکر احمد بن محمد بن احمد بن غالب صاحب تصانیف ہیں ان کی وفات ۴۲۵ھ میں ہوئی

---

^۱ تذکرہ ج ۳ ^۲ بستان المحدثین

سنہ ۴۲۵ وبنونین الاولیٰ مفتوحۃ
نوقان ھی قصبۃ طوس منہا
...... وابو منصور محمد
بن محمد بن احمد النوقانی
حدث عن الدارقطنی بالسنن

اور دونوں سے جس میں پہلے کو فتحہ یعنی نوقان
تو یہ طوس کا قصبہ ہے اور وہیں کے ابومنصور
محمد بن محمد بن احمد النوقانی ہیں دارقطنی سے
ان کے سنن کے راوی ہیں

حافظ ابن حجر م ۸۵۲ لکھتے ہیں

البرقانی نسبۃ الی برقان من
قری خوارزم الحافظ ابوبکر
احمد بن محمد بن (احمد بن)
غالب صاحب التصانیف مات
سنۃ ۴۲۵ وبالضم نسبۃ الی والد
جعفر بن برقان ما علمتہ۔
وبنون مفتوحۃ وقبل القاف
واو بدل الراء نسبۃ الی
نوقان قصبۃ طوس منہا.
...... وابو منصور محمد
بن محمد بن احمد النوقانی
حدث عن الدارقطنی بالسنن

البرقانی یہ برقان کی طرف جو خوارزم میں ایک
گاؤں ہے۔ منسوب ہے۔ یہیں کے حافظ ابوبکر
احمد بن محمد بن (احمد بن) غالب صاحب تصانیف
ہیں ان کی وفات ۴۲۵ھ میں ہوئی اور اگر با کو
ضمہ سے پڑھا جائے تو اس وقت جعفر کے والد
برقان کی طرف منسوب ہوتا ہے جہاں تک مجھ
کو علم ہے۔ اور اگر نون کو فتحہ اور بجائے را کے
واؤ کے ساتھ یعنی نوقان پڑھا جائے تو اس وقت
میں یہ طوس کے قصبہ کی طرف منسوب ہوتا ہے
...... اور اسی خط کے ابو منصور محمد بن محمد
بن احمد النوقانی ہیں جو دارقطنی سے ان کے
سنن کے راوی ہیں۔

ادب ولغت | علمائے سلف لغت وادب کی طرف خاص طور پر اپنی توجہ مبذول کرتے تھے اور علم لغت کے بغیر کلام اللہ میں گفتگو کو ناجائز تصور کرتے تھے اس لئے محدثین کرام حدیث وفقہ

یہی وجہ ہے کہ محدثین کرام ادب وزبان کے ماہر ہوتے تھے چنانچہ قتادہ مطابق ۱۱۸ کے متعلق ہے
(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

سے پہلے علم ادب کی طرف رجوع کرتے تھے چنانچہ دارقطنی نے بھی پہلے اس طرف توجہ کی اور ائمۂ وقت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرکے ادب و شعر میں کمال حاصل کیا۔

ازہری کا بیان ہے کہ جب دارقطنی مصر پہنچے تو وہاں مسلم بن عبداللہ نامی مدینہ کے ایک علوی شیخ تھے ان کے پاس کتاب الانساب حصر بن داؤد زہیر بن بکار کی روایت سے تھی یہ انساب کے علاوہ اشعار کا بھی مجموعہ تھا اور اس میں دلچسپ ادبی لطافتیں تھیں، مسلم خود میدان فصاحت کے شہسوار اور عربی زبان کے ماہر تھے لوگوں نے دارقطنی سے سوال کیا کہ آپ اس کتاب کی قرأت کیجئے کیونکہ آپ کی زبان سے سننے کے لئے لوگ مشتاق ہیں انھوں نے قبول کرلیا اور اس کے لئے ایک وقت مقرر ہوا اور اہتمام کے ساتھ مجلس ترتیب دی گئی، مصر کے تمام اہل علم و ادب اور صاحب فضل و کمال اس ارادہ سے شریک ہوئے کہ دارقطنی کی غلطیوں یا لغزشوں پر گرفت کی جائے لیکن اس میں لوگ ناکامیاب رہے اور تمام حاضرین اس پر متحیر تھے شیخ علوی سے رہا نہ گیا اور وہ چلا اُٹھے وعربیۃ ایضاً یعنی آپ کو عربی زبان پر بھی اتنی قدرت حاصل ہے۔[۱]

ان کو شعرا کے دیوان ازبر تھے فقیل[۲] کان یحفظ دواوین جماعۃ چنانچہ سید حمیری کا مکمل دیوان محفوظ تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کان راسا فی اللغۃ والعربیۃ وایام العرب والنسب (تذکرہ ج ۱) شعبہ م ۱۶۰ کا جو درجہ حدیث میں ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان کے متعلق اصمعی جیسے ماہر علم و ادب کا بیان ہے کہ لم یر احد قط اعلم بالشعر من شعبہ ابن المبارک المروزی م ۱۸۱ کے متعلق علما کی رائے ہے کہ جمع العلم والفقہ والادب والنحو واللغۃ والزھد لہ انساب للسمعانی

[۲] تذکرۃ الحفاظ ذہبی [۳] ان کی کنیت ابوالہاشم نام اسماعیل بن محمد معروف بہ سید حمیری ہیں علمائے ادب کا خیال ہے کہ جاہلیت و اسلام میں تین ہی شعرا بہت پرگو ہیں بشار ابوالعتاہیہ اور تیسرے سید حمیری ان کے مضامین بلند اور بندش چست ہوتی تھی، الفاظ غریبہ کے استعمال سے محترز اور محتاط تھے، ایک بار لوگوں نے ان سے شکایت کی کہ آپ عام شعرا کے دستور کے مطابق غریب

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

خلاصہ یہ کہ عربی زبان وادب پر پورا عبور اور کافی مہارت تھی حقیقت تو یہ ہے کہ نہ صرف
ادب سے بلکہ ہر علم و فن سے ان کو دلچسپی تھی ابوالقاسم الازہری کا بیان ہے کہ جس علم کا تذکرہ
آتا تو ان کے پاس معلومات کا ذخیرہ ہی نکلتا محمد بن طلحۃ النعمانی دارقطنی کے ساتھ ایک روز
دعوت میں شریک ہوئے جس میں کھانے کا ذکر چھڑ گیا پھر کیا تھا دارقطنی نے اس کے متعلق
نوادرات و عجائبات کا انبار لگا دیا جس سے رات کا بیشتر حصہ ختم ہو گیا

دارقطنی پر شیعہ ہونے کا الزام | یہ پہلے بیان کر چکا ہوں کہ دارقطنی دیوان سید حمیری کے حافظ تھے اور سید حمیری شیعہ
بڑا دریدہ دہن گستاخ شاعر تھا اس لئے دارقطنی بھی تشیع کی طرف منسوب کئے
گئے اور ان کو شیعہ کہا گیا حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں وھذا النسب الی التشیع ابن خلکان میں
ہے فنسب الی التشیع من ذلک اور اس الزام کی تقویت اس سے بھی ہو جاتی ہے کہ
جوزجانی صاحب کتاب الضعفاء م ۲۵۶ پر آپ نے جرح ایسے لفظوں سے کی ہے جو خاص

(بقیہ حاشیہ ص گذشتہ) الفاظ استعمال کیوں نہیں کرتے کہ اس کی تشریح آپ سے کرائی جاتی کہا کہ ایسا کلام جو
دلوں کو بھائے اور قوت سامعہ محظوظ ہو یہ اس شعر سے بدرجہا بہتر ہے جس میں تعقید ہو اور طائر خیال
کی بلند پروازی وہاں تک نہ پہنچ سکے، شراب کا دلدادہ تھا امرائے اہواز میں سے ایک نے سید حمیری
کو دیکھا کہ چہرہ کا رنگ فق ہے پوچھا کیا بات ہے؟ کہا میں نے آپ کی وجہ سے شراب پینا چھوڑ دیا
ہے اسی وجہ سے میری یہ زبوں حالی ہے امیر نے کہا نہیں اجازت ہے تم پیا کرو۔ سید حمیری نے کہا میرے
پاس کچھ نہیں ہے کیسے پیوں؟ امیر نے اپنے خازن سے کہا اکتب بمئتی دورق میبختج سید حمیری
نے کہا اس میں بلاغت نہیں ہے بلکہ اس طرح کہئے اکتب بمئتی دورق مئی اور خنج کو حذف
کر دیجئے مئی نبیذ کو کہتے ہیں، شاعرانہ کمال کے باوجود سید حمیری کا نام اور کلام دونوں صفحۂ ہستی سے
ختم ہو گیا اور لوگوں نے ان کو بھلا دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بعض ازواج مطہرات اور صحابہ کرام
رضوان اللہ علیہم اجمعین کے شان میں گستاخی اور سب وشتم کیا کرتا تھا نہایت بدزبان اور دریدہ
دہن غالی شیعہ تھا، اسی کا کلام ہے انی امرؤ حمیری غیر مؤتشب جدی رعین واخوالی ذو
ذو یزن ثم الولاء الذی ارجو النجاۃ بہ یوم القیامۃ للھادی ابی الحسن (تذکرۃ البیان والتبیین)
(ترجمہ) میں خالص حمیری ہوں اور میرے دادا رعین اور ماموں قلعہ یزن والے ہیں پھر ابوالحسن (علیؓ) کی محبت
وولایت مجھے حاصل ہے جو قیامت کے دن مری نجات کا ذریعہ ہوگی۔

عقائد شیعی کی صدا معلوم ہوتی ہے وہ الفاظ یہ ہیں وکان فیہ انحراف عن علی بن ابی طالب لیکن یہ محض الزام ہی الزام ہے اس کو حقیقت اور صداقت سے کوئی تعلق نہیں یہ ان کے علاوہ اور بھی سلف صالحین ہیں، جن پر شیعیت کا غلط الزام لگایا گیا ہے لیکن ان بزرگوں کو شیعہ کے خیالات فاسدہ، عقائد باطلہ، اور اوہام کاذبہ سے کوئی علاقہ نہیں جو اہل تشیع کے بنیادی عقائد ہیں، بعض فروعی خیالات میں اتحاد ہو یہ دوسری بات ہے، جس طرح حاکم کے متعلق حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں

معنی تشیع او آں است کہ قائل بود بہ تفضیل حضرت علیؓ بر حضرت عثمانؓ کہ مذہب جمعے از اسلاف ہم بود۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ دارقطنی تو شیعہ کے اس قسم کے فروعی عقائد سے بھی بری تھے ان کا کوئی عقیدہ جمہور محدثین و سلف صالحین کے خلاف نہ تھا ابن طاہر کا بیان ہے کہ بغداد میں ایک بار تفضیل علی میں جھگڑا ہوا لوگ دارقطنی کے پاس پہنچے ان کا بیان ہے کہ میں نے (دارقطنی) اس مسئلہ میں خاموش رہنا پسند کیا مگر پھر خیال آیا کہ دین میں سکوت بہتر نہیں اور کہا کہ حضرت عثمانؓ افضل ہیں کیونکہ تمام صحابہ کا اس پر اتفاق ہے اور یہی اہل سنت کا مسلک ہے اور اسی مقام سے رفض کی ابتدا ہوتی ہے[۲] جوزجانی کے متعلق جو انحراف عن علی فرمایا ہے اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ جوزجانی تفضیل علی کے قائل نہیں اس لئے ان پر جرح کی جا رہی ہے بلکہ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں گستاخی اور سوء ادبی کے کلمات استعمال کرتے تھے اس لئے ایسا کہا۔ ایک روز[۳] جوزجانی مرغی ذبح کرنے کے لئے آدمی تلاش کر رہے تھے اتفاق وقت کہ کوئی صاحب تیار نہ ہوئے تو انھوں نے کہا کہ تم لوگ مرغی ذبح کرنے سے بھاگتے ہو حالانکہ حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) نے ایک دن میں ستر ہزار آدمیوں کو ذبح کر ڈالا لہٰذا دارقطنی کا یہ جرح عقیدۂ شیعہ کے ماتحت نہیں ہے بلکہ اہل سنت کے صحیح الاعتقاد جذبات کے ماتحت ان پر جرح کی گئی ہے کیونکہ حضرت علیؓ کیا بلکہ کسی صحابہ رضوان اللہ علیہم کی شان میں گستاخی

---

[۱] بستان [۲] تذکرہ [۳] خلاصہ خزرجی انصاری

اور سو راوی کو اہل سنت جائز نہیں قرار دیتے ہیں۔ یہ رجہاں تک جوزجانی کی توثیق کا تعلق ہے انہی کے متعلق فرماتے ہیں کان من الحفاظ الثقات المصنفین ابن عقدہ م ۳۳۲ھ جو دار قطنی کے اساتذہ میں ہیں لیکن چونکہ وہ غالی شیعہ اور مثالب صحابہ کا املا کرایا کرتے تھے اس لئے دار قطنی ان سے خوش نہیں تھے ابو عبد الرحمٰن السلمی م ۴۱۲ھ نے جو دار قطنی سے مختلف سوالات کرنے میں مشہور ہیں ایک روز ابن عقدہ کے متعلق پوچھا تو دار قطنی نے کہا حافظ محدث ولم یکن فی الذین یقوی الا انہ یزید فیہ علی ھذا ابن طاہر کا بیان ہے کہ دار قطنی کو میں نے کہتے ہوئے سنا کہ ہو (ابن عقدہ) رجل سوء۔ ابن عقدہ کو رجل سوء کیوں کہا اور اس سے کیا مراد ہے؟ سنئے کانہ یشیر الی الرفض، یہی سلمی ابن مظفر بغدادی م ۳۷۹ھ جو دار قطنی کے استاد اور برقانی کے خیال کے مطابق دار قطنی نے کئی ہزار حدیث ان سے لی ہیں ان کے متعلق دار قطنی سے دریافت کیا گیا کہ کیا یہ مائل بہ شیعیت ہیں؟ کہا ہاں مگر مقدار کم ہے جس سے ان شاء اللہ ضرر نہ ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ ایک ایسا شخص جو اپنے اساتذہ کو عقاید شیعی کی وجہ سے رجل سوء سے تعبیر کیا کرتا ہے ان پر شیعہ ہونے کا الزام کتنا بے بنیاد اور غلط الزام ہے ابن ذہبی فرماتے ہیں ما ابعدہ من التشیع یعنی دار قطنی کو شیعیت سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا خطیب بغدادی ان کے صحت عقیدہ کی توثیق ان لفظوں میں فرماتے ہیں مع الصدق وصحۃ الاعتقاد یعنی عقیدہ صاف اور صحیح تھا ابو ذر ہروی کا بیان ہے کہ ایک روز دار قطنی کے ساتھ جا رہا تھا راستہ میں قاضی ابو بکر ملے ان کو دیکھتے ہی دار قطنی نے چمٹا لیا اور ان کے رخسار کو چومنے لگے جب گئے تو میں نے پوچھا کون ہیں؟ دار قطنی نے جواب دیا ھذا امام المسلمین والذاب عن الدین ابو بکر بن الطیب باقلانی کا جو عقیدہ تھا وہ سب کو معلوم ہے حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ وہ مذہب شافعی داشت غرض ان تاریخی واقعات اور عملی شواہدات کے ہوتے ہوئے دار قطنی پر شیعہ ہونے کا کسی طرح شبہ نہیں کیا۔

۱؎ تذکرہ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ۴؎ میزان الاعتدال ۵؎ شرح التقریب ۶؎ بستان

جاسکتا اور یہ غلط الزام ہے جس سے دار قطنی کا دامن بالکل پاک وصاف ہے۔

ذہانت حافظہ نہایت ذکی وفطین تھے غضب کا حافظہ تھا، حافظہ کے بارے میں محدثین کرام کی تاریخی روایات مشہور ہیں اس کا ایک نمونہ اور مصداق آپ بھی تھے، کم سن ہی تھے کہ اسماعیل الصفار کی مجلس میں حاضر ہوئے موصوف املاء کرا رہے تھے دار قطنی کے پاس رسالہ تھا اسے نقل کرنے لگے، اور سماع بھی جاری تھا حاضرین مجلس میں سے کسی نے کہا کہ آپ کا سماع صحیح نہیں کیونکہ آپ لکھنے جا رہے ہیں دار قطنی نے کہا میں دونوں کام ساتھ ساتھ کرتا جا رہا ہوں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ شیخ نے کتنی حدیثیں املاء کرائی ہیں؟ کہا نہیں دار قطنی نے کہا اب تک ۱۸ حدیثوں کا املاء ہوا ہے پہلی حدیث کی سند اس طرح ہے اور متن اس طرح دوسری حدیث کی سند اس طرح اور متن اس طرح ہے خلاصہ یہ کہ تمام احادیث کے متون و وسندات کو بالتفصیل تبلا دیا۔ تمام حاضرین متعجب ہوئے[1] پھر محدثین نے اس واقعہ سے دوسرا مسئلہ استنباط کیا جس کے لئے اصول حدیث کا مطالعہ کیا جائے

سمعانی کہتے ہیں کہ وکان یضرب بہ المثل فی الحفظ[2]

سعید مؤدب کہتے ہیں کہ جب میں خطیب سے ملا تو کہا انت الحافظ ابوبکر خطیب نے کہا میں تو احمد بن علی الخطیب ہوں، حفظ تو دار قطنی پر ختم ہو گیا۔[3]

فطانت اور انتقالِ ذہنی بھی بلا کا پایا تھا ایک روز نفل نماز پڑھ رہے تھے پاس ہی ایک صاحب حدیث پڑھ رہے تھے اس میں ایک روای نسیر بالنون والسین مصغر تھا اس کو انھوں نے بشیر پڑھا دار قطنی نے نماز ہی میں کہا سبحان اللہ وہ شخص ہوشیار ہو گیا سمجھا کہ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی طرف توجہ دلا رہے ہیں لیکن پھر تصحیح کر کے بسیر (بالیار) پڑھا دار قطنی نے پھر سبحان اللہ کہا اب وہ چپ ہو رہے تو دار قطنی نے پڑھا ن والقلم وما یسطرون۔[4]

---

[1] مقدمہ ابن صلاح و تذکرہ [2] انساب [3] تذکرہ [4] بستان

اسی طرح کا ایک واقعہ اور ہے نماز ہی میں تھے کہ ایک شخص حدیث پڑھ رہے تھے انھوں نے عمرو بن شعیب کو عمرو بن سعید پڑھا دارقطنی نے سبحان اللہ کہا، قاری مسئلہ کا اعادہ کر کے خاموش ہو رہا آپ نے فوراً یہ آیت تلاوت کی یا شعیب اصلوتک تامرک[1]

رعب | دارقطنی کی مجلس میں بہت ہیبت و وقار طاری رہتا بڑے بڑے علماء فضلاء جن کے علم و فضل کا غلغلہ بلند تھا ان پر بھی ایسی ہیبت طاری رہتی کہ چوں نہیں کرتے، محمد بن عمر الداؤدی کا بیان ہے کہ ابن شاہین دارقطنی کے ساتھ ایک مجلس میں جمع ہوئے لیکن ہیبت اور خوف سے ایک لفظ نہ بول سکے کہ شاید کوئی غلطی ہو جائے[2]۔

فقر و فاقہ | محدثین کرام کی ایک جماعت فقر و فاقہ میں مبتلا رہی ہے امام بخاری اور دیگر محدثین کو مالی مشکلات کی وجہ سے طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں لیکن کبھی بھی یہ مشکلات ان کے شاہراہ علم کے لئے سد راہ نہ بن سکیں عزم و ارادہ کی پختگی کے ساتھ علم و دین کی لذت سے ایسے سرشار رہتے کہ اپنی عسرت اور فقر و فاقہ کا احساس ہی نہیں تھا، بقی بن مخلد م ۲۷۶ اپنے متعلق فرماتے ہیں انی لاعرف رجلا کانت تمضی علیہ الایام فی وقت طلبہ لیس لہ عیش الا ورق الکرنب[3]

ابوبکر بن ابی داؤد کہتے ہیں

دخلت الکوفۃ ومعی درھم	جب میں کوفہ پہنچا۔ تو میرے پاس صرف ایک
واحد فاشتریت بہ ثلثین	درہم تھا جس سے میں نے باقلاء خرید لیا اور
مدا باقلاء فکنت اکل منہ واکتب	اسی کو کھا کھا کر حدیثیں لکھتا رہا۔ جب تیس
عن الشیخ فما فرغ الباقلاء	ہزار حدیثیں ہیں لکھ چکا تو باقلاء ختم ہوا
حتی کتبت عنہ ثلاثین الف حدیث	
مابین مقطوع ومرسل	

---

[1] بستان [2] تذکرہ [3] ایضاً

بالکل اسی طرح کا برقانی کا واقعہ ہے[1]

حفظت القرآن ومعی ثلاثة دینار	میں جب القرآن پہنچا تو میرے پاس کچھ روپے
ودرهم فضاعت الدنانیر	تھے مگر سب ضائع ہو گئے ایک درہم بچا رہا
وبقی الدرهم فدفعتہ الی خباز	جسے نانبائی کے حوالہ کیا اور اس کے عوض روز
فکنت آخذ منہ کل یوم رغیفین	روٹی روز لیتا رہا۔ اور اپنے شیخ احمد بن بشر سے
وآخذ من احمد بن بشر جزء	مسودہ لے کر حدیثیں لکھتا رہا جس وقت نذرانہ
فاکتبہ وافرغہ بالعشی فکتبت	ختم ہوا ہے اس وقت میں تیس جزء لکھ چکا
ثلاثین جزء ونفد ما عند الخباز	تھا پھر چلا آیا

فارغ البالی

دار قطنی بھی ارباب علم و فضل کے اس وراثت سے محروم نہ رہے۔ ابتدائی عمر نہایت عسرت و مسکنت میں گذری، فراخی و وسعت کا نام و نشان نہ تھا مگر پھر اللہ تعالیٰ نے فضل کیا کہ ابو الفضل کے پاس پہنچے انھوں نے ان کی بہت تعظیم و تکریم کی ان کے علم کی خوب قدردانی ہوئی اور بہت کچھ مال دیا جس سے فارغ البالی حاصل ہو گئی[2]۔

دار قطنی اور معاصرین | مشہور ہے کہ معاصرۃ سبب منافرت ہے اور اکثر بڑے بڑے بزرگوں کا دامن بھی اس سے ملوث ہے، امام بخاری، محمد بن یحیی الذہلی، یحیی بن معین، امام شافعی، ابن جریر طبری وغیرہم نے ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کہا وہ صرف معاصرۃ ہی کا اثر سمجھا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ محدثین کو کہنا پڑا فلا یلتفت الی کلام الاقران بعضهم فی بعض[3] لیکن دار قطنی کا دامن اس سے پاک رہا ہے، معاصرین اور تلامذہ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان تھے، معاصرانہ رقابت ان کو کسی قابل قدر ہستی کی قدر افزائی سے باز نہ رکھ سکی، اپنے ایک معاصر عبداللہ بن ابراہیم اسمٰعیلی م ۳۹۲ھ کے متعلق کہتے ہیں اس شان کا آدمی میں نے نہیں دیکھا[4]۔

---

[1] ابن خلکان [2] تذکرہ [3] طرح التثریب ج۱ [4] تذکرہ

دارقطنی جب مصر سے آئے تو برقانی نے سوال کیا کیا آپ نے کسی کو ایسا بھی پایا جس کو علم کا فہم ہو فرمایا مصر میں ایک نوجوان کو جسے عبدالغنی کہا جاتا ہے، آگ کا شعلہ ہے پھر آپ نے زبردست توصیفی کلمات سے ان کا ذکر کیا۔

دارقطنی معاصرین کی نگاہوں میں

دارقطنی کو معاصرین اور محدثین نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا، وہ ان کی نہایت عزت و احترام کرتے تھے حاکم فرماتے ہیں دارقطنی حفظ، فہم، ورع میں یکتائے روزگار اور قراءۃ و نحو کے امام تھے ان کے متعلق جو کچھ میں نے سنا تھا اس سے زیادہ ہی پایا ابوذر ہروی کہتے ہیں میں نے حاکم سے پوچھا کیا آپ نے دارقطنی جیسا کسی کو دیکھا ہے؟ کہا خود انھوں نے اپنے جیسا نہیں دیکھا ہے میں کیا دیکھوں گا قاضی ابوالطیب فرماتے ہیں دارقطنی ملک حدیث کے امیرالمومنین ہیں" خطیب بغدادی فرماتے ہیں دارقطنی اعجوبہ روزگار فرید الدہر اور اپنے زمانہ کے امام تھے ان پر معرفۃ علل و اسماء الرجال و حدیث کا علم منتہی ہو گیا، حدیث کے علاوہ کئی علوم میں دستگاہ رکھتے تھے حافظ عبدالغنی بن سعید فرماتے ہیں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تین شخص اپنے اپنے وقت کے بہترین کلام کرنے والے ہیں علی بن المدینی، موسیٰ بن ہارون دارقطنی عبدالغنی جب بھی ان کا تذکرہ فرماتے "استاذی" کہتے ذہبی فرماتے ہیں میں روئے زمین پر پھر ان جیسا کسی کو نہ پایا۔

تحدیث نعمت

اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و فضل عطا کیا تھا اور جو تفوق و منزلت حاصل تھی اسے اچھی طرح سمجھتے تھے چنانچہ کبھی کبھی تحدیث بالنعمۃ کے طور پر اظہار بھی کرتے تھے ابوالقاسم ازہری کا بیان ہے کہ دارقطنی سے ابن ابی الفوارس نے کسی حدیث کی علت یا راوی کے متعلق سوال کیا جواب سے فارغ ہو کر کہا ابوالفتح! اب ان سب چیزوں کا جاننے والا مشرق و مغرب میں میرے سوا اور کون ہے؟

ایک دن لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اپنے جیسا بھی کسی کو دیکھا ہے تو یہ آیت پڑھ کر خاموش

۱؎ تذکرہ ۲؎ بستان

چھوڑ بیٹھے تلامذہ کو لا انفسکم الخ اور کچھ جواب نہ دیا لیکن لوگوں نے اصرار کیا تو فرمایا اگر کوئی ایک فن مراد ہے تو بے شک میں نے اپنے سے اعلیٰ و افضل لوگوں کو دیکھا ہے اور اگر وہ تمام فنون مراد ہیں جو مجھ میں ہیں تو ایسا آدمی میں نے نہیں دیکھا ہے[1]

ابو الطیب طبری کا بیان ہے دارقطنی کی مجلس میں حاضر ہوا اور مَسِّ ذکر کی حدیث جس کے طرق کو دارقطنی نے جمع کیا تھا پڑھی جارہی تھی قاری فارغ ہوا تو آپ نے فرمایا اگر اس وقت امام احمد بن حنبل بھی حاضر ہوتے تو وہ بھی ان احادیث سے استفادہ کرتے[2]

نرم مزاجی | نہایت نرم مزاج اور رقیق القلب تھے بہت جلد آبدیدہ ہو جاتے آپ کے استاد ابو بکر الرملی ابن نابلسی جو قید کرکے دار پر چڑھائے گئے تھے ان کا تذکرہ جب بھی آپ کے سامنے آتا تو رو دیتے اور فرماتے کہ جس وقت ان کی چمڑی ادھیڑی جارہی تھی اس وقت یہ آیت ان کی زبان پر تھی کَانَ ذَالِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا[3]

انکساری | منکسر المزاج اور متواضع تھے اور علم سے جو خاکساری و تواضع پیدا ہونی چاہئے بدرجہ اتم موجود تھی کبھی کبھی کسی چھوٹے سے علم حاصل کرنے میں جھجکتے نہیں تھے فرماتے ہیں من احب ان ینظر تصورہ علمه فلینظر فی علل حدیث الزهری لمحمد بن یحیی الذهلی (م ۲۵۸ھ)[4]

عبد الغنی الازدی المصری جو آپ کے تلامذہ میں ہیں ان کا بیان ہے کہ جب میں المؤتلف والمختلف لکھنے لگا تو دارقطنی پہنچے اور میں نے اس سلسلہ میں ان سے استفادہ کیا اور ان تمام مضامین کو مؤتلف و مختلف میں جمع کر دیا جب تصنیف سے فراغت ہوگئی تو استاد نے مجھ سے کہا اس کی قراءۃ کیجئے تاکہ مجھ کو آپ سے سماع ہو جائے میں نے کہا حضرت! اس میں جو کچھ ہے سب آپ ہی کا توفیض ہے فرمایا یہ سب کچھ نہیں سنا جائے گا تم نے جو کچھ لیا ہے وہ مجھ سے متفرق لیا ہے اور اس میں سب مجتمع ہیں اس کے علاوہ اس میں آپ نے دوسرے شیوخ سے بھی استفادہ کیا ہے غرض ان کے اصرار پر میں نے قرأت کی[5]

---

[1] بستان [2] ابن خلکان [3] انساب سمعانی [4] معجم البلدان [5] تذکرہ ج ۲ [6] ایضاً ج ۳

شگفتگی | مزاج میں شگفتگی اور تفریح بھی تھی ایک روز ابوالحسن بیضاوی نے ایک شخص کو جو حدیث کی طلب میں آیا تھا ان کے سامنے پیش کیا اور کہا یہ شخص مسافر ہے آپ کچھ املا فرمائیے دارقطنی نے معذرت کی اور کہا کہ فرصت نہیں ہے لیکن بیضاوی کب ماننے والے تھے اصرار کیا آخر دارقطنی نے ایک حدیث املا کرائی جس کو تقریباً بیس طرق اور سند سے روایت کی اور سب کا متن یہ تھا نعم الشیئ الھدیۃ امام الحاجۃ دوسرے روز وہ صاحب پھر آئے اور مناسب ہدیہ لے کر آئے دارقطنی نے ان کو اپنے پاس بٹھایا اور ایک حدیث سترہ طرق سے املا کرائی متن ان سب حدیثوں کا یہ تھا۔ اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ[1]

دارقطنی کا علم و فضل میں اپنے وقت کا امام ہونا اور مختلف علوم و فنون میں ان کا تفوق مسلم ہے خصوصاً علم حدیث کے ہر شعبہ میں جو ان کی خدمات جلیلہ ہیں وہ تاریخ کے سینے پر ثبت ہیں علم حدیث کے ہر موضوع پر نہایت قابل قدر تصنیفات ہیں جنہیں ارباب علم و فضل نے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور ان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ذیل میں ہم ان کی تصانیف سے ناظرین کو روشناس کرانا چاہتے ہیں اس تذکرے سے ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہو سکے گا۔

سنن دارقطنی | تیسری صدی حدیث کی ترتیب و تدوین کے لحاظ سے نہایت مبارک و مسعود زمانہ رہی ہے سنت کی خدمت اور اس کی تحیص اور رواۃ کا نقد اسی زمانہ میں ہوا اس کے قبل جتنی کتابیں تالیف ہوئیں وہ سب کی سب اقوال صحابہ و فتاوی تابعین سے مخلوط و ممزوج ہوا کرتی تھیں لیکن اس دور میں تالیف کا طریقہ ہی بدل گیا اور نئی راہ نکالی گئی اور صرف مسند کو جمع کیا جانے لگا لیکن صحیح و سقیم رطب و یابس کا امتیاز نہیں کیا گیا اور ہر صحیح و ضعیف کو جگہ دے دی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ جو ارباب نظر و فکر نہ تھے ان کے لئے سخت دشواری پیش آئی لیکن امام بخاری م ۲۵۱ و امام مسلم م ۲۶۱ و دیگر ائمہ جہابذہ نے اس کوتاہی کو محسوس

---

[1] بستان

کرتے ہوئے ایسی کتابیں تدوین کیں جن کی نظیر دنیا کی کسی زبان و مذہب میں نہیں ملتی چوتھی صدی کے ارباب علم بھی اسی نقش قدم پر چلنے لگے اور ان کا کام زیادہ تر افتراء کا رہا۔ اس صدی کی مشہور کتاب معجم طبرانی م ۳۶۰ (کبیر و صغیر و اوسط) سنن دار قطنی م ۳۸۵ صحیح ابن حبان م ۳۵۴ وغیرہا ہیں دار قطنی اور ان کی تصانیف کو قدر سے دیکھا گیا اور اس سے فائدہ پہنچا ابن صلاح کا بیان ہے کہ سات حافظ ایک ہی طبقے میں ایسے ہیں جن کی تصنیفات اچھی ہیں اور ہمارے زمانہ میں اس سے فائدہ عظیم ہوا ان میں سے ایک ابوالحسن علی بن عمر دار قطنی ہیں[1] سنن دار قطنی اسی دور کی قیمتی کتاب ہے جس نے عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کی علامہ سیوطی اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہ بخاری و مسلم کے علاوہ جو صحیح حدیثیں ہیں ان کی صحت اور تلقی بالقبول کا معیار کیا ہوگا؟ فرماتے ہیں اس کے متعلق علمائے حدیث کا یہ مسلک ہے کہ جب معتمد مصنف یا معتمد تصنیف میں اس کی صحت کی تصریح کردی جائے تو وہ حدیث صحیح ہوگی اس مقام پر معتمد تصانیف کو علامہ موصوف شمار کراتے ہیں اور اس میں دار قطنی کا بھی ذکر ہے، فرماتے ہیں کسنن ابی داؤد، والترمذی، والنسائی وابن خزیمہ والدار قطنی والحاکم والبیہقی وغیرہ[2] کشف الظنون نے حدیث کی صحیح کتابوں میں دار قطنی کو داخل کیا ہے الا ان السلف والخلف قد اطبقوا علی ان اصح الکتب بعد کتاب اللہ سبحانہ وتعالی البخاری ثم مسلم ثم الموطا ثم بقیۃ الکتب الستۃ وھی ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدار قطنی[3] بالکل اسی طرح کا خیال طاش کبری زادہ نے بھی ظاہر کیا ہے علمائے متاخرین نے اس کو اپنی تصنیفات کا موضوع قرار دیا اور اس پر کام کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے دس کتابوں پر اطراف لکھی ہے جس کا نام اتحاف المہرۃ باطراف العشرۃ ہے ان[4] دس میں دار قطنی بھی شامل

---

[1] مقدمہ السنۃ [2] تدریب [3] کشف الظنون [4] بقیہ کتابیں یہ ہیں موطا مالک۔ مسند شافعی۔ مسند احمد۔ مسند دارمی۔ ابن خزیمہ۔ منتقی ابن جارود۔ صحیح ابن حبان۔ مستخرج ابی عوانہ۔ مستدرک حاکم۔ شرح معانی الآثار۔ اور ایک دار قطنی کل گیارہ کتابیں ہو جاتی ہیں مگر دس ہی کا اعتبار کیا ہے صحیح ابن خزیمہ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ہے علامہ ابن الملقن م ۸۰۴ھ نے حدیث کی چھ کتابوں کے رجال پر کام کیا ہے اس چھ میں دارقطنی بھی ہے علامہ عراقی نے سنن دارقطنی کے ان رجال پر کام کیا ہے جو تہذیب کے علاوہ ہے علامہ سیوطی نے جامع صغیر میں جن کتابوں کی احادیث کی تخریج کی ہے ان میں ایک سنن دارقطنی بھی ہے اور اس کی علامت (قط) ہے۔

علامہ شمس الحق ڈیانوی البہاری صاحب عون المعبود نے سنن دارقطنی پر تعلیق لکھی ہے جس کا نام تعلیق المغنی علی سنن الدارقطنی رکھا ہے اور سنن کو معہ تعلیق کے شائع کیا ہے۔

سنن دارقطنی کے چند نسخے ہیں (۱) ابوبکر محمد بن عبدالملک بن بشران الحافظ (۲) ابوطاہر محمد بن احمد بن محمد بن عبدالرحیم الکاتب (۳) ابومنصور محمد بن محمد السوقانی (۴) ابوبکر احمد ابن محمد بن احمد بن غالب البرقانی (۵) ابوالطیب طاہر بن عبداللہ بن طاہر الطبری (۶) ابوالحسن محمد بن علی م ۴۶۵ھ اول الذکر تینوں نسخوں میں اصولاً فرق نہیں ہے صرف تقدیم وتاخیر اور رواۃ کے نسب ونسبت میں زیادتی ونقصان کا تھوڑا فرق ہے ابوالحسن سب سے آخری شاگرد اور آخری راوی ہے، ہندوستان میں ابن بشران کا نسخہ ہے۔

اس سنن کی سب سے اعلیٰ سند پانچ واسطہ سے ہے سب سے پہلی حدیث قلتین والی ہے اس حدیث کے طرق واسانید میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور تحویل پر تحویل کرتے چلے جاتے ہیں تقریباً ۴۵ سندوں سے اس کو ذکر کیا ہے جس سے دارقطنی کے قوت حافظ اور استیفاء تام کا پتہ چلتا ہے پہلی سند حضرت جابر بن عبداللہ سے ہے جس کے الفاظ یہ ہیں بلغ من الماء قلتین فما فوق ذلک لم ینجسہ شئی ایک حضرت ابن عباسؓ سے یہ الفاظ ہے اذا کان الماء قلتین فصاعدا لم ینجسہ شئی اور باقی حضرت ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کا شمار نہیں کیا ہے کیونکہ حافظ ابن حجر کے پاس صحیح ابن خزیمہ کا نسخہ ناقص تھا یعنی صرف ایک ربع اس لئے نام باطراف العشرہ ہی رکھا اس کا ایک قلمی نسخہ مکتبہ محمودیہ آستانہ میں موجود ہے (لحظ الالحاظ لابن فہد) اور حیدرآباد میں بھی ہے لہ بقیہ کے نام یہ ہیں مسند احمد۔ صحیح ابن خزیمہ۔ صحیح ابن حبان۔ مستدرک حاکم۔ بیہقی ۱۳ بستان۔

یا ابن عمر عن ابیہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

دار قطنی، سنن میں پہلے حدیث کے تمام طرق کو جمع کر دیتے ہیں پھر اس کے مسند پر کلام کرتے ہیں اگر راوی ضعیف ہے تو اس پر جرح کرتے ہیں پھر حدیث حسن یا ضعیف ہوئی تو اس کی تصریح کر دیتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے یا ضعیف۔

حدیث حسن کے شناخت کا ذریعہ مشائخ متقدمین جیسے امام احمد و بخاری رحمہما اللہ وغیرہما کے متفرق کلام ہیں یا پھر جامع ترمذی ہے لیکن اس کے نسخے مختلف ہیں اس لئے صحیح طور پر پتہ چل نہیں سکتا الا یہ کہ معتمد نسخہ مل جائے اور پھر تیسرا ذریعہ سنن دار قطنی ہے کیونکہ یہ اپنے سنن میں نص کر دیتے ہیں اور تصریح کر دیتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔[1]

پھر فقہاء کے مذاہب کو بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معرفت بمذاہب الفقہاء میں بھی ان کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ (باقی آئندہ)

---

[1] مقدمہ ابن صلاح

مرزا شوق لکھنوی کا تنقیدی مطالعہ

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

مرزا شوق، جانِ عالم واجد علی شاہ کے اس لکھنؤ کا شاعر ہے جہاں ہر منظر جنت نگاہ اور ہر گوشہ بساط، دامانِ باغباں بنا ہوا تھا نظارۂ جمال بھی تھا اور شوق وصال بھی۔ جامِ بلور بھی تھا اور زہرۂ جبیں بھی۔ صراحیِ مے ناب بھی تھی اور سفینۂ غزل بھی۔ اس کا تنقیدی مطالعہ نہ صرف لکھنوی ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی۔ جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکمِ قضا کو جامِ شراب کی گردش سے پھیر دیا گیا ہے اور شام و سحر کی یہ رنگینیاں قایم ہو کر رہ گئی ہیں قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ برہان، دہلی ۶ اور محمد اسلم ۵ عماد الملک روڈ علی گڑھ۔

مسئلہ قربانی اور مسلمان

از

(حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند)

ارباب فکر و نظر جب کسی اہم مسئلہ پر غور کرتے ہیں بنیادی مقصد ایک ہوتے ہوئے بھی اکثر و بیشتر اُن کے فکر کی دو جدا جدا راہیں بن جاتی ہیں جن کو ہم افہام و تفہیم کی غرض سے تخیلی اور عملی کے نام سے پکار سکتے ہیں۔

میدانِ تخیل کا گامزن معاملہ کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے اول چند نظری مقدمات بناتا ہے اور پھر واقعات کی رفتار کو اپنے مزعومہ مقدمات کے سانچہ میں ڈھال کر ایسا نتیجہ نکالتا ہے جو واقعات و حقائق سے جدا بلکہ بعض مرتبہ اُن کے برعکس ایک نئی حقیقت کی تخلیق کا سبب بن جاتا ہے اور وہ پیش پا افتادہ حقیقت اپنی جگہ تشنہ ہی رہ جاتی ہے اور بسا اوقات مستور اور پوشیدہ ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس عملی طریق فکر کا حامل اصل حقیقت کی تہ تک پہنچ کر صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب رہتا اور مقصد کو ہر قسم کے نقصان و ضرر سے محفوظ رکھ کر اس کی تقویت کا باعث بنتا ہے نیت اور ارادہ اگرچہ دونوں کا پاک اور بے لوث ہوتا ہے مگر مقصد تک پہنچنے یا اس کو قوی تر بنانے میں اکثر و بیشتر پہلا ناکام اور دوسرا کامیاب نظر آتا ہے۔

اس نازک دور میں بھی جبکہ ملک و وطن کے اہم مسائل کے ساتھ ساتھ مسلمانوں سے متعلق بعض خصوصی اور اہم سے اہم تر مسائل زیرِ غور اور زیرِ بحث ہیں ہمارے ارباب فکر مسطورہ بالا دونوں راہوں پر چل کر مسائل حل کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق مسلمانوں کو مشورے دے کر ان کی مشکلات کے حل اور مصائب و آلام کے

انسداد کی فکریں کر رہے ہیں۔

ان ہی پیچیدہ مسائل میں سے ایک مسئلہ جو آج ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے قدم رکھنے کی ہزار سالہ تاریخ میں بہت بڑے عرصہ سے ہمیشہ پیچیدہ بنا رہا ہے "قربانی گاؤ" کا مسئلہ ہے۔

"گائے" ہندوؤں کی مذہبی تقدیس کا ایک اہم جزء ہے اور اس درجہ اہم ہے کہ ہندو مذہب کے تمام متوں کو یہی گائے ایک مرکز پر جمع کر دیتی ہے یہ تصویر کا ایک رخ ہے دوسرا رخ یہ ہے کہ ہندو مذہب کے علاوہ اسلام، عیسائیت، یہودیت وغیرہ مذاہب میں گائے کو بھی ان جانوروں میں شمار کیا گیا ہے جن کا گوشت انسان کے لئے پاک اور حلال ہے اس لئے قدرتی طور پر ان مذاہب کے پیرودں میں اس جانور کی مذہبی تقدیس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس مسلمانوں کے اہم مذہبی تہوار "عید قرباں" میں جو کہ حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی جانب سے حق تعالیٰ کے سامنے اپنی قربانی پیش کرنے کی یادگار کا بہترین شاہکار ہے مخصوص حلال جانوروں کی قربانی کی فہرست میں یہ بھی شامل ہے اور یہی نہیں بلکہ ایک عرصہ دراز کے بعد مسلمانوں کے عام اقتصادی حالات کے پیش نظر اس مسئلہ نے اس لئے بھی اہمیت حاصل کر لی کہ قربانی کے مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ بکرا۔ بھیڑ۔ دنبہ ایک شخص کی جانب سے ایک ہی ہو سکتا ہے مگر اونٹ، بھینس اور گائے میں سات اشخاص شریک ہو کر قربانی کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں اور ہر بکرے کی اور بڑے جانور کی قیمت کا اگر موازنہ کیجئے تو صاف نظر آتا ہے کہ جو سات اشخاص جدا جدا سات بکرے کرنے کی مالی حیثیت سے قدرت نہیں رکھتے وہ آسانی سے ایک بڑے جانور کی قیمت میں شریک ہو کر اپنے فریضہ کو ادا کر لیتے ہیں اور جبکہ اس ملک میں اونٹ کمیاب ہے تو بھینس اور گائے اور ان دونوں کی نسل ہی سے کام لیتے ہیں مسلمانوں کی اقتصادی حالت کس درجہ کمزور ہے اس کا اندازہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ملک کے تمام باشندوں کو ہے اس لئے قربانی کے موقعہ پر

بکرے اور دنبہ کی قربانی کم اور بڑے جانوروں کی قربانی زیادہ کرنے کا سبب یہی اقتصادی مجبوری رہی ہے اور ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا ہرگز ہرگز اس کا باعث نہیں ہوا

البتہ گذشتہ پچاس ساٹھ برس کے عرصہ میں انگریزوں کی غلامی کے ساتھ ساتھ جب ملک میں حقوق طلبی کی بحث نے سیاسی رنگ اختیار کیا اور ایک اجنبی سامراجی طاقت نے اپنی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لئے ہندو مسلمان کو جدا جدا حیثیت دے کر مذہبی اور معاشرتی منافرت کا پارٹ ادا کیا اور اس کے نتیجہ میں ہندو اور مسلم دونوں تہواروں میں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی تب یہ مسئلہ بھی بدقسمتی سے دونوں فرقوں کے درمیان باہمی منافرت اور باہمی کش مکش کا ذریعہ بنا لیا گیا۔

ہندو بھائی آنکھوں سے دیکھتے کہ انگریزوں کی چھاؤنیوں میں روزانہ ہزارہا قسم کی گائے کٹتی ہیں اور وہ اس کو برداشت کر لیتے لیکن تین سو ساٹھ دنوں میں سے ایک دن جب عید قرباں کے نام سے اکثر و بیشتر ناکارہ اور دودھ سے بیگانہ ذبح کی جائیں تو جانور کے نام پر انسانوں کی قربانی سے دریغ نہ کرتے۔

اسی طرح مسلمان یہ محسوس کرتے ہوئے بھی کہ اس خاص جانور کے ذبح سے برادران وطن کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں انھیں بڑے جانوروں میں سے اسی جانور کی قربانی افضل نظر آنے لگی۔

مگر یہ سیاسی بحران خلافت کی نیک تحریک نے یکدم پامال کر کے ملک میں پہلے سے بھی زیادہ دونوں فرقوں کے درمیان یک جہتی پیدا کر دی اور ایک دوسرے کے جذبات کا پاس و لحاظ سکھا دیا جس کا معمولی مظاہرہ یہ تھا کہ عید قرباں کے موقع پر حکیم اجمل خاں صاحبؒ کی تحریک پر دہلی میں جہاں سیکڑوں گائے قربان ہوا کرتی تھیں حکومت کی پوری مخالفانہ طاقت کے باوجود مشکل سے دو یا تین گائے ہو سکی تھیں۔

اس سے یہ تجربی اندازہ ہو گیا کہ مسلمانوں کی عام ذہنیت اس طرح کی واقع ہوئی

ہے کہ محبت اور جذبات خلوص کے ساتھ اگر ان کی جان بھی طلب کی جائے تو وہ دریغ نہیں کرتے اور بعض وہیش کو بزدلی تصور کرتے ہیں لیکن کسی معاملہ پر قوت آزمائی کے ذریعہ قابو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے سامنے سر جھکانا اپنی توہین سمجھتے اور جا و بے جا ہر طریقہ پر اس کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں خواہ اس مقابلہ میں خود ان ہی کو شدید خسارہ اور نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

چنانچہ ۱۹۲۳ء میں جب تحریک خلافت کمزور پڑ گئی اور حکومت سے نبرد آزما ہندو مسلم طاقت آپس میں ہی دست و گریباں ہونے لگی حتی کہ مذہبی تہوار بھی اس زد سے نہ بچ سکے اور سیاسی بخار کا ٹمپریچر دونوں جانب سے مذہبی شکل میں چڑھنے لگا اور دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ ایک مرتبہ پھر اس مسئلہ کو خالص مذہبی اور اقتصادی حدود سے نکال کر سیاسی رنگ میں دیکھا جانے لگا اور ہندو مسلمان دونوں ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کی پروا کئے بغیر اور بلند اخلاقی معیار سے منہ موڑ کر مذہبی رسوم میں ایک دوسرے کو زک دینے ہی کو بڑا مذہبی کارنامہ سمجھنے لگے۔

بہرحال کہنا یہ تھا کہ دراصل مسلمان عید قرباں میں بڑے جانوروں کی خصوصاً آسانی سے بکثرت سستے داموں دستیاب ہو جانے کی وجہ سے دودھ سے بے گانہ اور ناکارہ گایوں کی قربانی خالص مذہبی اور اقتصادی نقطۂ نگاہ سے کرتے تھے اور اس معاملہ میں ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا اور ان کو چڑانا مقصود نہیں ہوتا تھا تاہم دونوں جانب کے لیڈروں اور فرقہ پرست رہنماؤں نے ضرور موقعہ بہ موقعہ اس مسئلہ کو سیاسی رنگ دے کر باہمی منافرت کو اشتعال دلا کر زیادہ دونوں فرقوں کے درمیان کشیدگی اور نفرت کے جراثیم کے لئے غذا کا کام دیا۔

ملک کے متعدد مسلم سنجیدہ اور صاف دماغ مدبروں اور سیاسی بلند پایہ رہنماؤں نے جست جستہ کوشش کی کہ کسی طرح یہ مسئلہ حل ہو جائے تاکہ دونوں فرقوں کے درمیان اعتماد اور یکجہتی کی فضا قائم ہو سکے اور مذہب کے نام پر سیاسی حربہ نہ بن سکے لیکن افسوس صد افسوس کہ قوم پرور

مدبران ملک کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور فرقہ پرستوں اور اجنبی سامراجی طاقت کی مہربانیوں کی وجہ سے یہ اخلاقی مسئلہ سیاسی الجھنوں میں پھنس کر رہ گیا۔

یہ اس مسئلہ کا پس منظر ہے جو بغیر کسی ذمہ داری کے واقعات کی حقیقی روشنی میں پیش کیا گیا ہے تاکہ اس نازک زمانے میں اس مسئلہ پر جو کچھ کہا یا لکھا جائے اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ہو اور ہم کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں۔

ہندوستان ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوگیا اور انگریزوں کی سامراجی حکومت کے پنجۂ استبداد سے اس کو پوری طرح آزادی نصیب ہوگئی لیکن اس نے اپنے ترکہ میں ہندوستان کی تقسیم اور بٹوارہ چھوڑا جو ملک کے باشندوں کو "خواہ وہ پاکستان میں ہوں یا بھارت میں ہندو ہوں یا مسلمان" بہت مہنگا پڑا اور تباہی و بربادی کا وہ نقشہ سامنے لایا تاریخ جس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز و درماندہ ہے۔

اس موقف پر پہنچ کر ملک کے دونوں حصوں میں ہندو اور مسلمان کی سیاسی اور اجتماعی حیثیت میں سابق کی بہ نسبت بہت بڑا تفاوت ہوگیا اور ہندوستان کی وحدت کی صورت میں جو وزن مسلمانوں کا بھارت کے حصہ پر ہوسکتا تھا وہ باقی نہ رہا اور جو قیمت ہندو کی پاکستان کے حصہ میں ہوسکتی تھی وہ پادر ہوا ہوگئی اور کل جن متنازعہ فیہا مسائل میں پورے ملک کے اندر ایک دوسرے کی رضا اور قبولیت از بس ضروری اور ناقابل نظر انداز سمجھی جاتی تھی آج دونوں حصوں کی اکثریت کی نگاہ میں ان مسائل کے حل کرنے میں اقلیت کا فیصلہ اور اس کی رائے سیاسی تو کجا اخلاقی حیثیت میں بھی کچھ زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔

بحث اس میں نہیں ہے کہ ہونا کیا چاہئے پیش نظر یہ ہے کہ ہوکیا رہا ہے اور گذشتہ دور کے فرقہ وارانہ قضیوں کے حل کے لئے عملی زندگی میں آج اور کل کے درمیان کیا تفاوت اور فرق ہے!۔

اشارات و مضمرات میں موجودہ صورت حال کا جو جائزہ سطور بالا میں لیا گیا ہے اس

کو سامنے رکھئے اور اب غور کیجئے کہ "قربانی گاؤ اور مسلمان" کے عنوان پر جن حضرات نے حالیہ مضامین میں اظہار خیال کیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے اور کیا مسئلہ کو اس طرح زیر بحث لاکر ہم واقعی حل کر سکتے ہیں یا حل کرنے کی بجائے جن مسلمانوں کی جان و آبرو کی خاطر اس مسئلہ کو سپرد قلم کیا گیا ہے ان کے لئے مزید مشکلات کا باعث بن رہے ہیں؟

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ برادر عزیز مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ نے برہان بابت اکتوبر ۱۹۵۰ء کے شذرات میں عید اضحیٰ کے حالیہ فسادات سے متاثر ہو کر گائے کی قربانی سے متعلق اظہار خیال کرتے اور اس مسئلہ کی شرعی حیثیت پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے اس جانب جو توجہ دلائی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ عید قرباں کے موقعہ پر گائے کی قربانی کے نام سے بھارت میں مسلمانوں کے خون کی جو ارزانی ہوتی ہے اس کے متعلق ہم دو طرح غور کر سکتے ہیں ایک یہ کہ گائے کی قربانی ایک امر مباح ہے پس اس امر مباح کو اگر حکومت قانون اور قوت کے بل پر روک دے اور مسلمانوں کو مجبور کر دے تو ایسی صورت میں مباح بھی واجب الادا ہو جاتا ہے خواہ اس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو دوسرے یہ کہ حکومت نے اس کو نہ قانون کی راہ سے روکا ہے اور نہ قوت کے بل پر روکنا چاہتی ہے تو مسلمانان ہند اجتماعی حیثیت میں اس کا فیصلہ کریں کہ جبکہ گائے برادران وطن کی مذہبی تقدیس کا اہم شعار ہے تو ہم اعلان کرتے ہیں کہ آئندہ گائے کی قربانی ہرگز ہرگز نہ کریں گے تاکہ برادران وطن کی دل آزاری بھی نہ رہے اور مسلمانوں کی جان عزیز بھی خطرہ میں نہ پڑے۔

موصوف نے ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی پہلو کے متعلق خود کوئی فیصلہ کن رائے نہیں دی بلکہ علماء کرام خصوصاً جمعیۃ علماء ہند کو دعوت دی ہے کہ وہ جلد از جلد اس کا فیصلہ کرے البتہ ان کا رجحان یہ ضرور ہے کہ اس مسئلہ کا فیصلہ دوسری صورت کے مطابق ہونا چاہئے مولانائے موصوف کا یہ شذرہ اپنی جگہ اگرچہ قابل قدر اور لائق توجہ ہے لیکن میری تمہید کے مطابق تخیلی ہے عملی نہیں اور وقت کے تقاضا کے پیش نظر مضر ہے مفید نہیں اس لئے نہیں

نہ ایسا نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس لئے کہ یہ بعد از وقت بھی ہے اور قبل از وقت بھی اور اس لئے آج ایسا ہونا برادران وطن کی نگاہ میں بے وقعت اور بے معنی ہے اور اگر مجھ کو زیادہ جرأت کے ساتھ کہنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ موجودہ حالات میں یہ مستحسن رائے کار نہ اخلاقی قدر و قیمت رکھتا ہے اور نہ سیاسی اور نہ اس سے مسلمانوں کی جان عزیز ہی خطرہ سے بچ سکتی ہے غرض جو حل پیش کیا گیا ہے وہ تقسیم ہند کے بعد "حل" کہلا سکتا ہے لیکن "حل" بن نہیں سکتا۔

کیوں؟ اس لئے کہ موصوف نے پہلی بات "جس پر اس مسئلہ کی بنیاد رکھی ہے" یہ فرمائی ہے۔

اس نفسیاتی الجھن اور بیم و رجا کی اس جاں گداز کشمکش کا اصل باعث گائے کی قربانی کا مسئلہ ہے یہ مسئلہ ہمیشہ سے ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں کشیدگی اور کشاکش کا سبب بنا رہا ہے اور اب ملک کی تقسیم جن حالات میں ہوئی ہے ان کی وجہ سے اس کی نزاکت اور بھی بڑھ گئی ہے چونکہ یہ خالص مذہبی معاملہ ہے اس لئے علماء کا فرض تھا کہ تقسیم کے بعد ہی فوراً اس کے متعلق کوئی متفقہ فیصلہ کر کے مسلمانوں کی راہنمائی کرتے تاکہ گومگو کے عالم میں رہنے کے باعث جان و مال کا جو خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے اس سے نجات ملتی اور صورت حال کا کوئی خوشگوار حل نکل سکتا لیکن افسوس کہ علماء نے ایسا نہیں کیا اور اب ایسا مرحلہ آگیا ہے کہ اگر ان کی خموشی کا یہی عالم رہا تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے نتائج کتنے خطرناک اور افسوسناک ہوں گے (انتہیٰ)

نشان زدہ عبارت یہ چغلی کھا رہی ہے کہ تقسیم کے بعد چونکہ علماء نے گائے کی قربانی کے ترک کا فیصلہ نہیں دیا اس لئے مسلمانوں کو جان و مال کا خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے مجھے حیرت ہے کہ مولانائے موصوف نے اس مسئلہ کی انتہائی نزاکت سے باخبر ہونے کے باوجود اتنا بڑا بوجھ علماء پر یا خود مسلمانوں پر ڈال دیا ہے اور حقائق و واقعات سے چشم پوشی

کا صریح ثبوت دیا ہے۔ کاش وہ اس حقیقت پر نظر رکھتے کہ تقسیم ہند کے بعد مسلمان عملاً قربانی گاؤ ترک کئے ہوئے ہیں اور علما کا فیصلہ ہونے نہ ہونے سے قطع نظر وقت نے خود ان کی رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے تاہم عید قرباں کے موقعہ پر گذشتہ سالوں میں خصوصاً امسال جو فسادات ہوئے ہیں اُن کے متعلق خود سرکاری کیمونکے مظہر ہیں کہ مسلمانوں نے ان مقامات پر گائے کی قربانی نہیں کی تھی لیکن فرقہ پرست ہندوؤں نے مسلمانوں کی جان و مال کو نقصان پہنچانے کے لئے عید قرباں کو بہانہ بنا کر خون کی ہولی کھیلنا ضروری سمجھا چنانچہ بھنسر اڑن (سہارنپور)، شیرگڑھ (متھرا)، دولت پور (الہ آباد)، مگری (اعظم گڈھ) لکھنؤ۔ جلیل (دھاگل پور)، سینہور (بھوپال) کے فسادات اس حقیقت کو بخوبی واضح کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہئے وہ یہ کہ حکام کے اس بات سے مطمئن ہونے کے باوجود کہ مسلمان گائے کی قربانی نہیں کریں گے انھوں نے اکثر مقامات پر یہ فہمائش کی کہ اگر آپ بھینس یا بھینس کی نسل کی قربانی بھی کریں گے تو چونکہ ذبح کے بعد بڑے گوشت کے درمیان یہ فرق مشکل ہے کہ گائے کا ہے یا بھینس کا اس لئے مسلمانوں کے لئے احتیاط کا تقاضا ہے کہ وہ قانونی پابندی نہ ہوتے ہوئے بھی ایسا نہ کریں ورنہ فساد کی ذمہ داری سے وہ بھی سبکدوش نہیں رہیں گے۔

ایسے حالات میں اگر علماء یہ متفقہ فیصلہ دے بھی دیں تو انصاف کیجئے کہ اس فیصلہ کی قدر و قیمت کیا ہے اور کس طرح مسلمانوں کی جان و مال کا خطرہ اس فیصلہ سے ٹل سکتا ہے بلکہ معاملہ کو اگر دور رس نگاہ سے دیکھا جائے تو یکطرفہ یہ فیصلہ مسلمانوں کی جان و مال کے لئے مزید خطرہ بن سکتا ہے کیونکہ مفسد عناصر جن مقامات پر فساد کرنا چاہیں گے وہاں کے مسلمانوں پر یہ مجرمانہ الزام عائد کریں گے کہ اس مقام کے مسلمانوں نے نہ صرف ہندوؤں کی دل آزاری کی بلکہ خود اپنے علماء کے متفقہ فیصلہ کی خلاف ورزی کی اور گائے کی قربانی کر کے دو سنگین جرموں کے مرتکب ہوئے اس لئے ان کا صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہی بہتر ہے۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کا خوف وہراس یا مصلحت وقت کے پیش نظر گائے کی قربانی نہ کرنا وہ اہمیت نہیں رکھتا جو علماء کے متفقہ فیصلہ سے پیدا ہو سکتی ہے مگر یہ بھی درست نہیں ہے اس لئے کہ کسی قوم یا کسی فرقہ کا مذہبی یا سیاسی یا اخلاقی متفقہ فیصلہ جب ہی دوسری قوم یا دوسرے فرقہ کی نگاہ میں لائق اعتنا اور قابل وقعت ہو سکتا ہے جب عملی زندگی میں وہ دوسروں کے ہم پلہ اور قوت وطاقت میں دوسروں کے ہمسری نہ ہو بلکہ اس درجہ میں ہو کہ اگر دوسرے اس کے فیصلے کو نظر انداز بھی کر دینا چاہیں تب بھی نظر انداز نہ کرنے پر مجبور ہوں ورنہ اس دنیا میں کمزور اور ضعیف عناصر کے فیصلے کھوٹے سکہ سے زیادہ وقیع نہیں ہوتے۔

درحقیقت اس فیصلہ کی قدر وقیمت یا آزادی سے قبل کے دور میں تھی اور یا آزادی کے بعد جب ممکن تھی کہ ملک کی تقسیم نہ ہوتی اور پورے ملک میں ہر حیثیت سے دونوں بڑے فرقے ایک دوسرے کی ٹکر اور برابر کے سمجھے جاتے اور ایک کے فیصلہ کا اثر دوسرے کو قبول کرنا ناگزیر ہوتا۔

البتہ مسلمانوں کو جان ومال کے خطرہ سے بچانے عید کے موقعہ پر ان کے چہروں پر حزن وملال کی جگہ بشاشت ومسرت پانے اور گائے کے نام سے ہندو مسلم فسادات روکنے کی غرض سے صحیح حل تلاش کرنے کی بنا پر نہیں بلکہ علماء کا یہ متفقہ فیصلہ اس غرض سے کرانا مقصود ہے کہ مسلمانوں کو اپنی اخلاقی بلندی کا ثبوت دینے کے لئے ایسی بات کے ترک کا متفقہ اعلان کر دینا چاہیئے جس سے برادران وطن کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے خواہ آج کے دن اس کی اخلاقی قدر وقیمت بھی کچھ نہ سمجھی جائے لہذا یہ ایک تخیلی حل تو بن سکتا ہے عملی حل نہیں ہو سکتا۔

کیا دونوں ملکوں کی اکثریت اس زعم باطل میں گرفتار نہیں ہے کہ جو متنازع فیہا مسائل کل تک حل نہیں ہو سکے یا اجنبی طاقت نے حل نہیں ہونے دئے وہ آج اکثریت کی آزادانہ زبردست طاقت نے اس طرح حل کر دئے کہ اب ان کو متنازع فیہا مسائل کہنا ہی بےمعنی

ہے اور کل جو معاملات اخلاق، محبت، رواداری اور وطنیت و قومیت کے نام پر طے نہ ہو سکے آج اکثریت کی طاقت نے بہ آسانی حل کر دئیے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک کی اقلیت اگر آج آزاد فضا میں اخلاق و مروت کے نام پر کسی پرانے قضیہ کا حل تلاش کرے تو اکثریت اس کو اسلئے مضحکہ خیز سمجھنے پر آمادہ نظر آتی ہے کہ اس کے نزدیک یہ فیصلہ اقلیت کی مغلوبیت اور مرعوبیت کا نتیجہ ہے نہ کہ اخلاقی برتری اور بلند کرداری کا یا علم لازم باہمی امن وسلامتی سے رہنے کے لئے صلح جویانہ جذبہ کا، چنانچہ آج اس مسئلہ "قربانی گاؤ" سے متعلق بھی بہت سے سنجیدہ دماغ یہی سوچتے اور زبان سے یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ اب اس ملک میں اس اقدام کے لئے مطلق گنجائش نہیں ہے تو ایسی صورت میں مولانائے موصوف کا علماء کرام کی خاموشی کو مورد الزام بنا کر ایک غیر موثر فیصلہ کی دعوت دینا ہرگز قرین دانشمندی نہیں ہے بلکہ وقت کے محرکات و عوامل سے چشم پوشی کے مرادف ہے۔

البتہ مسلمان اگر (العیاذ باللہ) اپنے مذہب کو پس پشت ڈال کر اس حد تک جرأت بیجا پر آمادہ ہو جائیں کہ ہندو دنیا کی طرح وہ بھی گائے کی تقدیس کو شعار بنالیں تو شاید یہ متفقہ فیصلہ اکثریت کے نزدیک درخور اعتنا بن سکے بشرطیکہ اس فیصلہ میں بھی ان کو کسی جگہ بوئے منافقت محسوس نہ ہو اور پھر اس کے ازالہ کے لئے ایک اور متفقہ کانفرنس منعقد کرنے کی ضرورت پیش نہ آجائے۔

بہر حال موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا عملی حل دو شکلوں میں سے ایک شکل میں ہو سکتا ہے،

(۱) یہ کہ مرکزی حکومت اعلان کرے کہ اگرچہ حکومت قانونی طور پر کسی جانور کی قربانی ممنوع قرار نہیں دیتی لیکن ملک کے فرقہ وارانہ حالات کو درست اصلاح کرنے کی خاطر یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ گائے اور اس کی نسل کے علاوہ مسلمان مذہبی نقطۂ نظر سے جس جانور کی بھی قربانی کرنی چاہیں کریں حکومت اس معاملہ میں ان کی مدد کرے گی اور جو ان کے جائز حق میں مداخلت کرے گا وہ قانون کی خلاف ورزی کا موجب ہوگا۔ اور نہ صرف یہ اعلان کرے بلکہ سرگرمی کے ذریعہ تمام

صوبائی حکومتوں کو توجہ دلائے کہ اضلاع اور قصبات و دیہات میں حکام اس حکم کی پوری طرح پابندی کریں اور اس جائز حق کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیں۔

یہ فیصلہ بظاہر خوش آئند معلوم نہیں ہوگا اور سطحی نظر سے کہا جائے گا کہ اس سے تو ہزار درجہ بہتر ہے کہ مسلمان خود ہی متفقہ طور پر یہ اعلان کر دیں کہ وہ گائے اور اس کی نسل کی قربانی کو بخوشی ترک کرتے ہیں۔ لیکن دور رسی کے ساتھ اگر اس پر غور کیا جائے تو پھر یہ اشکال خود بخود دور ہو جائے گا۔

کیا سطور بالا میں جو تصریحات کی گئی ہیں اس کے بعد بھی یہ خلجان رہ سکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی جانب سے بہتر سے بہتر فیصلہ بھی اکثریت کی نگاہ میں قابل پذیرائی نہیں ہو سکے گا اور اس لئے امن و امان کا معاملہ بھی خاطر خواہ ترقی نہ پا سکے گا اس لئے حکومت کا فیصلہ ہی ان حالات میں مؤثر اور امن و سلامتی کا بظاہر اسباب کفیل ہو سکتا ہے البتہ حکومت کے اس فیصلہ کو کامیاب بنانے میں پبلک کی امداد اور اس کا تعاون ضروری ہے

دوسرا حل یہ ہے کہ سیاسی موقف سے بالاتر ہو کر اکثریت کی جانب سے اقلیت کو دعوت دی جائے کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے ہم حکومت کی جانب نہ دیکھیں بلکہ دونوں فرقوں کے ایک نمائندہ اجتماع میں متفقہ فیصلہ کریں جس کی پشت پر طاقت کی بجائے رواداری محبت اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام ہو تب البتہ مولانا سعید احمد صاحب کی یہ پکار وقت کی پکار کہی جا سکتی ہے اور بلاشبہ اس وقت خاموشی مجرمانہ حیثیت رکھ سکتی ہے۔

اور اگر ان دونوں حل کی آج کوئی صورت بن نہیں آتی تو خواہ مخواہ خود کو بے قیمت وقت بنانا کیا ضروری رہ گیا ہے مہمل اقدام سے خاموشی ہزار درجہ غنیمت کیوں نہیں۔

رہا عید اضحیٰ کے موقعہ پر فرقہ پرستوں کی جانب سے فسادات کا ہنگامہ اور گائے کی قربانی نہ کرنے کے باوجود اس کا بہانہ بنا کر خوں ریزی کرنا تو کسی قسم کا حل بھی آپ سوچئے یہ تو اپنی شرارت پسند حرکات سے باز آنے سے رہے۔ ان مفسدوں اور شرارت پسندوں کا علاج

ہوا گزمنٹ ہے اور نہ متفقہ فیصلہ اور نہ کوئی حل بلکہ حکومت کی ملوی طاقت اور امن پسند پبلک کی ان کے خلاف نفرت ہی اس کا صحیح علاج اور انسداد کا بہترین ذریعہ ہے۔

اور یہ بات قابل اطمینان ہے کہ ان تمام اینٹ واں اور جنیں وچیاں کے باوجود ہندوستان میں بھی ایسے صاف دماغ، صاف قلب اور نیک سرشت انسان موجود ہیں جواب بھی یہ سوچتے ہیں کہ اس قسم کے مسائل کو باہمی رواداری اور ایک دوسرے کے جذبات کے پاس ولحاظ سے ہی حل ہونا چاہئے اور طاقت کے بل پر ہرگز نہیں ہونا چاہئے اور یہی وہ حضرت ہیں جو آج بھی مسلمانوں کے اس قسم کے فیصلہ کی وقعت کرنے پر آمادہ ہیں مگر اس مکدر فضا میں ابھی وہ اتنی قوت نہیں پاتے کہ اپنے فرقہ کی اکثریت کو بھی اپنا ہم خیال بنالیں۔

تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں حالات سے مایوس ہوں اور یہ کہ ملک کے حالات کی رفتار یہی رہے گی نہیں ہرگز نہیں ۱۹۴۷ء سے آج تک میرا مشن بھارت کے گوشہ گوشہ میں جدوجہد کرنا رہا ہے اس کا ہر ایک ذرہ شاہد ہے کہ میں مایوسی کو کفر اور احساس کمتری کو سب سے بڑا گناہ سمجھتا ہوں اور بحمد اللہ اس میں کامیاب ہوں۔

حالات آہستہ آہستہ بدل رہے ہیں اور برادران وطن میں جو حضرات صاف دماغ اور وطن عزیز کے سچے رہنما اور خادم ہیں آج ان کی مبارک کوشش بار آور ہو رہی ہیں اور فرقہ پرستی کا زہر کم ہوتا جا رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ یہ ملک اپنے دستور اور روح دہان کے مطابق ہر ایک شہری کے لئے باعزت مساویانہ زندگی کا حامل ہوگا اور صحیح معنی میں سیکولر اسٹیٹ بن جائے گا تب البتہ وہ وقت آئے گا کہ مسلمان اگر اس مسئلہ میں اپنے بلند کرداری کا ثبوت پیش کرنا چاہیں گے تو اس کی قدر و قیمت بھی ہوگی اور وہ مقصد بھی انشاء اللہ پورا ہو سکے گا جس کی جانب بیان کے شذرات میں توجہ دلائی گئی ہے۔

مولوی محمد

از

جناب منشی عبدالقدیر صاحب

آپ کا اصلی نام سردار بہادر سنگھ ولد سردار ہیرا سنگھ ولد سردار جھنڈا سنگھ تھا۔
قصبہ فرید آباد ضلع منٹگمری کے رہنے والے تھے اور معزز سکھ زمیندار گھرانے کے فرد تھے۔
قصبہ فرید آباد کی آبادی مخلوط تھی کہتے ہیں جس نے ضلع گوڑگانواں کے فرید آباد کو آباد
کیا تھا اسی نے یہ قصبہ بھی آباد کیا تھا فرید آباد کی مہندی مشہور ہے اور منٹگمری والے فرید آباد کی
شہرت اس لئے ہے کہ اس کے ہر گھر میں ایک ایک یا دو دو چھتے مینوں (بڑی سرخ رنگ
کی بھڑ یا ڈیموں کے ہیں)، کہتے ہیں کسی وقت یہاں دو جنگیں ایسی ہو چکی ہیں جن کی نظیر دنیا میں
نہیں ملتی۔ ایک جنگ تیتوں اور موہڑا کلاں (بڑی بڑی ٹانگوں کے چیونٹے یا ڈھک مکوڑے)
میں دوسری جنگ کوؤں اور بگلوں میں ہوئی اور ان میں لکھوکھا چیونٹے اور تیتے کوے اور
بگلے مارے گئے اور میدان لاشوں سے پٹ گئے یہ جنگیں ہفتوں تک جاری رہیں۔

قصبہ میں ایک اسکول تھا اس کے صدر مدرس ایک فاضل مولوی صاحب تھے
لڑکے مولوی صاحب کی حسن تربیت، طریقہ تعلیم اور شفقت سے بے حد مانوس تھے۔
ٹیکسٹ بک کمیٹی کے منظور شدہ نصاب تعلیم کے علاوہ مولوی صاحب خالی اوقات میں
اکثر طلبار کو قصص الانبیار کا بھی درس دیا کرتے تھے۔ لڑکے شوق سے پڑھتے تھے اور ان کی
بے حد خدمت کرتے تھے قصبہ کے باشندے بھی ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے اور ان کی خدمت
کو سعادت کا باعث خیال کرتے تھے۔

ایک روز ایک ذیلدار صاحب مدرسے میں آئے اور مولوی صاحب کو علیحدہ لے

جاکر اصل بات بتائی اور کہا کہ میں پانچویں جماعت کے طلبار کا امتحان لینا چاہتا ہوں میں ذیل دار ہوں۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ میری ایک اکلوتی لڑکی ہے جسے میں نے نازو نعمت سے پالا ہے اب وہ شادی کے قابل ہوگئی ہے اس کی کتخدائی کی فکر دامنگیر ہے۔ باوجود تلاش کے کوئی لڑکا میری مرضی کے مطابق نہیں ملا۔ اب میں نے یہ طے کیا ہے کہ لڑکوں کا امتحان لوں جو سب سے قابل نکلے۔ میں بر توکل اسی کے ساتھ شادی کر دوں۔ آپ بھی اس کار خیر میں میری مدد فرمائیں۔

مولوی صاحب نے اس طریقۂ انتخاب کو پسند کیا اور امتحان لینے کی اجازت دے دی چنانچہ ذیل دار صاحب نے ایک ایک لڑکے سے مختلف سوال کئے اور ہر ایک کی ذہنی اور فکری قابلیت کا اندازہ لگایا۔ اس آزمائش میں بہادر سنگھ اول آئے بعد اطمینان مولوی صاحب اور ذیل دار صاحب بہادر سنگھ کے والد کے پاس گئے۔ بات پختہ ہوگئی اور چند روز کے بعد بڑی دھوم دھام اور چاؤ سے ذیل دار صاحب نے اپنی لڑکی بہادر سنگھ کے ساتھ بیاہ دی۔ چنانچہ ابتدائی رسوم کے بعد لڑکی سسرال میں رہنے لگی۔

کچھ عرصہ بعد بہادر سنگھ اور ان کے تین ساتھیوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ قصبہ سے نکل چلو۔ ایک نے طے کیا کہ وہ جوگی بنے گا باقی تین نے تبدیل مذہب کا ارادہ کیا۔ وقت کے وقت قصبہ والوں کو چاروں لڑکوں کی سازش کا علم ہوگیا اور باہم چرچے ہونے لگے کہ کیا کیا جائے دو لڑکے تو اپنے والدین کے قابو چڑھ گئے اور دو نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگئے مفرورین کے تعاقب میں اہل دیہ گھوڑوں پر نکلے مگر کسی کا کھوج نہ لگا۔ جوگی بننے والے کا تو پتہ ہی نہیں کہ وہ کس پہاڑ کی کھوہ میں جا بیٹھا۔ مگر بہادر سنگھ سیدھے مولوی حافظ عبدالمنان صاحب کے پاس وزیر آباد پہنچے اور مشرف باسلام ہوکر ان ہی کے پاس رہنے اور دینیات پڑھنے لگے کیسوں کو پٹھوں میں تبدیل کر لیا۔ ایک سال کے بعد قصبہ والوں کو ان کا سراغ مل گیا چنانچہ بہت سے اقربار وزیر آباد آئے اور سمجھا بجھا کر بہادر سنگھ کو ہمراہ لے گئے اور وہاں ان کی کڑی نگرانی رکھی

ظاہر ہے بہادر سنگھ کے ساتھ نرم گرم سبھی قسم کا سلوک ہوا ہوگا مگر بہادر سنگھ نے کہا میں تو اسلام قبول کر چکا اب کسی شرط پر لوٹنے کے لئے تیار نہیں ہوں آپ کا جو جی چاہے مجھے سب کچھ برداشت کروں گا۔ اس بات سے دونوں وقت کھانا کھاتے میں ایک کہرام سا مچا کرتا تھا کیونکہ بہادر سنگھ چوکے کے باہر کھانا کھاتے تھے۔

بہادر سنگھ پر حقانیت غالب آچکی تھی۔ صداقت ان کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ ان پر وقت کے مظاہروں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا ایک روز موقع پاکر پھر وہ کھسک گئے اور سیدھے لاہور پہنچ گئے اور کسی مسجد میں مقیم ہو کر دینی تعلیم کے حصول میں منہمک ہوگئے۔ گذارہ کے لئے دو ٹیوشن تلاش کر لئے۔ تقریباً سال بھر کے بعد یہاں بھی ان کو کسی نے پہچان لیا۔ چنانچہ ان کے والد دوبارہ لاہور آکر ان کو فرید آباد لے گئے اور سخت نگرانی میں رکھا اس ڈھائی سال کے عرصہ میں وہ کافی لکھ پڑھ گئے تھے اچھے خاصے جوان اور سوچ سمجھ والے ہوگئے تھے۔ جب لوگ ان کو سمجھاتے تو وہ بدلائل ان کو قائل کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے والد صاحب کے رویہ میں تبدیلی ہوگئی وہ مائل بہ اسلام ہوتے گئے اور عقیدۃً مذبذب ہوگئے بہادر سنگھ کو انہوں نے ڈھیل دے دی کہ جس رنگ میں رہنا چاہو رہو خوش رہو اور نگرانی ترک کردی۔

بہادر سنگھ کے دماغ میں دینی تعلیم کا شوق گھر کر چکا تھا۔ ہر وقت اسی فکر میں رہتے کہ ہو سکے تو پھر قصبہ سے چلا جاؤں چنانچہ موقع پاتے ہی وہ دارالعلوم دیوبند پہنچے اور چند سال میں وہ فارغ التحصیل ہو کر دہلی آگئے اور فتحپوری میں مقیم ہوئے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ دہلی میں کہاں کہاں تعلیم پائی۔ بہر صورت دہلی میں ان کی بہت قدر ہوئی۔ شمس العلماء مولوی نذیر حسین صاحب عرف میاں صاحب کے باعث پھاٹک حبش خاں میں ان کو ایک مکان کرایہ پر ملا مولوی عبد المجید صاحب مناظر کے مطبع انصاری میں کتب دینیات کے مصحح ہوگئے۔ آپ کا میل جول شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی۔ مولوی عبدالرب صاحب میر شاہجہاں صاحب۔ مولوی تلطف حسین صاحب دغیرہم اور دیگر بزرگوں سے ہوگیا اور ان کی قابلیت کے جوہر کھلے تو مولوی نذیر احمد صاحب

نے ترجمہ قرآن جیسا مشکل کام سپرد کیا جس کو آپ نے باحسن وجوہ انجام دیا یہی ترجمہ بعد میں مولوی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ کہلایا اور انھی کی ذات گرامی کے باعث (مطبع انصاری) اپنی صحت کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں مشہور ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں مجھے بھی ان سے "صرف بہائی" کے چند اسباق پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

بہادر سنگھ کو ان سب بزرگوں نے مشورہ دیا کہ اب وہ خود اپنے وطن جائیں اور گھر والوں اور دوستوں کو پند و نصائح کریں چنانچہ آپ نے ان کی رائے پر عمل کیا اور بغیر اطلاع کے فرید آباد پہنچے تو اہل دیہ نے ان کا خیر مقدم کیا مگر دوسرے ہی روز پھر سب جمع ہوئے اور انھوں نے آپ کے والد صاحب کا بائیکاٹ کر دیا اور یہ الزام لگایا کہ وہ بباطن مسلمان ہو گئے ہیں اور یہ کہ انھوں نے بہادر سنگھ کو فراری کے مواقع بہم پہنچائے۔ اس حرکت سے قریب کے دیہات میں بہت چرچے ہوئے اور لوگ آپ کو دیکھنے اور ملنے کے لئے دور دور سے آئے اور مواعظ حسنہ سے فیضیاب ہونے لگے آپ نے اچھی خاصی تبلیغ شروع کر دی۔ مسائل دریافت کرنے والوں اور فتاویٰ حاصل کرنے والوں کا تانتا سا لگ گیا۔ گھر والے اس سے بہت پریشان تھے کہ کیا کیا جائے وقت پر وہیں اذان دینا اور وہیں نماز پڑھنا کوئی بات ہی نہ تھی۔ گھر والے آپ کو بہادر سنگھ کہہ کر پکارا کرتے تھے آپ نے کہا کہ آئندہ انھیں صرف "محمد" کہہ کر پکارا کریں اسے ان سب نے اس شرط پر تسلیم کیا کہ وہ گھر پر نماز نہ پڑھا کریں بلکہ قصبہ سے دور ادا کیا کریں اس سے ان کی دل آزاری ہوتی ہے آپ نے ان کی یہ شرط مان لی اور قصبہ سے تھوڑے فاصلہ پر ایک چاہ کے قریب ایک درخت کے نیچے قیام گاہ بنائی اور کافی عرصہ اسی حالت میں گذارا۔

ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا کہ آپ اپنے گھر کے دالان یا کمرے میں کہیں آرام کر رہے تھے کہ آپ کی اہلیہ محترمہ کوئی شے لینے یا رکھنے کے لئے برابر کی کوٹھڑی میں جانا چاہتی تھی کہ جیسے ہی وہ پاس سے گذری آپ نے جرأت کر کے آنچل پکڑ کر روک لیا اس سے قبل تبدیلی مذہب کی بنا پر دونوں میاں بیوی کے لب پر مہر خاموشی تھی۔ آپ نے کہا کہ بولنا چالنا کیوں بند کر رکھا ہے

میں وہی ہوں جو چند سال پیشتر تھا میرا تمہارا رشتہ قطع ہونے والا نہیں ہے کہو اب تمہاری کیا مرضی ہے۔ اس عفیفہ نے جواب دیا کہ میری کوئی مرضی نہیں۔ مرضی تو آپ کی ہے۔ میں آپ کی ہو چکی ہوں۔ ہر حال میں اسی گھر میں رہوں گی اور یہاں سے مر کر ہی نکلوں گی۔ اور آپ کا جو حکم ہوگا اسے بجالاؤں گی۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اگر یہی بات ہے تو میں بھی تمہارا ہو چکا ہوں اگر تم اسلام قبول کر لوگی تو ہم میاں بیوی رہ سکتے ہیں اور میں تمہارے اسلام لانے سے اپنے تئیں بہت خوش قسمت سمجھوں گا۔ اہلیہ محترمہ نے رضامندی ظاہر کی تو آپ بہت خوش ہوتے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے جس نے تمہارے دل میں تبدیلی پیدا کی ہے وہی آئندہ کے لئے بھی کوئی صورت پیدا کر دے گا اسی فکر میں کہ اب کیا کیا جائے آپ دریا پار ایک گاؤں میں وہاں کے نمبردار سے جو بنیا تھا مشورہ کے لئے گئے نمبردار بہت بارسوخ بعد ہر دلعزیز تھا اس نے کہا مولوی صاحب گھبرانے کی بات نہیں خدا سازگار ہے انشاء اللہ جو ہوگا بہتر ہوگا۔ اس کے بعد اس نے آپ کا لائحہ کار مرتب کیا اور آپ قصبہ میں واپس آگئے چند روز بعد دیوالی کا تہوار تھا گھر میں چراغاں ہوا۔ خوب زور شور سے تہوار منایا گیا رات کے آخری حصے میں یکے بعد دیگرے سب گھر والوں پر نیند غالب آگئی تو آپ خدا پر بھروسہ کر کے مع اہلیہ محترمہ کے گھر سے نکل کھڑے ہوئے قصبہ کے باہر کچھ فاصلے پر آپ کو دو گھوڑے تیار کھڑے ملے دونوں میاں بیوی گھوڑوں پر سوار ہو کر دریا کے کنارے پہنچے۔ وہاں دو کشتیاں پہلے سے موجود تھیں دونوں ایک کشتی پر سوار ہو کر دریا پار ہو گئے اور بنیا نمبردار کے مکان پر پہنچے۔ علی الصباح اس گاؤں کی مسجد میں آپ کی اہلیہ مشرف باسلام ہوئیں تجدید نکاح اور ایجاب و قبول ہوا اور نمبردار نے اپنے آدمیوں کی معیت میں اس خوش قسمت جوڑے کو دہلی روانہ کر دیا پروگرام یہ تھا کہ دو گھوڑے تو میاں بیوی کے واسطے تھے ہی مگر دریا تک راستہ کے دونوں جانب تقریباً دو سو لٹھ بند زمیندار بھی حفاظت کے لئے راستہ کے دور دیہ اس طرح کھڑے تھے جیسے وائسرائے کی گذرگاہ پر پولیس یا فوج کے جوان کھڑے ہوتے ہیں

جوں جوں ان کے گھوڑے آگے چلتے گئے زمیندار سمٹ سمٹ کر ان کے پیچھے چلتے گئے اور کشتیوں پر سوار ہو کر دونوں کی طرف سے باراتی بن گئے یہ بھی معلوم ہوا کہ کشتیوں کو دریا کے پار اس وقت تک نہیں جانے دیا گیا جب تک کہ میاں بیوی دہلی روانہ نہ ہو گئے۔

صبح گھر والوں نے جب دونوں کو غایب پایا تو کہرام مچ گیا۔ اہلیہ محترمہ کے والد کو بادل ناخواستہ اطلاع دی گئی جو فرط غم میں اس جوڑے کو ڈھونڈنے نکلے اور اس کے بعد وہ آج تک واپس نہیں آئے اور نہ ہی وہ اپنی لڑکی اور داماد سے کہیں ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

دہلی میں مدت مدید رہنے کے بعد جب مولوی محمد صاحب صاحب اولاد ہو گئے تو مع بال بچوں کے فرید آباد تشریف لے گئے مگر اس مرتبہ ان کے والد بزرگوار کا انتقال ہو چکا تھا پھر اس کے بعد بھی بار بار وطن جاتے رہے اور عزیزوں سے ملتے رہے ان کے بڑے بھائی سردار کاہن سنگھ بھی ملنے کے لئے دو مرتبہ دہلی آئے خط و کتابت بھی ہوتی رہی اور تمام تلخیاں مٹ گئے مولوی صاحب موصوف دہلی میں بہت ہی کثیر المشاغل رہتے تھے۔ بید متقی اور ملنسار تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنے جامع المصحف کے دیباچہ میں آپ کے متعلق ذیل کی عبارت لکھی ہے:۔

ترجمہ کے حق میں یہ ایک فال نیک تھی کہ حسن اتفاق سے مولوی ابو عبدالرحمٰن محمد صاحب ہاتھ آ گئے اور وہ شروع سے آخر تک میرے شریک بلکہ ایک اعتبار سے شریک غالب اور مددگار رہے ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھتے۔ بیچ میں میز خالی ہوتی میرے ہاتھ میں قرآن مجید اور کبھی میں نے حفظ پر اعتماد کیا تو قرآن بھی نہیں مولوی محمد صاحب کے گرداگرد تراجم اور تفاسیر اور کتب لغت میں ایک جملے یا ایک آیت کا ترجمہ جب الفاظ قرآن سے سمجھا بولتا اور مولوی محمد صاحب اس کو قلمبند کرتے اور پھر مجھ میں اور مولوی صاحب میں بحث ہوتی اور اختلاف کی صورت میں تراجم اور تفاسیر اور لغت کی طرف رجوع کیا جاتا اس طرح پر سارے قرآن کا ترجمہ کیا گیا براسہ قرآن کا ترجمہ ہے نہ دوسرے ترجموں کی طرح

ترجمے کا ترجمہ اس کا ماخذ قرآن کے الفاظ ہیں نہ کسی مفسر یا مترجم کے۔ پھر ہم دونوں نے ترجمہ پر نظر ثانی کی مولوی محمد صاحب ترجمہ پڑھتے اور میں عبارت کی سلاست اور الفاظ کی نشست کا دھیان رکھتا اور ترجمہ کو الفاظ قرآن سے ملاتا اور پھر ہم میں پہلے کی طرح بحث ہوتی اکثر ایسا ہوا ہے کہ بحث میں رنجش بھی ہو جاتی تھی مگر چونکہ دونوں کی نیت بخیر تھی۔ ہم دونوں نے کبھی مناظرے کی حد سے تجاوز نہیں کیا ابھی متفق ہو گئے ابھی لڑے اور ابھی ملے۔

مولوی محمد صاحب کا وصال غالباً ۱۹۱۰ء میں اور آپ کی اہلیہ محترمہ کا ۱۹۱۸ء میں انتقال ہوا تین عزیز دو سال پیچھے یکے بعد دیگرے فوت ہوئے ایک لڑکی خدیجۃ الکبریٰ اور ایک بچی انفلوئنزا کے دنوں میں ایک سال کے فرق سے یہ بہن بھائی بھی راہی عدم ہو گئے لڑکے کا نام عبدالرحمن تھا۔ اور باپ ہی کی طرح بہت خلیق اور صالح جوان تھا مولوی صاحب مرحوم کے تین نواسے اور ایک نواسی پاکستان میں بقید حیات ہیں صاحب اولاد ہیں اور کاروبار کرتے ہیں مولوی محمد مرحوم کے اعزا نے ان کے لڑکے مولوی عبدالرحمن کے نام تین سو بیگھہ زمین سن کے اٹھنے کی داخل خارج کرا دی تھی جس کی آمدنی وہ کئی سال تک لیتے رہے اب معلوم نہیں انقلاب کے بعد وہ زمین کس کے قبضے میں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے رشتہ دار سب کے سب حق پسند اور شریف انسان تھے۔

چند نئی کتابیں

اسما

(خواجہ احمد فاروقی ایم۔اے)

پچھلی سہ ماہی کے اردو ادب میں بڑی رنگارنگی اور بوقلمونی ہے۔اس میں ناول بھی ہیں افسانے بھی۔منظومات بھی۔اور مضامین و مقالات بھی۔تنقیدات اور سوانح و سیر بھی۔ارتقا کی وسعت اور پہنائی میں تین مہینے کی بساط ہی کیا۔لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ارتقا کا یہ مسافر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے۔اس کی رفتار بہت تیز نہ سہی لیکن یہ کیا کم ہے کہ اس نے کہیں ایک جگہ قیام نہیں کیا۔اور کسی رہ گزر کو منزل نہیں بنایا۔

اس زمانہ کی ایک اہم کتاب ۱۹۴۹ء کا بہترین ادب ہے۔اسے مکتبہ شاہراہ دلی نے شائع کیا ہے۔اس کے ترتیب دینے والے غلام ربانی تاباں۔گوپال متل۔کمال احمد صدیقی اور پرکاش پنڈت ہیں۔اس کے تین حصے ہیں (۱) مقالات (۲) منظومات (۳) افسانے اور خاکے۔یہ ۱۹۴۹ء کے ادب کا اچھا انتخاب ہے۔لیکن بہترین کا اطلاق مشکل ہے۔اڈیٹروں نے اس کا دعویٰ کیا ہے۔کہ انھوں نے اُردو کے تمام مشہور رسائل و جرائد کی ورق گردانی کی ہے لیکن انتخاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف چند مخصوص رسائل و جرائد کے لکھنے والوں کو انتخاب کیا ہے۔اور ان ہی کی تخلیقات کو بہترین ادب میں شامل کیا ہے۔حالانکہ دیگراں ہم بکنند انچہ مسیحا می کرد۔مثال کے طور پر علیگڈھ میگزین کے غالب نمبر اور نگار کی پچھلی اشاعتوں میں یقیناً ایک آدھ مضمون ضرور اس حیثیت کا تھا جو اس محفل میں غیر غیر نہ معلوم ہوتا۔دراصل انتخاب کا معاملہ ذوقی وجدانی بلکہ اصولی اور مقصدی ہے اور اس سے بقول غالب "دل کا معاملہ" کھل جاتا ہے۔اس لئے اچھا

ہوتا کہ فاضل اڈیٹر اپنے اصول انتخاب اور معیار ادب سے ہمیں آگاہ کر دیتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ ۱۹۴۹ء کے پورے ادب کا جائزہ لیا جاتا اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کی جاتی۔ اور مستقبل کے لئے نئی راہیں نکالی جاتیں۔

مقالات کی تعداد پانچ ہے۔ لیکن ان میں سے تین قابلِ ذکر ہیں۔ احتشام حسین صاحب نے حالی کے سیاسی شعور کا تجزیہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ حالی رجعت پسند، تنگ نظر اور ابن الوقت نہیں تھے بلکہ فراخدل۔ وسیع القلب، نئی زندگی کا استقبال کرنے والے اور حقیقت پرست تھے، اور سارے ملک کو جاگیرداری کے نظام سے باہر نکال کر صنعتی دور کے قبول کرنے پر تیار کرنا چاہتے تھے۔ احتشام صاحب کی نظر ادب کے تاریخی پس منظر پر بہت اچھی ہے۔ اور وہ واقعات کی تعبیر کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ یہ بصیرت ان کے اس مضمون میں بھی نظر آتی ہے۔

دوسرا اہم مضمون رام بلاس شرما کا زبان کے متعلق ہے ان کا خیال ہے۔ کہ زبان کے مسئلہ میں سامراجی مداخلت سے بڑا نقصان پہنچا ہے انھوں نے غالباً سب سے پہلے گریرسن کے سامراجی مقاصد کو واضح کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ہندی اور اُردو کے دو ادبی روائتی اسٹائل ایسی بڑی رکاوٹیں نہیں ہیں جو دور نہ ہو سکیں۔ یہ رکاوٹ انگریزی دور میں پیدا ہوئی۔ اب اسے دور کرنا ہے اس لئے کہ ایک قوم کی ایک ہی وقت میں کئی کئی زبانیں نہیں ہو سکتیں

اس مجموعہ کا تیسرا اہم مضمون ممتاز حسین صاحب کا ادب عالیہ کے متعلق ہے انھوں نے ماضی کے ادب کے جانچنے کا جو معیار پیش کیا ہے۔ اس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے لیکن عجیب لطیفہ ہے کہ اس مضمون پر بعض انتہا پسند حلقوں میں بڑی لے دے ہوئی۔ انھوں نے جو معیار پیش کیا ہے وہ یہ ہے۔

"ادب مخصوص قدروں اور خیالات کی تبلیغ کرتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تبلیغ کا اثر وقتی ہے یا دیرپا۔ وہ ہمارے خیالات اور جذبات کو متحرک کر کے ایک دیرپا عمل کی

تحریک کرتا ہے یا صرف وقتی جوش دلا کر چھوڑ دیتا ہے وہ ہمارے احساسات اور نفسیات
کی جوابی صلاحیتوں کو چھوتا ہے کہ نہیں اس میں اتنی صلاحیت ہے یا نہیں کہ وہ ہماری
نفسیات پر اثر انداز ہو کر ہمیں حالات کے بدلنے اور خود اپنے کو بدلنے میں مدد دے سکے.
اور ہماری نفسیات کو نئی قدروں سے ہموار کر کے ایک نئی جذباتی تنظیم بھی کر سکے"۔
دراصل ہر اچھے اور دوامی ادب کے جانچنے کا معیار یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں زندگی کے
بہتر اور بلند تر خیالات سے روشناس کرتا ہے۔ یا نہیں۔ اس میں انسان کے دکھے ہوئے دل
کی فریاد اور اعلیٰ ترین منصوبوں کی پرچھائیں ہے یا نہیں لیکن یہ کام بقول ممتاز صاحب "چیخنے
اور چنگھاڑنے کا نہیں ہے" آگ میں کود کر اسے گلزار بنانے کا ہے۔ اسی وقت شعر و ادب کی
اعلیٰ تخلیق ممکن ہے۔
منظومات کا حصہ کمزور ہے۔ اس میں نئی روح نئی معنویت اور ایک نئی عملیت تو ہے
لیکن اس کا نشتر دل پر نہیں لگتا۔ اس مجموعہ میں مشکل سے ایک آدھ نظم یا غزل ایسی ہو گی جس
کو ابدیت کے دربار میں جگہ حاصل ہو سکے۔ یا جس کو ۱۹۴۸ء کے بعد لوگ گنگنا سکیں اس کا ایک
سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے شاعروں کے ساز ٹھنڈے ہیں اور محرومی اور ناکامی نے ان کو مجبوب
مگو کی حالت میں مبتلا کر دیا ہے
افسانوں میں کرشن چندر کا افسانہ مہالکشمی کا پل بہت کامیاب ہے اس افسانہ میں
سیر میں کا لطف ہے۔ اس کے ذریعے ہم غریب ہندوستان کے نسوانی طبقہ کی زندگی کا اندازہ
کر سکتے ہیں یعنی ان کی امنگوں۔ ان کی آرزوؤں۔ ان کی محرومیوں کا کرشن چندر نے ہو داستان
چھ ساڑیوں کے ذریعہ بیان کی ہے جو مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں خاص
کا ذکر کر کے عام کی طرف ذہن کو منتقل کر دینا معمولی بات نہیں ہے کرشن چندر کو فن پر پورا
عبور ہے اور کسی جگہ اس کی گرفت ڈھیلی نہیں ہے۔
عصمت کا کیڈل کورٹ بھی اسی قسم کا افسانہ ہے لیکن اس میں وہ فنی پختگی اور روانی

وہ ساز نہیں ہے جو کرشن چندر کے افسانہ میں ہے۔ ابراہیم کا افسانہ "جانور" معمولی ہے۔ فن کے اعتبار سے بھی۔ ادب کے اعتبار سے بھی اور مذاق کے اعتبار سے بھی۔

۱۹۴۹ء کے اس ادب میں زندگی ہے قوت ہے۔ شدت احساس ہے۔ لیکن ابھی اسے اس اصلی ہندوستان کی نمائندگی کرنا ہے جو شہروں کے بجائے دیہاتوں میں نظر آتا ہے۔ محض خارجی اور سطحی علامتوں کی نقل کافی نہیں ہے۔

اس زمانہ میں ایک مختصر سی کتاب "کارواں" مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی ہے یہ حضرت روشؔ صدیقی کی ایک طویل نظم ہے جو اتنی حسین و جمیل شائع ہوئی ہے کہ دل و نظر دونوں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ عروس جمیل اور لباس حریر واقعی اسی کو کہتے ہیں۔

یہ ۱۹۳۹ء میں لکھی گئی تھی۔ اب پورے دس سال کے بعد سترہ اٹھارہ بند کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس نظم میں فلسفی اور شاعر کا مکالمہ ہے اور جو مسائل زیر بحث ہیں۔ وہ یہ کہ زندگی کیا ہے وہ رہ گزر ہے یا منزل۔ رہ گذر ہے تو کیا شاہراہ علم ہے یا شارع عمل یا جادۂ عشق؛ یہ متاعِ زندگی آخر کیا ہے۔ شاعر نے ایک ایک یت یا ISM کا جائزہ لیا ہے لیکن وہ کسی منزل پر قیام کرنا نہیں چاہتا۔ وہ ہر منزل کو شریک کارواں کر لیتا ہے۔ اسے نہ ساحل کی تلاش ہے اور نہ منزل کی۔ اس لئے کہ

نقدِ درویشی نہیں۔ تمکینِ سلطانی نہیں	شہریاری، کشور آرائی، جہاں باقی نہیں
کوئی منزل۔ انتہائے اوجِ انسانی نہیں	کوکبِ تقدیرِ آدم ہے۔ فروغِ امکاں

(ص ۳۷)

آخر میں اس نے بتایا ہے کہ خوابِ آدم بھی عشق ہے اور تعبیرِ آدم بھی عشق وہی ابتدا ہے اور وہی انتہا۔ یہی عشق۔ انسانیت کا احترام سکھاتا ہے۔ اور یہی عشق زندگی کے دکھ درد کا علاج بن سکتا ہے عشق کا یہ نظریہ ماضی سے مختلف ہے اور ڈاکٹر ژلی کا مے ود ووڈ ... خیالات سے ملتا جلتا ہے یہ ماہر حیاتیات کہتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز کے متعلق ہمارا علم نامکمل ہے

ہمارے حواس خمسہ ناقص ہیں۔ اور ہمارے آلات ان سے بھی زیادہ ناقص۔ اس لئے ہم محض عقل محض تک کے ذریعہ زندگی کی بلندیوں کو طے نہیں کر سکتے یہ کائنات یوں ہی وجود میں نہیں آگئی ہے۔ اور نہ یہ کوئی حادثہ ہے۔ ارتقائی داستان میں بہت سے اخلاقی مقاصد پوشیدہ ہیں اور ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا عقل اگر ضمیر کی ملامتوں سے ناآشنا ہے تو وہ خیر و شر کے انتخاب میں غلطی کرے گی وہ صلح جوئی۔ عافیت پسندی اور ادنیٰ درجہ کی مفاہمت یا مطابقت پذیری کے لئے مضطرب ہوگی۔ وہ کبھی بغاوت نہیں کر سکتی۔ مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خوب سے خوب تر کی جستجو نہیں کر سکتی۔ اس لئے یہ منزلیں خیر و محبت ہی کی زاد راہ سے طے ہو سکتی ہیں ملاشی صاحب کی اس نظم میں جوش۔ مستی اور غنائی عنصر موجود ہے اور ان خوبیوں نے مل کر اس میں غزل کی سی رنگینی پیدا کر دی ہے اسی زمانہ کی ایک اور اہم کتاب "آثار ابوالکلام آزاد" ہے جس کو قاضی عبدالغفار صاحب نے نفسیاتی مطالعہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

قاضی صاحب کا خیال ہے کہ مولانا ایک غیر معمولی ہستی یعنی جینیس ہیں اس کو انھوں نے خود مولانا ہی کے مضامین و اقوال کے ذریعہ ثابت کیا ہے لیکن ان مشاغل و مضامین کو نفسیات کی کسوٹی پر نہیں پرکھا۔ اس کی شاید وجہ یہ ہے کہ انھوں نے مولانا کا ایک بت بنا لیا ہے۔ اور وہ اس شوالہ میں اسی عقیدت کے ساتھ داخل ہوئے ہیں جس عقیدت کے ساتھ ایک پجاری مندر میں داخل ہوتا ہے حالانکہ اگر وہ نفسیاتی اصولوں کو کام میں لاتے اور ایک ایک قول و عمل کو تنقید کی روشنی میں دیکھتے تو بھی نتیجہ یہی نکلتا کہ مولانا کا بت اتنا بڑا ہے کہ وہ کسی مندر یا شوالہ میں نہیں آ سکتا اور یہ کہ ان کی نمود میں ایک طرح کی غرابت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی۔ مذہب میں۔ ادب میں۔ سیاست میں۔ معاشرت میں فکر و نظر کی عام راہوں میں۔ کسی راہ میں بھی وہ وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکے اور ان کی طبیعت فکر و عمل کے کسی گوشے میں بھی وقت اور موسم کے پیچھے نہ چل سکی۔ مولانا کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کے ماحول کو اچھی طرح سمجھا جائے جس ماحول میں ان کی نشو و نما ہوتی۔ اس میں حرم

واحتیاط کم سخنی اور کم آمیزی، شرافت اور عالی نسبی کی نشانی سمجھی جاتی تھی اسی لئے مولانا کے خطوں میں بھی کوپر کی سی سنجیدگی۔ پختہ مزاجی اور گرے کی سی نازک مذاقی اور وضع احتیاط ہے ان میں بائرن کی سی انانیت ہے۔ غالب کی سی سادگی و پرکاری نہیں ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو مولانا کے خطوں کا امتیازی وصف یہی ہے کہ وہ غالب سے اس درجہ مختلف ہیں مولانا کے خطوط ان کے ذہن کا دریچہ اور ان کے فکر کی زبان ہیں۔ اس لئے کہ ان کا دل عیش دماغ کا عیش ہے اور انھوں نے اس دماغ کو دل بنالیا ہے۔

یہ کتاب کتب پبلشر لمیٹیڈ بمبئی نے شائع کی ہے اور اسلوب کے اعتبار سے بڑی دلکش ہے اس زمانہ کی ایک اور اہم کتاب مطالعات نیاز ہے جس کو نیشنل بکڈپو کمپنی دہلی نے شائع کیا ہے اس میں نیاز فتحپوری کے افسانے اور تاریخی اور علمی مقالات شامل ہیں۔ نیاز صاحب ادب کی دنیا میں غیر معروف نہیں ہیں۔ ان کے مضامین اپنے دلچسپ انداز نگارش کی وجہ سے بہت مقبول ہو چکے ہیں اور ان کو ابدی شہرت حاصل ہو چکی ہے نیاز کی نثر میں فرانسیسی ادیبوں کی سی نازک کاری اور نفاست پسندی ہے مومن اور بیدل کی شاعری کو اگر کسی طرح نثر میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ تو اس کا رنگ وہی ہوگا۔ جو نیاز کی تحریروں کا ہے۔ نیاز کی شخصیت اس کے طرز تحریر میں حلول کر گئی ہے۔ اس میں جسم اور جان کا رشتہ ہے۔ اس لئے ہم ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کرسکتے ان کے بعض رومانی مضامین میں وہ لطف ہے جو یونانی سنگتراشوں کے مجسموں میں ہے اردو کے موجودہ لکھنے والوں میں اگر کسی شخص کی شہرت کا ایوان رفیع محض اسلوب نگارش پر قایم ہے تو وہ نیاز ہے اس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔ نیاز کے قلم میں ایک عجیب بوقلمونی ہے اس نے تقریباً ہر موضوع پر لکھا ہے اور جس پر لکھا ہے اس کو اپنا بنالیا ہے۔

باجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی

ادبیات

داستانِ قفس

از

(جناب الم مظفر نگری)

کانپ جاتے ہیں الٰہی در و دیوارِ قفس — کروٹیں لیتا ہے جس دم کوئی بیمارِ قفس

بے پر و بال پڑا ہوں پسِ دیوارِ قفس — یوں بھی آزاد نہ ہو کوئی گرفتارِ قفس

اشکِ خونیں سے ہے گلزار ہر اک تارِ قفس — میں گرفتارِ چمن ہوں کہ گرفتارِ قفس

جب سے صیاد نے دہرائے ہیں اذکارِ قفس — ذرّہ ذرّہ ہے گلستاں کا پرستارِ قفس

زندگی بھر رہا مدہوش گرفتارِ قفس — مستقل کیف ہے اک لذتِ آزارِ قفس

انتہا یاس کی ہے کتنی شگفتہ کہ مجھے — صبحِ گلشن نظر آتی ہے شبِ تارِ قفس

اس پہ قربان ہوئے جاتے ہیں مرغانِ چمن — قابلِ دید ہے یہ گرمیٔ بازارِ قفس

ہوں نہ پابندِ خرد اور نہ گرفتارِ جنوں — میں سزاوارِ چمن ہوں نہ سزاوارِ قفس

لے اڑا اس کو بہاروں میں کوئی سوئے چمن — دیکھتا رہ گیا حسرت سے نگہدارِ قفس

گلشنِ دہر میں کیا ذکر ہے آزادی کا — پردۂ ہر رگِ گل میں ہے نہاں تارِ قفس

اے الم عہدِ اسیری ہو کہ آزادی ہو
ہمت آموز ہے ہر حال میں دیدارِ قفس

تبصرے

حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی تقطیع کلاں ضخامت چار سو صفحات دو رہر صفحہ میں ۲۹ سطریں کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد آٹھ روپے بارہ آنے۔ پتہ:۔ نفیس اکیڈمی بلاس اسٹریٹ کراچی ۱۔

دوسری صدی ہجری کا نصف اول تاریخ اسلام کا ایک نہایت پُرآشوب زمانہ ہے یہی وہ زمانہ ہے جب کہ خلافت بنی اُمیہ اپنی زندگی کی آخری منزل سے گذر رہی تھی اور خلافت عباسیہ کے نام سے ایک دوسری حکومت عالم ظہور میں آنے والی تھی اس بنا پر سیاسی حالت یہ تھی کہ ممالک محروسۂ اسلامیہ میں ظلم و جبر۔ فتنہ و فساد اور بغاوت و سرکشی کی آگ جگہ جگہ بھڑک رہی تھی ایک پارٹی کی دوسری پارٹی کے خلاف ریشہ دوانیاں اور سازشیں روزمرہ کا مشغلہ بن گیا تھا۔ دین اور شریعت کو ہر پارٹی اپنے سیاسی مقصد کے لئے بے تکلف استعمال کرتی تھی دوسری جانب عجمیوں کے ساتھ اختلاط و ارتباط کے باعث اسلامی عقائد و افکار سے متعلق نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے تھے اور وہ مسلمانوں کی عام اخلاقی اور عملی زندگی کو متاثر کر رہے تھے غرض کہ پوری سوسائٹی ایک فکری و عملی انتشار و پراگندگی میں مبتلا تھی اور اس حالت کی شدت کا یہ عالم تھا کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے ارباب صلاح و تقویٰ اور اصحاب علم و ہدیٰ دم بخود ہو کر رہ گئے تھے اور ان پر ایک عام مایوسی اور بد دلی چھائی ہوئی تھی یہاں تک کہ ان میں سے بعض بعض نے تو اجتماعی زندگی سے تعلق منقطع کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور اپنی خلوتوں میں "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" کے منتظر تھے "قدرت نے حضرت

امام ابوحنیفہ قدس اللہ روحہٗ کی صورت میں "مردے از غیب" پیدا کیا۔ چنانچہ امام اعظم نے قرآن وحدیث کی روشنی میں شریعت اسلام کا مطالعہ نہایت باریک بینی اور دقت نگاہ سے کیا اور وقت کے مسائل کا حل اسی کی روشنی میں قیاس شرعی کی مدد سے پیدا کر لیا جو لوگ ان گوناگوں اور نہایت پیچیدہ مسائل ومعاملات کا نہ ادراک رکھتے تھے اور نہ ان کے طریق حل سے واقف تھے انھوں نے امام عالی مقام کو قیّاس اور نہ جانے کیا کچھ کہا لیکن آج تاریخ اسلام کا ہر صفحہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ امام اعظم نقہ حنفی کے نام سے جو ایک مکمل اور نہایت جامع دستور مرتب فرما گئے ہیں وہ نہ صرف کسی ایک خاص زمانہ یا صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ ہر دور میں ایک بین الاقوامی دستور حیات کی حیثیت سے واجب العمل ہے اس فقہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کو فطرت انسانی کے واجبات ومطالبات کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا گیا ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے مقننین ومدبرین اس پر حیران ہیں امام صاحب نے یہ اہم کام خود تنہا نہیں کیا تھا بلکہ اس مقصد کے لئے آپ نے کوفہ میں ایک مستقل مجلس "وضع قوانین" قائم کی جس میں اس عہد کے بڑے بڑے محدثین وفقہا جو امام صاحب سے تلمذ کا تعلق رکھتے تھے شریک تھے روزانہ صبح سے شام تک اس مجلس میں نئے نئے امور ومعاملات پر گفتگو ہوتی تھی ہر ایک آزادی کامل کے ساتھ اپنی رائے پیش کرتا تھا اور پھر سب سے آخر میں حضرت امام اپنی رائے بیان فرماتے تھے اس طرح اجتماعی وانفرادی زندگی سے متعلق ہزاروں مسائل تھے جو بحث وتحقیص کے بعد نکھر نکھرا کر مرتب ومدون ہو گئے حضرت امام کا یہ کارنامہ اتنا عظیم الشان ہے کہ دنیا میں جب تک اسلام کا وجود باقی ہے مسلمان کبھی اس کے بار تشکر واحسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے امام اعظم کی زندگی کا یہ کارنامہ اس قدر جلی اور روشن ہے کہ آپ کے حالات وسوانح میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں اس میں زیادہ تر اسی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے اگرچہ ساتھ ہی بعض اور حالات ومقامات بھی بیان کئے جاتے ہیں مثلاً آپ کا تقویٰ وطہارت عبادت

وظیفہ - حکومت سے استغنار - قضار کے عہدہ کا قبول نہ کرنا وغیرہ۔ لیکن ان کی حیثیت محض ضمنی ہے اور ان سے حکومت وسیاست میں امام اعظم کی انقلابی جدوجہد پر کوئی روشنی نہیں پڑتی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ امام صاحب صرف ایک بلند پایہ فقیہ وعالم ہی نہیں تھے بلکہ ایک عظیم المرتبت سیاسی مفکر بھی تھے جنہوں نے حکومت جابرہ کو حکومت عادلہ میں تبدیل کرنے کے لئے ایک طرف سیاسی انقلابی جماعت کی سربراہی کی اور دوسری جانب منصب قضا کو رونق دینے کے لئے امام ابو یوسف ایسے ائمہ کبار پیدا کئے جنہوں نے خلافت میں دخیل ہو کر اس کی ہیئت و وضع بدل دی اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے امام صاحب نے بہت بڑے پیمانہ پر تجارت کی تاکہ اس کے ذریعہ جہاں وہ خود امرا اور حکام سے بے نیاز ہو کر رہے۔ انھوں نے غیر مستطیع علمار کی مدد کی اور سیاسی انقلاب کی حامی جماعت کو مالی قوت بہم پہنچائی یہ تمام واقعات نہایت غیر مرتب طریقہ پر امام صاحب کے تذکروں میں بکھرے ہوئے پڑے تھے اللہ تعالیٰ اجر جزیل عطا فرمائے جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کو کہ آپ نے بڑی کدوکاوش اور تلاش وتحقیق کے بعد انھیں حالات وواقعات کو تاریخی طور پر اس طرح مرتب ومہذب کر کے پیش کر دیا ہے کہ امام اعظم کی زندگی کا یہ اہم کارنامہ جو اب تک نظروں سے پوشیدہ تھا صاف وشفاف ہو کر سامنے آجاتا ہے اور یہ واضح طور پر محسوس ہونے لگتا ہے کہ جس طرح ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے تخت پر اکبر وجہانگیر کے بعد اچانک شاہجہاں واورنگ زیب عالمگیر ایسے راسخ العقیدہ مسلمان بادشاہوں کا جلوہ نما ہونا حضرت مجدد الف ثانی کے نفوس قدسیہ کا فیضان اثر تھا اسی طرح سفاح ایسے ظالم کے بعد ہارون رشید اور مامون ایسے "سلاطین" کا جنہوں نے مسلمانوں کے "عہد زریں" کی تعمیر کی بتخت خلافت پر نمودار ہونا بے شبہ بہت کچھ امام عالی مقام کے سیاسی تدبر اور آپ کی انقلابی مساعی کا نتیجہ تھا فاضل مصنف نے یہ پوری داستان عجیب والہانہ اور دلچسپ انداز میں لکھی ہے جس کا اندازہ پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے پھر چونکہ مولانا کے قلم سیر رقم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اصل موضوع بحث کی حد بندیوں میں محصور نہیں رہتا بلکہ ضمنی مسائل ومباحث کو اپنے دامن تحریر میں سمیٹتا ہوا چلتا ہے اس لئے یہ کتاب صرف حضرت امام ابو حنیفہ کی سیاسی

زندگی کا مرقع نہیں بلکہ اس میں آخری دور امویہ اور ابتداء خلافت عباسیہ کی تاریخ اور اس عہد کی متعدد نامور شخصیتوں کے حالات و سوانح اور عام معاشرتی و سیاسی احوال و کوائف کا بھی قدرے مفصل تذکرہ آگیا ہے بہرحال یہ کتاب بہت معلومات افزا دلچسپ عبرت انگیز و مفید ہے اور اس لائق ہے کہ ہر مسلمان اور ہر صاحب ذوق اس کا مطالعہ کرے۔

احکام القرآن | از جناب محمد ثناء اللہ صاحب بی۔ اے تقطیع کلاں ضخامت ۲۰۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت دو روپئے۔ پتہ:۔ مکتبۂ تعلیمات اسلام لکھنؤ

اس کتاب میں عقائد۔ عبادات۔ اخلاق اور معاشرت و معاملات کے عنوانات کے ماتحت پہلے قرآن مجید کی آیات درج کی گئی ہیں اور پھر ان کی تشریح کے بعد کچھ فقہی احکام یا اس حکم کے اسرار و غوامص بیان کئے گئے ہیں زبان آسان اور انداز بیان دلچسپ و عام فہم ہے عام مسلمانوں کو نہ صرف اسے پڑھنا چاہئے بلکہ ایک کاپی اپنے پاس رکھنی چاہئے تاکہ ہر حکم کے متعلق انھیں بروقت یہ معلوم ہوسکے کہ اسلام کا کون سا حکم قرآن مجید کی کس آیت پر مبنی ہے۔

زندگی کے سائے | از جناب بلال احمد مرحوم تقطیع خورد ضخامت ۲۰۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد دو روپیہ۔ پتہ:۔ لاجپت رائے اینڈ سنز اردو بازار دہلی۔

یہ کتاب آٹھ افسانوں کا جو سماجی زندگی میں ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کے حامل ہیں اور جو امریکہ کی مشہور ناول نویس خاتون پرل بک اور اٹلی کے مشہور صاحب قلم انگیز یو سلونے کے لکھے ہوئے ہیں۔ اردو ترجمہ ہے۔ زبان شگفتہ اور رواں ہے مترجم کا انتقال اٹھارہ برس کی عمر میں ہوگیا جب کہ ابھی مرحوم کا غنچۂ طفولیت چٹک کر جوانی کا پھول بنا تھا اس عمر میں یہ انداز نگارش اور ترجمہ کی یہ عمدہ صلاحیت اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر مرحوم رہتے تو بے شبہ ادیبوں کی صف اول میں جگہ پاتے۔ یہ مجموعہ مترجم کی اس جوانمرگی کی یادگار کے طور پر شائع کیا گیا ہے اور امید ہے کہ اہل ذوق اس کی قدر کریں گے۔

REGISTERED No D 148.

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسن خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین۔ جو حضرات پچیس روپے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہوں گے ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ احباء۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احباء میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہیئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ بہرحال ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک)، فی پرچہ دس آنے ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی نمبر ۶ سے شائع کیا۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین دہلی کی مذہبی اور تاریخی مطبوعات

ذیل میں ندوۃ المصنفین دہلی کی چند اہم دینی، اصلاحی اور تاریخی کتابوں کی فہرست درج کیجاتی ہے
مفصل فہرست جس سے آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی دفتر سے طلب فرمائیے۔

اسلام میں غلامی کی حقیقت - جدید ایڈیشن جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں۔ قیمت ہے، مجلد للعہ

سلسلہ تاریخ ملت - مختصر وقت میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ سلسلہ نہایت مفید ہے۔ اسلامی تاریخ کے یہ حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع بھی۔ انداز بیان نکھرا ہوا اور شگفتہ

نبی عربی صلعم تاریخ ملت کا حصہ اول جس میں سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دلنشیں انداز میں یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ مجلد عم

خلافت راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ) عہد خلفائے راشدین کے حالات و واقعات کا دل پذیر بیان۔ قیمت ہے مجلد ہے

خلافت بنی امیہ (تاریخ ملت کا تیسرا حصہ) قیمت ہے مجلد ہے

خلافت ہسپانیہ (تاریخ ملت کا چوتھا حصہ) قیمت ع مجلد ع

خلافت عباسیہ - جلد اول (تاریخ ملت کا پانچواں حصہ) قیمت عہ مجلد للعہ

خلافت عباسیہ - جلد دوم (تاریخ ملت کا چھٹا حصہ) قیمت للعہ مجلد ھر

خلافت مصر تاریخ ملت کا ساتواں حصہ سلاطین مصر کی مکمل تاریخ صفحات ۳۰۰ قیمت مجلد ہے بلا جلد ہے

فہم قرآن - جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت عہ مجلد ہے

غلامان اسلام اسی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان۔ جدید ایڈیشن قیمت ھہ مجلد ہے

اخلاق و فلسفۂ اخلاق - علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جدید ایڈیشن جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دل نشیں اور سہل کیا گیا ہے۔
قیمت ہے مجلد عہ

قصص القرآن جلد اول تیسرا ایڈیشن حضرت آدم سے حضرت موسیٰ و ہارونؑ کے حالات و واقعات تک۔ قیمت عہ مجلد عہ

قصص القرآن جلد دوم۔ حضرت یوشع سے حضرت یحییٰ کے حالات تک تیسرا ایڈیشن۔
قیمت ہے مجلد للعہ

قصص القرآن - جلد سوم۔ انبیا علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان
قیمت ھر مجلد ہے

برہان

جلد بست و پنجم　　　　شمارہ (۶)

دسمبر ۱۹۵۰ء مطابق ربیع الاول ۱۳۷۰ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

گاؤ خوردن چہ ضرور

برادرِ محترم مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی نے گذشتہ اشاعت میں برہان بابت اکتوبر کے نظرات پر جو تنقید کی ہے اس کے مطالعہ سے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ برادر موصوف باوصف اپنے جلالتِ علم و عمل کے میری طرح ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو ذبح بقر کو ہندستان میں اسلامی شعار سمجھتے ہیں اور استدلال میں حضرت مجدد الف ثانی کا ارشاد پیش کرتے ہیں بلکہ آپ کے نزدیک بھی یہ صرف مباح ہے اور اس بنا پر مسلمان اس کو ترک بھی کر سکتے ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں" اس لئے نہیں کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ بعد از وقت بھی ہے اور قبل از وقت بھی اور اس لئے آج ایسا ہونا برادرانِ وطن کی نگاہ میں بے وقعت اور بے معنی ہے"! اور نہ صرف یہ کہ یہ ایک امر مباح ہے بلکہ اگر ساز گار اور مناسب حالات میں مسلمان اس کو ترک کر دیں تو اس سے ان کی اخلاقی بلندی کا ثبوت بھی ملے گا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے" علمار کا یہ متفقہ فیصلہ اس غرض سے کرانا مقصود ہے کہ مسلمانوں کو اپنی اخلاقی بلندی کا ثبوت دینے کے لئے ایسی بات کے ترک کر دینے کا متفقہ اعلان کر دینا چاہئے جس سے برادرانِ وطن کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے"۔ (صفحہ ۴۴)

اب مجھ میں اور برادر موصوف میں اختلاف صرف اس بات پر ہے کہ میرے نزدیک اس معاملہ میں جو کچھ فیصلہ کرنا ہے وہ ابھی اور فوراً کرنا چاہئے اور بھائی صاحب کی رائے میں اس کو ابھی یوں ہی رہنے دینا چاہئے اور اس کی وجہ آپ کے خیال میں یہ ہے کہ اگر اس وقت گاؤ کشی

ترک کی گئی توجہ کہ ہندو اکثریت میں ہونے کے بل بوتہ پر نشہ اقتدار و پندار سے سرشار ہیں اور ان کے مقابلہ میں مسلمان شکستہ حال و خستہ ہیں اس بنار پر مسلمانوں کا اس وقت ترک گاؤکشی کا عہد کرنا کوئی اچھا اثر پیدا نہیں کرے گا اور نہ صرف اسی قدر بلکہ مسلمان یہ عہد و اعلان کر کے برادران وطن کی نظر میں بے وقعت اور ذلیل ہو جائیں گے۔

اگرچہ برادر محترم موجودہ حالات میں ترک گاؤکشی کو نامناسب بتلاتے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کے قلم سے بے ساختہ ایک جملہ ایسا ٹپک پڑا ہے جس کا مطلب منطقی طور پر اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ ترک گاؤکشی عین وقت کے مطابق ہے۔ آپ فرماتے ہیں "یہ بعد از وقت بھی ہے اور قبل از وقت بھی" اب غور کیجئے تو منطقی طور پر اس فقرہ کی شکل یہ ہوگی

(۱) یہ بعد از وقت ہے یعنی قبل از وقت نہیں

(۲) یہ قبل از وقت ہے یعنی بعد از وقت نہیں

نتیجہ:۔ یہ نہ قبل از وقت ہے اور نہ بعد از وقت۔ یعنی عین وقت کے مطابق ہے

بہرحال آپ کا مطلب یہ ہے کہ تقسیم ہند سے بہت پہلے جب کہ ہندو اور مسلمان دونوں میں اتحاد و یگانگت پائی جاتی تھی وہ وقت ترک گاؤکشی کے لئے موزوں تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر وہ وقت موزوں تھا تو پھر اسے ترک کیوں نہیں کیا گیا اس زمانہ میں تو مسلمانوں کی پوری سیاست علمار کے ہاتھ میں ہی تھی اور جب حکیم محمد اجمل خاں مرحوم نے اس کی تحریک کی تھی تو اس کی مخالفت کن حضرات نے کی تھی؟ اور کیوں؟

دوسری بات آپ یہ کہتے ہیں کہ اب ایسا کرنا مناسب نہیں تو اس سلسلہ میں خاکسار راقم الحروف اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ چند سطور صرف اپنا نقطۂ نظر اور طریق فکر بیان کرنے کے لئے پیش کی جا رہی ہیں ورنہ اس کا مقصد نہ کوئی اپنا ایک الگ محاذ قائم کرنا ہے اور نہ برادر محترم سے یا کسی اور سے اس معاملہ میں معارضہ و مناقضہ کرنا ہے چنانچہ

میری طرف سے بیان میں اس سلسلہ کی یہ آخری تحریر ہے۔ اب میری معروضات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اس سے قطع نظر کہ موجودہ حالات میں ہندوؤں کی پوزیشن کیا ہے اور مسلمانوں کی کیا۔ نفس مسئلہ کی حیثیت سے اس پر غور کرنا چاہئے کہ گاؤکشی سبب نزاع ہے یا نہیں؟ اگر سبب نزاع ہے تو کیا مسلمان اس کی مقاومت کر سکتے ہیں؟ اگر مقاومت نہیں کر سکتے تو کیا از روئے احکام اسلام مسلمان اس سبب نزاع کو دفع و ختم کر سکتے ہیں؟۔ بس یہ تین سوالات ہیں جن پر غور کرنا ہے یہ ظاہر ہے کہ گاؤکشی آج سے نہیں ہمیشہ سے سبب نزاع بنی رہی ہے لیکن تقسیم ہند سے قبل چونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی طاقت متوازن تھی اس لئے مسلمان اس کی مقاومت کر سکتے تھے تقسیم کے بعد صورت حال یہ ہے کہ اس کا سبب نزاع ہونا تو شدید سے شدید تر ہو گیا ہے اور دوسری جانب مسلمانوں میں تاب مقاومت نام کو بھی نہیں رہی ہے۔ اس بنا پر اب سوچنا یہ ہوگا کہ مسلمان باختیار خود اس کو ترک کر سکتے ہیں یا نہیں؟ تو شریعت کہتی ہے کہ ہاں مسلمان اس کو ترک کر سکتے ہیں۔ پس اب لامحالہ شریعت کا حکم یہی ہوگا کہ اجتماعی طور پر اس کے ترک کر دینے کا اعلان کر دینا چاہئے اس سلسلہ میں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مولانا حفظ الرحمن صاحب نے صفحہ ۲۹۸ پر چند مقامات کا نام لے کر یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ "فرقہ پرست ہندوؤں نے مسلمانوں کی جان و مال کو نقصان پہنچانے کے لئے عید قرباں کو بہانہ بنا کر خون کی ہولی کھیلنا ضروری سمجھا" اگر اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ بعض مقامات پر فرقہ پرست ہندوؤں نے ایسا کیا تو کوئی شبہ نہیں کہ یہ بالکل سچا اور درست ہے۔ لیکن اگر مطلب یہ ہے کہ گاؤکشی سرے سے سبب نزاع ہی نہیں ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس طرح کی بات دنیا کا کوئی معمولی سے معمولی انسان بھی کہہ سکتا ہے چہ جائیکہ ملک کا ایک نامور عالم اور نہایت باہوش و دانش رہنمائے قوم۔

(۲) گاؤکشی جب سبب نزاع ہے تو اس کو اس کی اس حیثیت کے پیش نظر ختم کر دینا لامحالہ مفید اور عمدہ نتائج پیدا کرے گا۔ اور ان نتائج کی راہ میں ہندوؤں کا موجودہ پندار اکثریت حائل نہیں ہو سکے گا جس کا کہ برادر موصوف کو اندیشہ ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں آپ دیکھتے ہیں کہ

میاں بیوی میں کسی بات پر سخت جھگڑا ہو جاتا ہے۔ بیوی بر بنائے شرافت و نیک نفسی شوہر کی بری بھلی باتیں سن کر خاموش رہتی ہے اور اس کا کوئی جواب نہیں دیتی تو اگرچہ شوہر اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کو بیوی پر ہر طرح فوقیت و اقتدار حاصل ہے اور اس کے بالمقابل بیوی غریب کے لئے شوہر کے در کے علاوہ کوئی دوسرا در بھی نہیں ہے اور اس بنا پر ممکن ہے کہ بیوی کا جواب ترکی بترکی نہ دینا اسی مجبوری کے باعث ہو۔ لیکن بایں ہمہ بیوی کی خموشی کا اثر طبعی طور پر یہ ہوتا ہے کہ شوہر کو خود بعد میں اپنے قول و فعل پر ندامت ہوتی ہے اور وہ بیوی سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے۔

(۳) اور اگر بالفرض اس وقت ترک گاؤکشی کے اعلان سے ہندوؤں کو یہ خیال ہو بھی کہ مسلمانوں نے ڈر کے مارے ایسا کیا ہے نہ کہ اپنے کسی خاص فرض کے احساس سے تو ان کو یہ خیال اس وقت تو ہو سکتا تھا جب کہ یہ اعلان مسلم لیگ یا کسی اور جماعت کی طرف سے ہوتا۔ جمعیۃ علما کو ہر ہندو جانتا ہے کہ یہ بہادروں اور سرفروشوں کی جماعت ہے جس کے نزدیک حق کی راہ میں جان دے دینا معمولی بات ہے اور یہ جماعت جب کل انگریزوں سے مرعوب نہیں ہوئی اور نہ ہندو اکثریت کے خیالی بھوت نے اس کے دماغ پر مسلط ہو کر مسلمانوں کے لئے فرقہ وارانہ سیاست کا راستہ دکھایا تو آج وہ ہندوؤں سے کیوں ڈرنے لگی۔ اس بنا پر اگر جمعیۃ علماء کی طرف سے یہ اعلان ہوتا تو ہندو لامحالہ اس کا خیر مقدم کرتے اور وہ سمجھتے کہ جمعیۃ نے یہ اعلان ہندو سے ڈر کر نہیں کیا ہے بلکہ وقت کے تقاضہ کے مطابق فرض شناسی کے جذبہ سے کیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جب کل سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کے ہزیمت خوردہ و شکست یافتہ ہونے کے باوجود انگریزوں کو اپنانے کی پالیسی پر عمل کیا تو اس کا خیر مقدم خود انگریزوں نے کیا اور سر سید نے ان کی طرف تعاون و اشتراک کا جو ہاتھ بڑھایا تھا اس کو انھوں نے مضبوط پکڑ لیا کیوں؟ صرف اس لئے کہ انگریز جانتے تھے کہ سر سید وہی بہادر انسان ہے جس نے "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر پارلیمنٹ میں تہلکہ

پھاڑ دیا تھا اور جو ایک عظیم الشان دربار حکومت سے محض اس بات پر ناراض ہو کر اُٹھ آیا تھا کہ اس میں ہندوستانیوں کی کرسی انگریزوں کے برابر نہیں بچھی تھی سر سید کی اس بے خوفی اور بے باکی کی وجہ سے انگریزوں کو یقین تھا کہ اب سر سید نے انگریزوں کو اپنانے کی جو پالیسی اختیار کی ہے تو وہ مرعوب و خوف زدہ ہو کر نہیں بلکہ تقاضائے وقت کا صحیح جائزہ لینے کے بعد فرض شناسی کے جذبہ سے کی ہے یہاں اس سے بحث نہیں کہ سر سید کی یہ پالیسی بہر نوع صحیح تھی یا غلط۔ مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ مسلمانوں کی ہزیمت خوردگی کا تصور سر سید کی پالیسی کے متعلق انگریزوں کے دل و دماغ پر اچھا اثر پیدا کرنے میں مانع نہیں ہوا۔

(۴) اس سے قطع نظر کہ گاؤکشی کے عنوان سے اب تک کتنے مسلمانوں کی جانیں جا چکی ہیں اس معاملہ پر اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہیئے کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت نے مذہبی قومیت کی بنیاد پر تقسیم ہند کا مطالبہ کر کے اور پھر اس مطالبہ کو حاصل کر کے درحقیقت بھارت میں اپنے شہری حق کو خود ضائع کر دیا تھا۔ اس کے بعد اگر یہاں کے دستور میں مسلمانوں کو شہری حقوق نہ دیئے جاتے تو مسلمانوں کا منہ نہ ہوتا کہ وہ اس کے خلاف احتجاج میں ایک حرف بھی کہہ سکتے لیکن کانگرس کا مسلمانوں پر یہ بڑا احسان ہے کہ اس نے اس چیز کی ذرا پروا نہ کی اور ملک کے آئین میں مسلمانوں کو بھی ہندوؤں جیسا شہری تسلیم کر لیا، کانگرس کے اس احسان کے جواب میں مسلمانوں کو چاہیئے تھا کہ وہ قومی تشکر و امتنان کے طور پر گاؤکشی کے ترک کا اعلان کر دیتے۔ اگر دستور کی تکمیل کے فوراً بعد مسلمانوں کی طرف سے محض تشکر و امتنان کے جذبہ سے اس قسم کا اعلان ہوتا تو آپ دیکھتے کہ ایک طرف پنڈت نہرو۔ راجندر پرشاد اور راج گوپال آچاریہ ایسے مخلص کانگرسیوں کو مہا سبھا کے خلاف مسلمانوں کے لئے لڑنے میں کتنی تقویت ہوتی اور دوسری جانب خود اکثریت کے دل و دماغ پر اس کا کس قدر اچھا اثر ہوتا۔

(۵) علاوہ بریں آپ اپنے معاملات و مسائل کا صحیح اور کامیاب حل اسی وقت پیدا کر سکتے ہیں جب کہ آپ اپنا صحیح مقام اور مرتبہ معلوم کر لیں اور اس مقام کے مطابق آپ کو جو کرنا چاہیئے وہ

کریں ملک کی تقسیم کے بعد بھارت کے مسلمانوں کی مثال اس فوج کی سی ہے جو کسی محاذ پر اپنے حریف سے شکست کھا چکی ہے ایسی شکست خوردہ فوج کے لئے ضد اور ہٹ میں اسی جگہ پر کھڑا رہنا سرتاسر خودکشی کے مرادف ہے۔ اسے لامحالہ پیچھے ہٹنا چاہئے۔ پسپائی کی پالیسی پر عمل کرنا چاہئے اسے حالات کو متوازن کرنے کے لئے اپنے اندر لچک پیدا کرنی چاہئے۔ لیکن یہ لچک، یہ دبا ؤ اور یہ پسپائی بزدلی، بددلی اور نامردی کے ساتھ نہیں بلکہ حوصلہ و امید، اور ولولہ وارمان کے ساتھ محض اس خیال سے ہونی چاہئے کہ اب جب کہ اسباب طبعی کے ماتحت اس فوج کو شکست ہو ہی گئی ہے تو اب اس کے لئے محاذ سے پسپا ہونا بھی ایک طریق جنگ ہے۔ یہ پسپائی صرف اس بنا پر اختیار کرنی چاہئے کہ یہ فوج شکست کھا چکی ہے۔ اس وقت اس کا خیال ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ اس پسپائی پر دشمن ہنسے گا۔ اور اس پر کوئی اچھا اثر ہوگا یا نہیں ہوگا۔

بھائی حفظ الرحمٰن صاحب اگر گستاخی معاف کریں تو میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ آج مسلمانوں کے حالات کے عدم توازن کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک کی تقسیم تک مسلمان بحیثیت مجموعی فرقہ وارانہ سیاست کی زیر قیادت تھے اور اسی قیادت کے ماتحت آخر کار وہ ملک کے دو ٹکڑے کرا کے رہے لیکن ٹھیک ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو شب کے بارہ بجے یہ قیادت اپنا بستر بوریہ باندھ کر اس ملک سے رخصت ہو گئی اور اس کی جگہ جمعیۃ علمائے ہند نے لے لی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جمعیۃ نے یہ سب کچھ اسلامی حمیت و غیرت اور انسانی شرافت و ہمدردی کے جذبہ سے بے قرار ہو کر کیا کیونکہ جمعیۃ کو مسلمانوں سے تقسیم ہند سے قبل خواہ کچھ ہی کہا سنا اور اس کے ساتھ کیسا ہی برا اور ناگوار معاملہ کیا ہو لیکن اس سب کے باوجود جمعیۃ یہ ایک لمحہ کے لئے گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ مسلمان بے کس و بے بس ہو کر فتنہ و فساد کی دوزخ میں گھر کر رہ گئے ہوں اور جمعیۃ ان کا تماشہ دیکھتی رہے۔ چنانچہ حفظ الرحمٰن اور ان کے رفقاء خود بھی اس آگ میں کود پڑے اور مسلمانوں کو اس آگ کی لپیٹ سے بچانے کے لئے انھوں نے جس عظیم الشان فداکاری۔ جاں سپاری اور بے باکی و بے خوفی کا مظاہرہ کیا ہے میرے علم و یقین میں وہ صحیفہ شجاعت و جوانمردی کا ایک نہایت روشن باب ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کے

یہاں ان حضرات کے مراتب و مدارج صدیقین و شہدا سے کسی طرح کم نہیں ہیں یہ سب کچھ صحیح اور درست لیکن منطقی اعتبار سے جو بات غلط ہے وہ غلط ہی ہو گی۔ اب جمعیۃ کی مثال اس ڈاکٹر کی سی ہے جس کے سپرد ایک ایسا مریض ہوا ہے، جس کا کیس پہلے سے ایک اور انگھڑ اور اناڑی ڈاکٹر نے بگاڑ دیا ہے اور جب مریض کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی تو یہ ڈاکٹر مریض کو خدا کے سپرد کر کے کسی اور دوسرے ملک کو سدھار گیا ہے اب یہ دوسرا ڈاکٹر از راہ ہمدردی و شرافت اس مریض ناتواں کا علاج تو کر رہا ہے لیکن صرف اپنے انداز فکر اور طریق علاج کے مطابق اور یہ نہیں دیکھتا کہ پہلے ڈاکٹر نے مریض کے حالات میں کہاں کہاں اور کس کس راہ سے فساد پیدا کر دیا ہے اور ان چیزوں کی رعایت سے اسے کیا کیا کرنا چاہئے جمعیۃ نے ہندوؤں کے دوش بدوش جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے اس لئے وہ نہ ہندوؤں کے سامنے محجوب و شرمسار ہے اور نہ وہ ان سے دب کر کوئی بات کر سکتی ہے لیکن افسوس ہے کہ عام مسلمانوں کا حال یہ نہیں ہے، بس یہ ہے اصل خرابی کہ قوم کے حالات "پسپائی" کے متقاضی ہیں لیکن لیڈر شپ اپنے مخصوص کردار کے باعث اس کے لئے تیار نہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمان خود بخود گاؤکشی ترک کرتے جا رہے ہیں گذارش یہ ہے کہ جی ہاں! ترک کرتے جا رہے ہیں مگر صرف انھیں مقامات پر جہاں وہ نہیں کر سکتے مغربی بنگال میں گاؤکشی ممنوع نہیں ہے تو اس سال بھی عید قرباں کے موقع پر سینکڑوں گائیں قربان ہوئیں پولیس کے انتظامات ہر جگہ معقول تھے اس لئے فساد کہیں نہیں ہوا۔ اب سوچئے کہ اگر ایسے مقام پر مسلمان بطیب خاطر گائے کی قربانی نہ کرنے کا اعلان کر دیتے تو کیا اس سے مسلمانوں کی آن پر بٹہ لگ جاتا اور کیا اس سے فرقہ وارانہ تعلقات کو خوشگوار بنانے میں مدد نہ ملتی؟

اب حالات تیزی سے بدل رہے ہیں، ٹنڈن جی نے ناسک میں برملا کہا ہے کہ ہندوؤں کو گاؤکشی کے خلاف رائے عامہ پیدا کرنی چاہئے۔ ڈالمیا نے صاف صاف کہا ہے کہ اگر ۲۶ جنوری ۱۹۵۱ء تک گاؤکشی بند نہیں ہوئی تو میں اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دوں گا۔ اب سمجھ لیجئے کہ ان

سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟ تو کیا آپ یہ سب چیزیں ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہیں گے اور خود کچھ نہیں کریں گے حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ قوم کے لیڈر کا بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے فکر میں تبدیلی پیدا کرے اور حقائق کا واقعی جائزہ لے کر اخلاقی جرأت کا ثبوت دے "غور کیجئے صلح حدیبیہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے نمائندہ کے مطالبہ پر خود اپنے دستِ مبارک سے "رسول اللہ" کا لفظ لکھ کر مٹا دیا جس سے بعض بعض صحابہ کو سخت ناگواری ہوئی تو کیا یہ واقعہ اس کا ثبوت نہیں ہے کہ اسلام اپنے حریفوں سے معاملہ کرتے وقت کس حد تک لچک پیدا کرنے کی اجازت دیتا ہے صحابۂ کرام اس کو اپنی توہین یا ذلت سمجھتے تھے لیکن اللہ کا پیغمبر برحق اپنی جگہ مطمئن تھا کہ ایسا کرنا کفار قریش پر اللہ کی حجت کا تمام کر دینا ہے۔ اس کے بعد اگر ان بدبختوں نے شرائط صلح سے روگردانی کی تو پھر اللہ کا قہر ان کو پکڑے گا اور یہ اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

آخر میں اتنا اور عرض کرنا ہے کہ برادر محترم نے تخیلی اور عملی کا فرق بیان فرما کر اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ خاکسار راقم الحروف صرف ایک تخیلی شخص ہے جس کو عملی سیاسیات کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور اس کے برخلاف برادر محترم خود اور ان کے رفقا عملی سیاسیات کے مردِ میدان ہیں اس لئے اس معاملہ کو جتنے اچھے طریقہ پر وہ سمجھ سکتے ہیں یہ خاکسار نہیں سمجھ سکتا، گزارش یہ ہے کہ مجھ کو کھلم کھلا اپنی اس کوتاہی اور نقص کا اعتراف ہے اور میں واقعی عملی سیاسیات کا آدمی نہیں ہوں لیکن بایں ہمہ اس قدر عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر عملی سیاسیات کا مردانہ پن اور اس میدان کی شہسواری کا عالم یہی ہے جو تقسیم ملک کے فوراً بعد لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی انتہائی بربادی اور ہلاکت و تباہی کی شکل میں ہند اور پاکستان میں نظر آیا اور اب بھی اس کے اثرات نظر آرہے ہیں تو ہر شریف اور نیک طینت انسان کو دعا کرنی چاہئے کہ خدا اس کو اس عملی سیاسیات کی شہسواری سے محروم و نامراد رکھے۔

تدوین حدیث

محاضرۂ چہارم

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

(۱۱)

علیکم من الحدیث بما کان	لوگو ان ہی حدیثوں کو قبول کرو، جو عمر کے زمانے
فی عہد عمر فانہ قد اخاف	کی ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
الناس فی الحدیث عن رسول اللہ	طرف منسوب کرکے حدیثوں کے بیان کرنے
صلی اللہ علیہ وسلم (تذکرۃ الحفاظ)	پر عمر نے لوگوں کو ڈرایا اور دھمکایا تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اکثار یعنی بکثرت حدیثوں کی روایت سے ممانعت کی صرف یہ توجیہ کہ زیادہ روایت کرنے والوں سے احتیاط کی توقع جیسی کہ چاہئے نہیں کی جا سکتی تمام حالات میں تو یہ صحیح ہے مگر مجھ ہی سے آپ سن چکے ہیں کہ صحابہ میں بھی اور صحابہ کے بعد بھی محدثین میں ایک طبقہ ان لوگوں کا پایا جاتا تھا جن کی یادداشت اور حافظہ کی قوت کا تجربہ کیا گیا۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ دو تین نہیں بلکہ سیکڑوں حدیثیں ان بزرگوں کو اس طریقہ سے یاد تھیں کہ سال سال بھر کے بعد ان سے دوبارہ پھر وہی حدیثیں پوچھ کر لکھی گئیں اور پہلے لکھائے ہوئے مسودے سے ان کا مقابلہ کیا گیا تو ایک حرف کی کمی بیشی نہیں پائی گئی۔ آخر جن لوگوں کو اپنی روایتوں پر اتنا اعتماد ہو جیسا کہ ابو زرعہ کے حال میں گذر چکا کہ قسم کھانے والے نے یہ قسم کھائی کہ ابو زرعہ کو ایک لاکھ حدیثیں اگر زبانی یاد نہ ہوں تو میری بیوی کو طلاق پڑ جائے پھر ان ہی سے دریافت کرنے آیا، جواب میں ابو زرعہ نے کہا تھا کہ اطمینان سے تو اپنی بیوی کو اپنے

پاس رکھو ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اطمینان کی کیفیت اور کیا ہو سکتی ہے۔

میں یہی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی روایتوں کے متعلق جن کے اطمینان کی یہ حالت ہو، آخر ان کو کثرتِ روایت سے روکنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ یاد رکھنے والوں کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی روایت کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے حضرت عمرؓ بھی لوگوں سے یہی کہتے تھے کہ جن لوگوں نے میری باتوں کو یاد رکھا ہے، چاہیئے کہ وہ ان کو دوسروں تک پہنچائیں حافظ ابن عبدالبر نے حضرت عمر ہی کے حوالہ سے ان کا ایک قول حدیثوں کی روایت کے متعلق نقل کیا ہے، یعنی قیس بن عباد کہتے تھے

سمعت عمر بن الخطاب یقول من سمع حدیثا فاداہ کما سمع فقد سلم (ص۱۲۳ ج۲ جامع)	میں نے عمر بن الخطاب سے سنا کہ جس نے حدیث سنی اور جو کچھ سنا تھا اسی کو اس نے ادا کر دیا تو وہ محفوظ ہو گیا (یعنی روایت کی ذمہ داری کو اس نے پورا کر دیا)

ظاہر ہے کہ حضرت کے یہ الفاظ عام ہیں، ان لوگوں کو بھی شامل ہیں جن کی روایتوں کی تعداد قلیل ہو، اور ان کو بھی جن کی روایتوں کی تعداد کثیر ہو، شرط صرف یہ رکھی گئی ہے کہ جو کچھ اس نے سنا ہوا اسی کو اگر وہ بیان کر رہا ہے تو اپنی ذمہ داری اس نے پوری کر دی۔

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے متعلق جیسا کہ حافظ ابن عبدالبر نے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ممن ینظر الیہ ویوخذ عنہ ص۱۳۶ ج۲ جامع بیان العلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ان لوگوں میں ہیں جن کی طرف دیکھا جاتا ہے اور ان سے دین کو اخذ کیا جاتا ہے۔

اگر یہ ان ہی کا بیان ہے اور نہ ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے رسول اللہ کے اصحاب کے متعلق جس کا یہ خیال ہو اور ان ہی صحابۂ کرام کی باتوں کو مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں جو اہمیت حاصل

ہو سکتی تھی اس کا اظہار بار بار مختلف مواقع میں جو بایں الفاظ کرتا ہو کہ۔

انتم معاشر اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم متی ما تختلفون یختلف من بعدکم ص۹۸ ازالۃ الخفاء ج ۲	تم لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہو، جب تم ہی لوگ اس میں اختلاف کروگے تو جو تمہارے بعد آنے والے ہیں وہ بھی باہم مختلف ہو جائیں گے۔

جو ان ہی صحابیوں کو خطاب کر کرکے یہ پیش گوئی کرتا ہو کہ

انتم اصحاب بدر وقد اختلفتم فمن بعدکم اشد اختلافاً ص۹۸ ازالۃ الخفاء ج ۲	تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابیوں میں ہو جو بدر میں شریک تھے تم ہی جب اختلاف کر رہے ہو تو تمہارے بعد جو ہوں گے وہ زیادہ اختلاف کریں گے۔

کیا اسی فاروقی بصیرت سے یہ امر مخفی رہ سکتا تھا کہ ان ہی صحابیوں میں خبر آحاد کی حدیثیں عام طور پر مشہور و معروف ہو کر عمومیت کا رنگ جب اختیار کرلیں گی تو آئندہ نسلوں میں یہی رنگ کتنا سخت اور گہرا ہوتا چلا جائے گا اور دین کے اس حصہ کی تبلیغ میں خاص روش پیغمبر نے قصداً جس مصلحت سے اختیار کی تھی اس مصلحت پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

کچھ بھی ہو میرا خیال تو یہی ہے کہ منجملہ دیگر مصالح و وجوہ کے اقلال روایات پر حضرت عمرؓ کے اصرار کا ایک راز یہ بھی تھا۔ ازالۃ الخفا میں شاہ ولی اللہ نے قرظہ والی روایت جس میں اقلو الروایۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایتیں رسول اللہ سے کم بیان کرنا، کی وصیت کوفہ رخصت کرتے ہوئے صحابہ کی ایک جماعت کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمائی تھی، اسی روایت کو الدارمی کی کتاب سے نقل کرنے کے بعد شاہ صاحب نے دارمی کا ایک تشریحی فقرہ جو اس حدیث کے آخر میں انھوں نے لکھا تھا یہ بھی درج کیا ہے۔

قال ابو محمد (ھو الدارمی) معناً	ابو محمد (یعنی دارمی) نے کہا کہ میرے خیال میں حضرت عمرؓ

عندی الحدیث عن ایام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس السنن والفرائض ص۱۲۱	کہ اس قول کا (یعنی اقلال روایت پر اصرار کا) مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایام کی حیثیت سنن اور فرائض کی نہیں

الدارمی کے ان الفاظ کا کیا مطلب ہے ؟ افسوس ہے کہ اس کی تفصیل کا صحیح مقام "تدوین فقہ" والی کتاب ہو سکتی ہے، تاہم مختصراً یہاں بھی اتنا اشارہ نامناسب نہیں ہوگا کہ "البینات" میں نے دین کے جن عناصر و حقائق کا نام رکھا ہے اس کی تعریف تو پہلے کر چکا ہوں لیکن مصداقاً قرآنی مطالبات اور ان کے عملی تشکیلات ان کے اہم اجزا ہیں مثلاً اقیموا الصلوۃ میں الصلوۃ کا مطالبہ قرآن میں کیا گیا ہے، لیکن "الصلوۃ" کی عملی شکل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی، میرے نزدیک الدارمی کے مذکورہ بالا الفاظ میں فرائض سے قرآنی مطالبات اور سنن سے ان ہی فرائض کی عملی شکلیں مقصود ہیں کچھ یہی نہیں بلکہ عام طور پر حدیثوں میں فرائض کے بعد سنن کا لفظ جہاں جہاں آیا ہے میں تو اس کا مطلب یہی سمجھتا ہوں مثلاً حضرت ابوموسیٰ جب کوفہ کے والی حضرت عمرؓ کی طرف سے مقرر ہو کر آئے تو اس وقت آپ نے تقریر کرتے ہوئے یہ جو کوفہ والوں سے فرمایا تھا کہ

بعثنی الیکم عمر بن الخطاب اعلمکم کتاب ربکم وسنت نبیکم ازالۃ الخفاء ص۲۱۵ ج۲	مجھے تم لوگوں کے پاس عمر بن الخطاب نے اس لئے بھیجا ہے کہ تمہارے رب کی کتاب (قرآن) تمہیں سکھاؤں اور تمہارے رسول کی سنت کی تعلیم تمہیں دوں

تو کتاب کے بعد سنت کا جو لفظ یہاں استعمال کیا گیا ہے وہ کتابی اور قرآنی مطالبات کے عملی تشکیلات ہی کی طرف اشارہ ہے حضرت عمران بن حصین صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مجلس میں ایک شخص نے جب یہ مطالبہ پیش کیا کہ

لا تحدثونا الا بالقرآن	قرآن کے سوا ہمارے سامنے اور کچھ نہ بیان کرو۔

تو یہی "سنن" تھے جن کو پیش کرتے ہوئے آپ نے سمجھایا تھا کہ ان "سنن" یا عملی طریقوں

کے بغیر قرآنی احکام کی تعمیل کی صورت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ روایت میں ہے کہ جس شخص نے کہا تھا کہ قرآن کے سوا اور کسی چیز کا تذکرہ نہ کیا جائے حضرت عمران نے اس سے کہا کہ میاں اِدھر میرے قریب آ جاؤ جب وہ آپ کے پاس آ گیا تو آپ نے اس کو سمجھانا شروع کیا پہلے آپ نے الصلوٰۃ ہی کو لیا جس کا بار بار قرآن میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا ہے پوچھنا شروع کیا۔

ارءیت لو وکلت وانت اصحابك	تم سمجھتے ہو کہ تم اور جو تمہارے ہم نوا رفقار ہیں
الی القرآن اکنت تجد فیہ	صرف قرآن ہی پر ٹیک لگا لیں گے، تو کیا قرآن
صلاۃ الظہر اربعاً وصلاۃ	میں پا سکتے ہو کہ ظہر کی نماز چار رکعتوں پر اور عصر
العصر اربعاً والمغرب ثلاثا	کی بھی چار اور مغرب کی نماز تین رکعتوں پر مشتمل ہے

پھر آپ نے تمثیلاً حج کا ذکر کیا اور فرمانے لگے

ارءیت لو وکلت انت واصحابك	تم سمجھتے ہو کہ تم اور جو تمہارے ہم نوا رفقار ہیں صرف
الی القرآن اکنت تجد الطواف	قرآن ہی پر ٹیک لگا لیں گے تو تم قرآن میں پا سکتے
بالبیت سبعاً والطواف بالصفا	ہو کہ بیت اللہ (کعبہ) کا طواف سات دفعہ کرنا چاہئے
والمروۃ	اور صفا و مروہ کا طواف بھی سات دفعہ کرنا چاہئے

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے حج کے متعلق یہ بھی پوچھا تھا کہ

والموقف بعرفۃ ورمی الجمار	عرفات میں وقوف (قیام) اور رمی جمار کے مسئلہ کو کیا قرآن میں تفصیلاً پا سکتے ہو، شاید عرفات کی جگہ مزدلفہ کا لفظ ہو کیونکہ عرفات کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے مترجم)

یا چور کے ہاتھ کاٹنے کا قرآن میں اسلامی حکمرانوں کو جو ذمہ دار بنایا گیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ

والید من این تقطع امن ھٰھنا	اور ہاتھ کس طریقے سے کاٹا جائے کہاں سے یہاں
ام من ھٰھنا	سے یا وہاں سے۔

راوی کا بیان ہے کہ پہلے آپ نے گٹے پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ یہاں سے پھر کہنی پر ہاتھ رکھ کر پوچھا کہ کیا یہاں سے؟ پھر کندھے کے قریب ہاتھ لے گئے اور پوچھا کہ کیا یہاں سے؟

بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس وقت اس مسئلے کے تفصیلات میرے پیش نظر نہیں ہیں تفصیلات کے لئے کتاب "تدوین فقہ" کا مطالعہ کیجئے، یہاں مجھے الدارمی کے ان الفاظ کی شرح مقصود ہے جن کا حضرت عمرؓ والی روایت کے اندراج کے بعد انھوں نے اضافہ کیا ہے یعنی "فرائض اور سنن" کے متعلق اقلال کا یہ حکم حضرت عمرؓ نے نہیں دیا تھا بلکہ "الحدیث عن ایام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" سے آپ کے اس حکم کا تعلق ہے یہ بتانا چاہتا تھا کہ ایسے موقعوں پر "سنن" کا لفظ "فرائض" کے بعد جب بولا جاتا ہے تو مراد ان سے قرآنی فرائض و مطالبات کی عملی شکلیں ہوتی ہیں اسد ہی وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان چیزوں کی اشاعت میں تو عمومیت ہی مقصود ہے پھر ان کے متعلق "اقلال" کا حکم حضرت عمرؓ کیسے دے سکتے تھے البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے یا آپ کے سامنے کرنے والے جو کچھ کرتے تھے یا ان ہی دنوں میں بجائے عام امت کے خاص خاص افراد سے جو باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں یا خاص لوگوں نے آنحضرت کو کچھ کرتے دیکھا تھا الغرض عہد نبوت کی وہی چیزیں جن کی عمومی اشاعت پیغمبر کی طرف سے مسلمانوں میں نہیں کی گئی تھی جہاں تک میرا خیال ہے الدارمی کے ایام کے لفظ سے یہی مطلب ہے جیسا کہ میں یہی کہتا چلا آرہا ہوں، امام بخاری نے بھی اس قسم کی حدیثوں کی تعبیر قریب قریب ان ہی الفاظ سے کی ہے انھوں نے بھی اپنی مرتبہ کتاب صحیح بخاری کا یہ نام جو رکھا ہے یعنی

"الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وایامہ"

میں نے پہلے بھی اس کا تذکرہ کہیں کیا ہے ظاہر ہے کہ "امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وایامہ" یہ ان ہی حدیثوں کی تو تعبیر ہے جنہیں اپنی کتاب میں امام نے جمع کیا ہے۔ الدارمی اور

لہ الکفایہ خطیب ص ۱۲۶

بخاری میں صرف اتنا فرق ہے کہ ایام کے ساتھ "امور" کا اضافہ بھی امام بخاری نے کیا ہے اور الدارمی نے صرف "ایام" کے عام اور حاوی لفظ کو کافی خیال کیا بظاہر یہ ایک قسم کی اصطلاح معلوم ہوتی ہے، گویا "خبر آحاد" کی ایک تعبیر یہ بھی ہے

خلاصہ یہ ہے کہ دہی بات یعنی دین کا بنیاتی حصہ غیر بنیاتی چیزوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے، دونوں میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے جو یہ طریقہ فرمایا تھا کہ ایک کی تبلیغ و اشاعت میں عمومیت کا رنگ جس حد تک پیدا ہو سکتا تھا اس کے پیدا کرنے پر پورا زور صرف کر دیا گیا، اور گو پہنچانے کی حد تک پہنچا تو دیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے شعبے کو بھی لیکن اس کو ہر شخص تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اپنے زمانہ میں اس امتیاز کے باقی رکھنے پر زور دیا اور یہی غرض حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ان تدبیروں سے تھی، جن کا انتساب روایتوں میں ان کی طرف کیا گیا ہے حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی ازالۃ الخفار میں حدیثوں کے متعلق حضرت عمرؓ کے خدمات کی تفصیل کرتے ہوئے منجملہ دوسرے مصالح کے ان روایات کا ایک مطلب یہ بھی قرار دیا ہے شاہ صاحب فرماتے ہیں

باستقرار تام معلوم شد کہ فاروق اعظمؓ نظر دقیق در تفریق میان احادیث کہ بہ تبلیغ شرائع و تکمیل افراد بشر تعلق دارد از غیراں مصروف می ساخت [۱]	اچھی طرح چھان بین تلاش و تفتیش سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فاروق اعظمؓ کی دقیق نظر حدیث کے دونوں حصوں میں امتیاز پیدا کرنے پر جمی رہی یعنی وہ حصہ جس سے شرائع کی تبلیغ اور انسانی افراد کی تکمیل سے تعلق تھا اس میں مشغول رکھ کر دوسرے حصہ میں انہماک سے لوگوں کو روکتے تھے

"تبلیغ شرائع و تکمیل افراد بشر" کے الفاظ سے جیسا کہ ظاہر ہے قرآنی مطالبات کی عملی تشکیلات ہی کا تعلق ہے گویا الدارمی نے "سنن" کے لفظ سے جس مقصد کو ادا کیا تھا شاہ صاحب نے

زیادہ واضح الفاظ میں ان ہی کی تعبیر کی ہے اس کے بعد راقم فرماتے ہیں کہ

لہذا احادیث شمائل و احادیث سنن زوائد در لباس و عادات کمتر روایت می کرد ص۱۴۱ ج۲ ازالۃ الخفاء	اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل شکل وصورت سے جن حدیثوں کا تعلق تھا اور سنن زوائد یعنی قرآنی مطالبات کی عملی تشکیلات کے سوا حدیثیں جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس وعادات سے تعلق ہے حضرت عمرؓ اس قسم کی حدیثوں کو کم بیان کرتے تھے۔

ان روایتوں کو حضرت عمرؓ خود بھی کم بیان کرتے تھے اور دوسروں کو بھی حکم دیتے تھے کہ ان کا زیادہ چرچا نہ کریں یعنی وہی اقلال روایت کی توجیہ کرتے ہوئے شاہ صاحب نے بھی لکھا ہے کہ

انہا از علوم تکلیفیہ تشریعیہ نیست تحمل کہ چوں اہتمام تام بروایت آں بکار برند بعض اشیاء از سنن زوائد بہ سنن ہدی مشتبہ گردد ص	چوں کہ ان حدیثوں کا شمار ان علوم میں نہیں ہے جن کا مکلف لوگوں کو بنایا گیا ہے اور عام تشریعی قانون کی حیثیت ان کی نہیں ہے اس لئے اس کا احتمال تھا کہ اگر زیادہ توجہ ان کے بیان اور اشاعت کی طرف کی جائے گی تو سنن زوائد اور سنن ہدیٰ باہم ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ خلط ملط ہو جائیں گے

دارمی یا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ان اقوال کے پیش کرنے سے میری غرض یہی ہے کہ "اقلال روایت" کی جو وجہ میں نے بیان کی ہے، یہ میرا کوئی انفرادی خیال نہیں ہے، بلکہ ارباب تحقیق نے دوسرے مصالح و وجوہ کے ساتھ مختلف الفاظ میں مجھ سے پہلے بھی اس کو بیان کیا ہے کچھ بھی ہو خبر آحاد والی روایتوں کے متعلقہ خدمات میں سے ایک خدمت جو یہ تھی یعنی عمومیت کی ایسی کیفیت ان میں نہ پیدا ہونے پائے جس کی وجہ سے دین کے بنیادی حصہ کے مطالبوں کی جو قوت ہے کہیں اسی قوت کو لوگ اس میں محسوس نہ کرنے لگیں، جیسے عہد نبوت

میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نگرانی فرمائی اور گو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وقت ہی کیا ملا، لیکن جتنا وقت بھی ملا، جہاں دوسرے فرائض آپ نے ادا کئے وہیں اس کی طرف بھی آپ نے خاص توجہ مبذول رکھی، پھر جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو اپنے عہد خلافت کے ابتدائی سالوں میں ہم ان کو بھی اس مسئلہ کی طرف متوجہ پاتے ہیں، بعد کو کچھ واقعات پیش آئے جن کا ذکر آئندہ آرہا ہے، لیکن اس سے پہلے ان ہی حدیثوں کی وجہ سے قدرتاً معلومات میں لوگوں کے اختلاف کی جو کیفیت پیدا ہوگئی تھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس اختلاف کو اختیاری وارادی مخالفت کے قالب میں ڈھلنے سے جیسے روکا تھا میں چاہتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سلسلہ میں جو کارروائیاں کی ہیں پہلے ان کا تذکرہ کروں

اس قسم کے مسائل میں بعض چیزوں کے متعلق تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایسی روایتیں نقل کی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف کے دونوں پہلوؤں کے جواز اور تصحیح کی آپ نے کوشش کی ہے مثلاً نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہوئے بسم اللہ بلند آواز سے پڑھی جائے یا آہستہ یا رکوع میں نماز سے سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ بھی اٹھائے جائیں، یعنی وہی رفع الیدین کا مشہور خلافیہ یا اور اسی قسم کے متعدد مسائل میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دونوں طرح کی روایتیں کتابوں میں ملتی ہیں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ازالۃ الخفا میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ان مختلف روایات کو درج کرنے کے بعد یہی رائے قائم کی ہے کہ حضرت عمرؓ دونوں پہلوؤں کے جواز کے قائل تھے مثلاً رفع الیدین کے اختلافی روایات کے ذکر کے بعد ارقام فرماتے ہیں۔

والاوجہ عندی ان عمر رای	میرے نزدیک سب سے زیادہ لگتی ہوئی بات یہ ہے
رفع الیدین عند الرکوع والقومۃ	کہ حضرت عمرؓ رکوع میں جانے اور سر اٹھانے کے
منہ مستحبا فکان یفعل تارۃ	وقت ہاتھ اٹھانے (یعنی رفع الیدین) کو مستحب
ویترک اخری ازالۃ الخفا ص ۹۳ ج ۲	خیال کرتے تھے اسی لئے کبھی کرتے تھے اور کبھی چھوڑ دیتے

یہی بات کہ مسئلہ کے دونوں اختلافی پہلو کو حضرت عمرؓ جائز سمجھتے تھے بسم اللہ کے بآواز بلند و پست کے قصے میں درج کرنے کے بعد شاہ صاحب نے بھی اسی واقعہ کو یاد دلایا ہے جس کا تفصیلی ذکر میں پہلے کرچکا ہوں یعنی قرآنی الفاظ میں قرأت اور تلفظ کے اختلافات کے ہر پہلو کو جائز اور کافی ٹھہراتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام میں اختلافات کے برداشت کرنے کی جو گنجائش پیدا کی تھی، اسی واقعہ کا ذکر شاہ صاحب نے بھی کیا ہے بسم اللہ والے اختلافی روایات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

الاوجه عندی ان عمر تعلم	میرے خیال میں لگتی ہوئی بات یہی ہے کہ حضرت عمرؓ
من النبی صلی اللہ علیه وسلم	نے اس قصے میں جو ہشام بن حکم کے ساتھ پیش آیا
فی قصة مع ھشام بن حکم	تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سیکھی
ان القرآن انزل علی سبعة احرف	تھی کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے سب ٹھیک
کلھا کاف شاف ص ۹۱ ج ۲	اور شفا بخش ہے۔

اس کے بعد پھر بسم اللہ کے متعلق حضرت عمرؓ سے نقل کرنے والوں نے مختلف روایتیں جو نقل کی ہیں، سب ہی کی شاہ صاحب نے تصحیح کی ہے اور قرار دیا ہے کہ ان تمام پہلوؤں کو حضرت عمرؓ جائز سمجھتے تھے اسی لئے کبھی یہ کرتے تھے کبھی وہ کرتے تھے بلکہ اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے ایک اور واقعہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے عجیب بات لکھی ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ صرف قرأتوں کے اختلافات ہی کی حد تک نہیں بلکہ قرآنی عبارت کے مطالب کے سمجھنے میں بھی دو مختلف نقاطِ نظر کی تصحیح کی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخی نظیر چھوڑی ہے یہ مسئلہ کافی دلچسپ مگر ذرا تفصیل طلب ہے خلاصہ یہ ہے کہ پانی کے نہ ملنے کی صورت میں بجائے وضو، کے تیمم کرکے نماز پڑھ لینی چاہئے یہ تو خیر اتفاقی مسئلہ ہے لیکن بجائے وضو کے اگر کسی کو غسل کی حاجت ہو، یعنی ناپاک اور جنب ہونے کے بعد کوئی نہانا چاہے اور پانی وقت پر نہ ملے تو بجائے غسل کے تیمم ہی کرکے نماز پڑھنے کے قابل اپنے آپ کو کیا بنا سکتا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ اب تو سارے ائمہ اجتہاد کی طرف سے اس کا جواب اثبات ہی میں دیا جاتا ہے یعنی طے کر دیا گیا ہے کہ تیمم جیسے وضوء کا قائم مقام بن سکتا ہے اسی طرح غسل کی قائم مقامی کا کام بھی ضرورت کے وقت تیمم سے لیا جا سکتا ہے۔

لیکن تیمم کے مسئلہ کی جو تاریخ ہے اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابتداء اسلام میں بعض لوگ تیمم کو صرف وضوہی کا قائم مقام سمجھتے تھے اور غسل کے مسئلہ میں ان کا خیال تھا کہ

لا یتیمم الجنب وان لم یجد الماء شهراً — جنب (یعنی ناپاک آدمی) تیمم نہ کرے خواہ مہینہ بھر بھی اسے پانی نہ ملے۔ (بحوالہ ازالۃ الخفاء)

کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبداللہ بن مسعود کا یہی خیال تھا، ان دونوں حضرات کے اس خیال کی بنیاد کیا تھی اس وقت اس کی تفصیل میرے پیش نظر نہیں ہے، بلکہ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں اس موقعہ پر جو ایک عجیب و غریب نکتہ درج کیا ہے صرف اس کا ذکر مقصود ہے جاننے والے جانتے ہیں کہ اس

ؔ قصہ یہ ہے کہ ایک دن کوفہ میں ابو موسیٰ اشعری صحابی نے عبداللہ بن مسعود سے یہی مسئلہ پوچھا کہ بجائے غسل کے ناپاک آدمی کیا بضرورت تیمم نہیں کر سکتا اس پر عبداللہ نے کہا کہ ہاں! نہیں کر سکتا، خواہ پانی ایک مہینہ تک نہ ملے تب ابو موسیٰ نے قرآن کی آیت سورۂ مائدہ والی تلاوت کی جس میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی ہے کہ او لمستم النساء (یعنی اگر تم عورتوں کو) فلم تجدوا ماءً (پھر نہ پاؤ تم پانی) فتیمموا صعیدا طیبا (پس تیمم کرو پاک مٹی کے ساتھ) جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ہم بستری میں ناپاک ہونے کے بعد پانی اگر کسی کو نہ ملے تو تیمم کرلے۔ ابن مسعود بجائے اس بات کے کہ آیت کا جواب دیتے کہنے لگے کہ اگر اس کی اجازت دے دی جائے گی تو معمولی سردی اور ٹھنڈک میں بھی لوگ بجائے غسل کے تیمم سے کام چلانے لگیں گے ابو موسیٰ نے کہا کہ اچھا تو تم لوگ تیمم کو جو ناپسند کرتے ہو اس کی وجہ یہ ہے؟ ابن مسعود نے کہا کہ ہاں! تب حضرت ابو موسیٰ نے ابن مسعود کو حضرت عمر اور حضرت عمار کے سفر کا واقعہ یاد دلایا جس میں عمرؓ اور عمار میں اسی مسئلہ پر اختلاف ہوا تھا۔ عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خیال تھا کہ بجائے غسل کے پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کر کے نماز پڑھ لینی چاہئے مگر عمار کو وضو والا تیمم تو معلوم تھا لیکن غسل کی جگہ تیمم کرنے کی شکل کیا ہونی چاہئے اس کا علم ان کو نہ تھا، قیاس کر کے

(بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

مسئلہ میں یعنی تیمم غسل جنابت کا قائم مقام ہوسکتا ہے یا نہیں اس میں ابتداءً اختلاف ایک سفر کے موقعہ پر حضرت عمرؓ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان پیش آیا عمرو بن قاص نے قرآن کی آیت جو سورۂ مائدہ میں ہے اس کو پیش کرکے استدلال کیا کہ ضرورت کے وقت بجائے غسل کے تیمم کی اجازت اس آیت میں دی گئی ہے لیکن حضرت عمرؓ نے اس کو دعویٰ کے ثبوت کے لئے ناکافی قرار دیا، دونوں میں بحث ہوئی، اور ہر ایک اپنے اپنے خیال پر قائم رہا سفر سے واپس ہونے کے بعد مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا ہر ایک نے اپنا خیال اور خیال کی جو بنیاد تھی بارگاہ نبوت میں اسے عرض کیا روایت کو لوگوں نے جس طریقہ سے بیان کیا ہے جس کی حاشیہ میں تفصیل کی گئی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار ہی کے خیال کی تائید کی، صرف غسل والے تیمم کے متعلق ان کا جو یہ خیال تھا کہ گرد میں لوٹ پوٹ کر پورے جسم پر گرد کا اثر پہنچانا چاہئے صرف اس کی ترمیم کردی گئی کہ وضو والے تیمم کی شکل غسل کے تیمم کے لئے بھی کافی ہے بظاہر چاہئے تو یہی تھا کہ اس فیصلہ کے بعد حضرت عمرؓ اپنے خیال سے ہٹ کر عمار کے خیال کو مان لیتے لیکن حاشیہ والی روایت میں ابن مسعود نے جو یہ کہا کہ (باقی آئندہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) انھوں نے زمین میں لوٹ لگائی گویا بجائے پانی کے خاک دھول سے انھوں نے غسل کیا۔ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے قصہ جو پیش آیا تھا دہرا دیا گیا، آنحضرت نے عمار سے کہا کہ زمین میں لوٹ لگانے کی ضرورت نہ تھی صرف یہ کافی تھا یعنی اشارہ کرکے آپ نے بتایا کہ وضو والا تیمم جیسے کیا جاتا ہے بس یہی غسل کے لئے بھی کافی تھا۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل سے عمار ہی کے خیال کی توثیق ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ کا خیال اگر صحیح ہوتا تو چاہئے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمار سے کہتے کہ تم نے جو تیمم کیا وہی غلط تھا ابوموسیٰ نے ابن مسعود کو بھی یاد دلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عمار کے خیال کی توثیق کی تو اب غسل کا قائم مقام تیمم نہیں ہوسکتا اس خیال کی گنجائش ہی کیا باقی رہتی ہے ابن مسعود نے ابوموسیٰ کے اس بیان کو سن کر کہا کہ الم تر عمر لم یقنع بقول عمار (تم نے نہیں دیکھا کہ عمار کے قول پر حضرت عمرؓ کو اطمینان نہ ہوا)

امام دارقطنی

از
(جناب مولانا ابو سلمہ شفیع احمد بہاری استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

(۲)

کتاب العلل للدارقطنی علم حدیث کے انواع میں سب سے اجل واشرف اور سخت ومشکل حدیث معلول کا علم ہے یہ وہ وادی خارزار ہے جس میں ہر شخص قدم نہیں رکھ سکتا، ہاں جن کو قدرت کی فیاضی نے بصیرتِ تامہ، فہمِ ثاقب، حفظِ واسع اور معرفتِ کاملہ سے نوازا ہے وہی اس پر کلام کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس پر کلام کرنے والوں کی تعداد بہت مختصر ہے جیسے ابن المدینی امام احمد، امام بخاری، یعقوب بن ابی شیبہ، ابو حاتم، ابوزرعہ، دارقطنی وغیرہم، طولِ مجالست کثرت مطالعہ، غیر معمولی یادداشت اور مسلسل مذاکرات سے قدرتی طور پر ایک ملکہ اور نور پیدا ہو جاتا ہے جس سے سمجھ جاتے ہیں کہ اس حدیث میں علت ہے اور یہ معلول ہے لیکن وجہ پوچھئے تو کہہ نہیں سکتے جیسے جوہری کھوٹے سکے کو پرکھ لیتا ہے مگر وجہ نہیں بیان کر سکتا ابو ابن مہدی کے یہ الہامی علم ہے ابوزرعہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ حدیث کو معلول کس دلیل سے کہدیتے ہیں انھوں نے کہا میں دلیل کیا بتاؤں؟ تم ایک حدیث معلول کے متعلق مجھ سے سوال کرو اور میں اس کی علت بیان کروں پھر ابن وارہ کے پاس جاؤ اور ان سے اسی حدیث کی معلولیت کا جواب معلوم کرو اس کے بعد ابو حاتم کے پاس جاؤ اور ان سے بھی دریافت کرو اگر تینوں جواب مختلف نہ ہوں تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ علم نظری نہیں بلکہ فیوضِ الہامی کا مظہر ہے سائل نے ایسا ہی کیا اور سب کا جواب ایک ہی پایا اس کے بعد انھوں نے اعتراف کیا کہ بے شک یہ علم الہامی ہے۔[1]

---

[1] مقدمہ ابن صلاح

متقدمین میں علی بن المدینی (م ۲۳۴ھ) کی علل حدیث پر کتاب ہے جو اب ناپید ہے یہ ایک بہت مبسوط اور مفصل کتاب ہے حافظ ابن حجر اصابہ میں لکھتے ہیں "وقد بین علی ابن المدینی امر ھابیانا شافیا فی کتابہ العلل" محمد بن عبداللہ بن عمار الموصلی م ۲۴۲ھ کی بھی رجال وعلل پر ایک کتاب ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بھی بڑی کتاب ہے یزید بن محمد الازدی کا بیان ہے کہ موصلی کو علل حدیث اور حدیث کا فہم تھا۔

امام مسلم بن الحجاج صاحب الصحیح م ۲۶۱ نے بھی علل پر کتاب لکھی ہے جس کے متعلق حافظ ذہبی کا خیال ہے کہ فیہ مایوجد لہ غلط فی العلل[1]

امام ترمذی م ۲۷۹ کی علل پر دو کتابیں ہیں ایک جامع ترمذی کے ساتھ آخر میں لگی ہوئی ہے اسے علل صغریٰ کہتے ہیں دوسری کتاب کا نام علل کبریٰ ہے[2]

متاخرین میں ابن رجب حنبلی م ۷۹۵ نے اس کی شرح لکھی ہے جس کے متعلق علامہ کوثری کا بیان ہے کہ غزیز العلم، جلیل الفوائد، جم النقول الشاردة، لا یستغنی عنہ من یعنی بالعلل و مصطلح الحدیث[3]

عبداللہ بن محمد البلخی م ۲۹۴ کی بھی علل ہے مگر اس کا حال کچھ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔

ساجی م ۳۰۷ نے علل پر کتاب لکھی ہے جس کے متعلق حافظ ذہبی کا بیان ہے کتاب جلیل فی علل الحدیث یدل علی تبحرہ فی ہذا الفن

خلال بغدادی م ۳۱۱ کی کتاب علل پر ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ فی علل تصنیفات خلال امام احمد کے علم کے جامع اور مرتب و مولف ہیں اس لئے یقیناً یہ قابل قدر کتاب ہوگی۔

ابن ابی حاتم م ۳۲۷ کی کتاب نہایت اعلیٰ مگر مختصر ہے تقریباً بیس[4] بائیس سال ہوئے کہ فاضل شیخ محمد نصیف رئیس جدہ کی ہمت سے مصر میں شائع ہو چکی ہے مگر غلط ہونے کے علاوہ اس کی فہرست بھی نہیں دی گئی ہے جس سے پورا فائدہ حاصل کرنا مشکل ہے

[1] تذکرہ ج ۱ [2] العرف الشذی [3] لحظ الالحاظ [4] معارف ج ۴۴ نمبر ۲

الحجاج النیساپوری م ۲۶۵ھ نے بھی علل پر کتاب لکھی ہے جو اسی جزء سے زیادہ پر مشتمل ہے

لیکن علل پر دارقطنی کی کتاب جو بمنزلہ آفتاب ہے اس کے مقابلہ میں یہ تمام کتابیں ستاروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں دارقطنی کی علل اس فن کی بہترین تصنیف ہے علامہ تمیقینی کا خیال ہے کہ علل میں سب سے اجل کتاب ابن مدینی ابن ابی حاتم اور خلال کی ہے مگر ان سب کی جامع علل دارقطنی ہے اس لئے محدثین نے طالب حدیث کے آداب میں شمار کیا ہے کہ علل حدیث میں امام احمد اور دارقطنی کی علل پر حاوی ہونا چاہئے تاکہ ضبط و اتقان پیدا ہو علامہ حمیدی الاندلسی م ۴۸۸ھ صاحب الجمع بین الصحیحین فرماتے ہیں کہ فن حدیث کے شناور کو تین فنون میں بالخصوص مہارت حاصل کرنا ضروری ہے علل وفیات شیوخ رجال و ضبط مختلف و مؤتلف علل میں بہترین تالیف دارقطنی نے کی اور رجال و ضبط مختلف و مؤتلف میں امیر ابن ماکولا قتیل ۴۷۰ھ کی کتاب اعلیٰ و اکمل ہے اور وفیات مشائخ میں، میں خود (حمیدی) ایک کتاب لکھنی چاہتا ہوں جس کے متعلق امیر ابن ماکولا نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ سنوار اور حروف معجم کے اعتبار سے ترتیب دوں۔

لیکن افسوس کہ حمیدی بقول بعض اہل علم جمع بین الصحیحین میں ایسے مشغول ہوتے کہ مر ہی کر اٹھے حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ میں نے امیر کے مشورہ کو قبول کر لیا ہے اور اسی ترتیب سے تاریخ الاسلام ترتیب دی ہے اور اب یہ کتاب حیدرآباد میں چھپ چکی ہے۔

بہرحال دارقطنی علل حدیث میں نہایت بلند پایہ رکھتے ہیں ان کے ہمسر کوئی نظر نہیں آتا خود بھی کبھی حدیث کی علت بیان کرنے کے بعد تحدیث نعمت کے جذبہ سے مسرور ہو کر فرماتے اگر اس وقت امام احمد بن حنبل ہوتے تو اس حدیث کی علت کے بارے میں استفادہ کرتے ابو الفضل بن طاہر کا بیان ہے کہ میں نے سعد بن علی الزنجانی سے پوچھا کہ چار حفاظ حدیث

لہ تدریب لہ مسند میں اختلاف ہے میں نے ایک اختیار کر لیا ہے اختلاف کی گنجائش ہے ابو سلمہ

معاصر ہیں ان میں سب سے زیادہ احفظ کون ہیں؟ سعد نے پوچھا وہ کون چار ہیں؟ میں نے کہا بغداد میں دارقطنی، مصر میں عبد الغنی، اصبہان میں ابن مندہ، نیشاپور میں حاکم اس پر وہ خاموش ہو گئے میں نے اصرار کیا تو کہا اما الدارقطنی فاعلمہم بالعلل۔

دارقطنی علل میں استطراق جمع کرتے ہیں کہ ان کے حافظ اور وسعت علم پر حیرت ہوتی ہے حافظ ذہبی کا بیان ہے واذا شئت ان تبین براعۃ ھذا الامام فطالع العلل لہ فانک تندھش ویطول تعجبک اور سچ تو یہ ہے کہ اس میدان کے شہسوار علی بن المدینی کے بقول جب تک سارے طرق جمع نہ کئے جائیں خطا غلطی واضح نہیں ہو سکتی ہے۔

اس وقت جو نسخہ علل دارقطنی کا ہے وہ برقانی کا نسخہ ہے دارقطنی اپنے حفظ سے املا کراتے تھے اور یہ جمع کرتے جاتے تھے خطیب بغدادی نے برقانی سے پوچھا ھل کان ابو الحسن یملی علیک العلل من حفظہ قال نعم وانا الذی جمعتہا وقرئھا الناس من نسختی

علل دارقطنی کا نسخہ ہندوستان میں موجود ہے گو کچھ ناقص ہے، بانکی پور لائبریری میں اس کی تین جلدیں ہیں، ثانی، ثالث، خامس، ثانی کا نسخہ قدیم ہے سنہ کتابت تقریباً ۸۰۰ ہے خط نسخ ہے ۲۳۰ اوراق ہیں ہر صفحہ میں ۲۵ سطریں، جزء ثالث کا سنہ کتابت تقریباً ۱۰۳۰ھ ہے خط نسخ ہے اس میں ۲۶۰ اوراق ہیں ہر صفحہ میں ۲۲ سطریں ہیں۔ جزء خامس کا سنہ کتابت تقریباً وہی ہے جو ثالث کا ہے اس میں ۲۶۹ اوراق ہیں ہر صفحہ میں ۲۳ سطریں ہیں۔ انگریزی فہرست مطبوعہ ۱۹۲۹ء مرتبہ مولوی عبد الحمید صاحب مرحوم میں ہے کہ اس کا نسخہ کسی فہرست میں نہیں ہے مگر مجھے اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہے، علاوہ ازیں علل کا نسخہ سندھ اور حیدرآباد میں بھی موجود ہے اور ہندوستان سے باہر بھی۔

ناظرین اجازت دیں کہ نمونہ پیش کروں۔

وسئل عن حدیث عروۃ عن عائشۃ استفتت ام حبیبۃ بنت جحش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الاستحاضۃ فقال یرویہ اللیث بن سعد وسلیمان

---

۱ تہذیب ملاحظہ کرو

بن کثیر ومحمد بن اسحق عن الزھری عن عروۃ عن عائشہ وخالفھم ابراھیم
بن سعید وسفیان بن عیینۃ ومعمر بن راشد فرووہ عن الزھری عن عمرۃ
عن عائشہ واختلف عن یونس بن یزید فرواہ شبیب بن سعد عن یونس
عن الزھری عن عروۃ عن عائشہ وعن الزھری عن عمرۃ عن عائشۃ عن
ام حبیبۃ، وقال اللیث بن سعد عن الزھری عن عمرۃ عن ام حبیبۃ ولم
یذکر عائشۃ واختلف عن ابن ابی ذئب فرواہ ابو داؤد الطیالسی عن ابن
ابی ذئب عن الزھری عن عائشۃ وقال ان زینب بنت جحش استحیضت
ووھم فی قولہ زینب، وخالفہ معن بن عیسیٰ ویزید بن ھارون وخالد بن
الولید فرووہ عن ابن ابی ذئب عن الزھری عن عروۃ وعن عمرۃ عن عائشۃ
وقالوا فیہ ان ام حبیبہ بنت جحش وکذلک رواہ النعمان ابن المنذر وابو وجیہ
حفص بن غیلان عن الزھری عن عروۃ وعمرۃ عن عائشہ واختلف عن الاوزاعی
فرواہ محمد بن کثیر ومحمد بن یوسف الفریابی عن الاوزاعی عن الزھری
عن عروۃ عن عائشۃ وخالفھم الولید بن مسلم ویحیٰ بن عبداللہ البابلی
وخالد بن نزار وھقل بن زیاد واختلف عنہ والھیثم بن حمید فرووہ عن
الاوزاعی عن الزھری عن عروۃ وعمرۃ عن عائشۃ وقیل عن الاوزاعی
عن الزھری عن عائشۃ ورواہ معاویۃ بن یحیٰ الصدفی
عن الزھری عن عمرۃ عن ام حبیبۃ ولم یذکر عائشہ بمتابعۃ اللیث عن
یونس ورواہ ابراھیم بن نافع وجعفر بن برقان عن الزھری مرسلا عن النبی
صلی اللہ علیہ وسلم ورواہ محمد بن عمر بن علقمۃ ھذا الحدیث عن الزھری
عن عروۃ عن فاطمۃ بنت ابی حبیش واتی فیہ بلفظ اغرب بہ وھو قولہ ان
دم الحیض دم اسود یعرف ورواہ سھل بن ابی صالح عن الزھری عن عروۃ
عن اسماء بنت عمیس انھا استحیضت وروی ھذا الحدیث عن ادعن مالک

عن عروۃ عن عائشہ وکذلک رواہ عن قتادۃ عن عروۃ عن عائشہ ورواہ
ابوبکر بن عمر بن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عن عائشہ وقال ابراھیم الحربی فی ہذا الحدیث
ان الصحیح منہ قول من قال ام حبیب بلاھاء وان اسمہا حبیبۃ بنت جحش وھی
اخت حبیبۃ بنت جحش وان من قال فیہ ام حبیبۃ بنت جحش او زینب فقد
وھم، والحدیث صحیح من حدیث الزہری عن عروۃ وعمرۃ جمیعا عن عائشۃ
ان ام حبیبۃ قال الشیخ وقول ابراھیم الحدیث صحیح وکان من اعلم الناس
بھذا الشان":

کتابیات اور تتبع کلام اللہ کے بعد صحیح بخاری کے ساتھ علمائے امت نے جس قدر اعتنا بحث
وتمحیص اور تشریح وتوضیح سے کام لیا اتنی کسی دوسری کتاب کی خدمت نہیں کی گئی اس
کے ہر ہر پہلو پر ارباب علم وبصیرت نے روشنی ڈالی ہے بالغوی نے لغت سے بحث کی ہے
تو نحوی نے اعراب پر خامہ فرسائی کی ہے کسی نے ترجمہ اور استنباط مسائل کو عنوان بحث بنایا
تو کسی نے اسماء الرجال کو موضوع بحث قرار دیا۔ علامہ چلپی صاحب کشف الظنون نے تقریباً
۸۲ شرحوں کا نام شمار کرایا ہے۔

غرضکہ بخاری شریف کے ہر ہر حرف ولفظ پر بحث کی گئی ہے اور اس کا کوئی گوشہ تشنہ
نہیں چھوڑا گیا ہے ان میں سے بعض علماء ربانین ایسے بھی گذرے جنہوں نے بخاری کے
اوہام وعلل کو موضوع منتخب کرکے اس میں زبردست حصہ لیا چنانچہ ابومسعود الدمشقی م ۴۰۱
نے صحیحین پر استدراک کیا اسی طرح ابوعلی الغسانی الجیانی اپنی تصنیف تقیید المہمل کی
جزء العلل میں استدراک کیا ہے جو اکثر وبیشتر رواۃ پر ہے علامہ عینی م ۸۵۵ نے الانہام بما
وقع فی البخاری من الابہام میں مبہم راوی سے بحث کی ہے ابوالفضل محمد بن ابی الحسن
الحافظ الامام م ۳۱۷ نے صرف مسلم شریف کی تمیش سے کچھ زائد حدیثوں پر تتبع کیا ہے اور اس
کے علل کو بیان کیا ہے، اس کا ایک جز حافظ ذہبی نے ملاحظہ کیا ہے۔ اسی موضوع پر حافظ بغداد
دارقطنی نے بھی دو رسالے لکھے ہیں ایک کتاب الالزامات دوسرا کتاب التتبع کتاب الالزامات میں

ان صحیح حدیثوں کو جمع کیا ہے جو بخاری و مسلم کے شرطوں پر ہیں لیکن صحیحین میں نہیں ہیں۔ تتبع میں نقد ہے کل ایک سو دس حدیثیں صحیحین کی ہیں جن پر دارقطنی نے کلام کیا ہے ۳۲ حدیثیں تو متفق علیہ ہیں اور ۷۸ حدیثیں ایسی ہیں جن میں بخاری منفرد ہیں، دارقطنی کے نقد کی نوعیت کیا ہے اور علماء نے اسے کس نظر سے دیکھا؟ سنئے

ثم ان الدارقطنی تتبع علی البخاری	دارقطنی نے اگرچہ امام بخاری کا سو جگہ سے زیادہ
فی ازید من مائة موضع ولم	موقع پر تعاقب کیا ہے مگر ان سب کا تعلق اسناد
یستطیع ان یتکلم الا فی الاتصال	کے وصل و ارسال سے ہے الا یہ کہ ایک حدیث
بالوصل والارسال غیر موضع	کے متن پر بھی کلام کیا ہے اور وہ حدیث یہ ہے
واحد وهو اذا جاء احدکم	اذا جاء احدکم والامام یخطب فلیصل
والامام یخطب فلیصل رکعتین	رکعتین ولیتجوز فیهما۔ اس کی وجہ یہ ہے
ولیتجوز فیهما فانه تکلم فیه	کہ دارقطنی ہمیشہ محدثین کے قواعد کو پیش نظر
فیما یتعلق بحال المتن ووجهه	رکھتے ہیں اور اس کے مطابق کلام کرتے
ان الدارقطنی یمشی علی القواعد	ہیں اور بخاری کی شان اس سے بہت زیادہ
الممهدة عندهم فیما تعلق من	بلند وارفع ہے وہ اپنی بصیرت و اجتہاد کو دلیل
القواعد وشان البخاری ارفع	راہ بناتے ہیں اور قواعد تو عوام کی خاطر غیر محدود کو
من ذلك فانه یمشی علی اجتهاده	محدود کرنے کے لئے ہیں ور بخاری و مسلم کا مرتبہ
وینظر الی خصوص المقام و شتهما	ان سب سے اونچا ہے اگرچہ ان دونوں میں تھوڑا
الوجه ان القواعد لتغییر	سا اختلاف ہے
الممارس علی سهل التحدید لتعرّم	
فیما لم یرد به التحدید من الشارع	

ل کشف الظنون

ورتبتهما اعلیٰ من الکل لعدہ

اختلاف یسیر بینهما

امام بخاری پر دارقطنی وغیرہ نے بے شک اعتراضات کئے ہیں لیکن وہ اعتراضات صرف فضل و کمال کی نمائش کے لئے محض اصطلاحی اور نقلی (ٹکنیکل) ہیں واقعی نہیں ہیں اس لئے وہ اعتراضات علماء کے نزدیک ناقابل قبول ٹھہرے اور ابن حجر نے مقدمہ میں ان میں سے ایک ایک اعتراض کو رد کر دیا ہے (مضامین سید سلیمان ندوی حصہ اول)

پھر بھی اس نقد کا اثر بخاری پر ہوا کیونکہ وہ حدیثیں مقطوع الصحۃ نہ رہیں، صحیحین کی مسند حدیثوں سے علم یقینی نظری حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے لیکن اکثر علماء کا یہ مسلک ہے کہ یہ مقطوع بالصحۃ ہیں اس لئے اس سے علم یقینی نظری حاصل ہوتا ہے اور یہی قول راجح ہے مگر اس میں سے ان چند احادیث کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے جن پر بعض اہل النقد جیسے دارقطنی وغیرہ نے کلام کیا ہے کیونکہ جب جمہور نے تلقی بالقبول نہ کی تو مقطوع بالصحۃ ہوئی۔

ابن صلاح گفتہ علم یقینی نظری واقع است بانچہ مسند کردہ اند آں را ایں ہردو بزرگ (بخاری و مسلم) زیرا کہ ظن معصوم خطا نمی کند و سبقہ الی ذالک محمد بن طاہر المقدسی و ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الخالق بن یوسف و اختارہ ابن کثیر و حکاہ ابن تیمیہ عن اہل الحدیث والسلف والجماعۃ الکثیرۃ من الشافعیہ والحنابلۃ والاشاعرۃ والحنفیہ وغیرہم۔ نووی گفتہ محققین

ابن الصلاح نے کہا ہے کہ بخاری و مسلم میں جتنی مسند حدیثیں ہیں اس سے علم یقینی نظری حاصل ہوتا ہے اس لئے کہ معصوم (اجماع امت) سے غلطی ہو نہیں سکتی اور ان سے پہلے بھی محمد بن طاہر مقدسی اور ابو نصر عبد الرحیم اسی کے قائل تھے اور یہی ابن کثیر کا مختار ہے اور علامہ ابن تیمیہ نے اہل حدیث و سلف اور بہت سے شوافع حنابلہ اور احناف کا یہی مسلک نقل کیا ہے لیکن نووی نے کہا ہے کہ ابن الصلاح کا یہ اصول سے محققین اور اکثر علماء نے اختلاف کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ غیر متواتر حدیثوں سے ظن ہی

لہ فیض الباری ج ۱ ص ۵۵

وکثر علماء خلاف کردہ اند ابن الصلاح
را وگفتہ اند کہ افادہ می کند ظن را چیزے
کہ متواتر نشدہ است وحکایت کرد
ایں را زین الدین از محققین وگفت
نووی واستثنا کردہ است ابن الصلاح
حرفے چند را کہ تکلم کردند بر آں بعض
اہل نقد ہمچو دار قطنی[1]

وھی ما ادعاہ ابو عمرو بن الصلاح
وغیرہ من الاجماع علی تلقی ھذا
الکتاب بالقبول والتسلیم لصحۃ
جمیع ما فیہ وان ھذہ المواضع
متنازع فی صحتھا فلم یحصل لھا
من التلقی ما حصل لمعظم الکتاب
وقد تعرض لذلک ابن الصلاح
فی قولہ الا مواضع یسیرۃ انتقدھا
الدار قطنی وغیرہ وقال فی مقدمۃ
شرح مسلم لھما اخذ علیھما
یعنی علی البخاری ومسلم وقدح
فیہ معتمد فی الحفاظ ھو مستثنی
مما ذکرناہ لعدم الاجماع علی

حاصل ہوتا ہے اور اس قول کی نسبت محققین میں
سے زین الدین کی طرف کی ہے۔
لیکن نووی کا کہنا ہے کہ ابن صلاح نے ان
چند احادیث کو مستثنیٰ کر دیا ہے جس پر بعض اہل نقد
جیسے دار قطنی نے کلام کیا ہے۔

تمام حدیثوں کے صحیح ہونے کی بناء پر ابن صلاح نے
بخاری و مسلم کے تلقی بالقبول پر اجماع کا دعویٰ کیا
ہے لیکن بعض حدیثیں ایسی ہیں جن کی صحت میں
اختلاف ہے اس لئے ابن صلاح نے ان چند
احادیث کو جس پر دار قطنی اور ان جیسے کسی معتمد
حافظ نے کلام کیا ہے مستثنیٰ کیا ہے کیونکہ اس
کے تلقی بالقبول پر اجماع نہ ہو سکا انتہی اور یہ
استثناء بہت خوب ہے۔

---

[1] مسک الختام شرح بلوغ المرام

تلقیہ بالقبول انتہی وھو احتراز حسن [1]

ومن فوائدها القول بان ماانفرد به البخاری ومسلم مندرج فی قبیل ما یقطع بصحتہ لتلقی الامۃ کل واحد من کتابیھما بالقبول علی الوجہ الذی فصلنا من حالھما فیما سبق سوی احرف یسیرۃ تکلم علیھا بعض اھل النقد من الحفاظ کالدارقطنی وغیرہ وھی معروفۃ عند اھل ھذا الشان واللہ اعلم [2]	چونکہ امت نے دونوں کتابوں بخاری و مسلم کو قبول کیا ہے اس لئے وہ احادیث جو صرف بخاری یا صرف مسلم میں ہیں وہ بھی قطعی طور پر صحیح ہوں گی سوا ان چند احادیث کے جن پر دارقطنی اور ان جیسے دوسرے حفاظ نے کلام کیا ہے۔

بہر حال صحیح بخاری پر دارقطنی کے اعتراضات اور علامہ ابن حجر کا رد مقدمہ فتح الباری میں ملاحظہ کیا جائے یہاں بخوف طوالت اس کا خلاصہ بھی پیش نہیں کر سکتا۔

کتاب الالزامات والتتبع للدارقطنی نایاب تھی بعض اہل علم کو تو اسی میں تردد ہے کہ اس کتاب کا دنیا میں وجود ہے بھی یا نہیں؟ مکتبہ علم و حکمت بہار شریف میں اس کا ایک جدید الخط نسخہ ہے اور اس پر کام ہو رہا ہے۔

کتاب الضعفاء | علم حدیث کے شعبوں میں ایک نہایت اہم شعبہ ثقات و ضعفاء کی معرفت ہے کیونکہ صحیح و ضعیف حدیث کا امتیاز اسی علم پر منحصر ہے یوں تو جرح و تعدیل پر کلام کرنے والوں کی تعداد شمار سے باہر ہے ابن عدی م ۳۶۵ نے صحابہ سے لے کر اپنے زمانہ تک ایک جماعت

---

[1] مقدمہ فتح الباری [2] مقدمہ ابن صلاح

کا نام اپنی کتاب الکامل میں شمار کرایا ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فنی حیثیت سے اس پر سب سے پہلے کلام کرنے والے شعبۃ بن الحجاج العتکی ہیں پھر اس کے بعد جرح وتعدیل پر کتابیں تصنیف ہونے لگیں اور راویوں کے احوال مرتب ہونے لگے دوسری صدی ہجری میں جرح وتعدیل کے امام یحیٰی بن سعید القطان م ۱۹۸ اور عبدالرحمٰن بن مہدی م ۱۹۸ تھے ان دونوں کی جلالتِ شان کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جس راوی کے مجروح وثقہ ہونے پر دونوں متفق ہوں اس کا مجروح و ثقہ ہونا مسلم اور قطعی سمجھا جاتا اور اگر بالفرض کسی راوی کے متعلق ان دونوں کی رائے میں اختلاف ہو جاتا تو پھر دوسرے ذرائع سے کسی ایک کو ترجیح دی جاتی ہے[1] اس کے بعد یحیٰی بن معین م ۲۳۳ اور احمد بن حنبل م ۲۴۱ اور علی بن المدینی م ۲۳۴ اور ان کے تلامذہ ہیں یحیٰی بن معین نے تو اتنا اعتناء کیا کہ ان کے خلاف لوگوں کی زبانیں کھل گئیں اور ان کو مطعون کرنے لگے یہاں تک کہ بکر بن حماد شاعر مغربی نے یحیٰی بن معین اور علم حدیث پر تعریض کی کہتا ہے

اری الخیر فی الدنیا یقل کثیرہ	دنیا میں ہر قسم کے خیر میں کمی ہو رہی ہے لیکن حدیث
وینقص فصار الحدیث یزید	میں زیادتی ہو رہی ہے۔
فلو کان خیرا کان الخیر کلہ	اگر حدیث امور خیر میں سے ہے تو پھر ساری حدیث کو خبر ہونا چاہئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حدیث کا
ولکن شیطان الحدیث مرید	شیطان سرکش ہے۔
وان یک حقا فھی فی الحکم غیبۃ	اگر جرح و تعدیل حق ہے تو پھر غیبت کے حکم
وان یک زورا فالقصاص شھید	میں ہے اور اگر جھوٹ ہے تو آیت قصاص کافی ہے

حمیدی صاحب الجمع بین الصحیحین نے ایک طویل قصیدہ میں اس گستاخ شاعر کا جواب دیا ہے۔ فرماتے ہیں

[1] مفتاح السنۃ

اِنّی الی ابطال قولک قاصد	میں تمہاری باتوں کا رد کرنا چاہتا ہوں اور میرے
ولی من شہود النصوص جنود	پاس کافی دلائل ہیں۔
اذا لم یکن خیرا کلام نبینا	اگر تم ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو
لدیک فان الخیر منک بعید	خیر نہیں سمجھتے تو پھر خیر تم سے بہت دور ہے

آگے چل کر ابن معین کے حق میں کہتے ہیں۔

وما ھو الا واحد من جماعۃ	اور ابن معین تو اس جماعت کے ایسے فرد
فلھم فیما حکاہ شہود	ہیں کہ ان کا قول قوم کے لئے اسوہ ودلیل ہے

یحییٰ بن معین کے تلامذہ میں عباس بن محمد م ۲۷۱ اور ابو اسحاق ابراہیم الجنید الختلی م ۲۶۰ کی رجال پر کتابیں ہیں الاولی الذکر کے متعلق تو حافظ ذہبی کا خیال ہے مجلد کبیر نافع ینبئ عن بصرہ بھذا الشان[1] پھر اس فن پر مستقل تصانیف ہونے لگیں اور ارباب تصنیف کے موضوع کے خصوص وعموم کے لحاظ سے مختلف طریقے رہے کسی نے صرف ثقات یا ضعفاء یا مدلسین پر کتابیں لکھیں اور کسی نے ان تینوں صنفوں کو اپنی کتاب کا موضوع قرار دیا پھر بعض نے صرف کسی خاص کتاب کے رجال پر اور کسی نے عام رجال پر خامہ فرسائی کی اس سلسلہ میں چند کتابوں کے نام درج کرتا ہوں۔

وہ کتابیں جو جامع بین الثقات والضعفاء ہیں۔

طبقات ابن سعد البصری م ۲۳۰ اس میں صحابہ وتابعین اور ان کے بعد کے اسماء ہیں تمام تصانیف میں سب سے زیادہ اہم واعظم ہے علامہ سیوطی نے اس کا اختصار بھی کیا ہے
تاریخ بخاری م ۲۵۱ یہ تین تاریخیں ہیں کبیر۔ صغیر۔ اوسط۔ کبیر کی ترتیب حروف معجم پر ہے لیکن ابتداً میں سب سے پہلے محمد کو لیا ہے اوسط سنین پر ہے۔ تاریخ بخاری عجیب بھی ہے جسے کہا جاتا ہے کہ وہ اوسط ہے مگر مجھے اس کے تسلیم میں تردد ہے مسلمہ بن قاسم کی تاریخ کبیر پر ذیل ہے علی بن المدینی م ۲۳۴ کی تاریخ مسلم کی رواۃ الاعتبار اور نسائی کی التمییز اسی قبیل سے ہے

[1] تذکرہ

وہ کتابیں جن میں ضعفاء کا ذکر آتا ہے۔

کتاب الضعفاء للبخاری الضعفاء والمتروکین للنسائی ابو الفرج عبدالرحمن بن علی الجوزی م ۵۹۷ کی کتاب الضعفاء جو ضخیم ہے حافظ ذہبی نے اس پر ذیل لکھا ہے اور مختصر بھی کیا ہے حافظ مغلطائی م ۷۶۲ نے بھی جوزی کی کتاب الضعفاء پر ذیل لکھا ہے۔ عقیلی م ۳۲۲ کی کتاب الضعفاء الکبیر ہے جس کا شمار اصول اور امہات کتب میں ہے اس کتاب کو راقم الحروف نے دیکھا ہے[1]
اس فن کی دوسری اہم کتاب الکامل لابن عدی م ۳۶۵ ہے علماء کا خیال ہے کہ وھو اکمل الکتب فی ذلک واجلھا وعلیہ اعتماد الائمۃ[2] لیکن اس کتاب میں ہر اس شخص کو داخل کر دیا ہے جس پر کلام کیا گیا ہے اگرچہ فی نفسہٖ ثقہ ہو اور ذہبی نے اسی کی اتباع میزان الاعتدال میں کی ہے مگر حافظ ذہبی نے صحابہ اور ائمہ متبوعین کو نہیں لیا ہے ابن عدی کی الکامل پر ابن الرومیہ م ۶۳۷ نے ذیل لکھا ہے اور میزان الاعتدال پر علامہ عراقی نے ضخیم ذیل لکھا ہے دارقطنی سے ان کے شاگرد حمزۃ السہمی نے جب یہ کہا کہ ضعفاء پر تصنیف کیجئے تو دارقطنی نے کہا فیہ کفایۃ لا یزاد علیہ پھر نہ معلوم کیا اسباب پیش آئے کہ دارقطنی نے کتاب الضعفاء لکھی چونکہ ابن عدی کی کامل اور عقیلی کی کتاب الضعفاء الکبیر نظر سے گذر چکی تھی اس لئے ضرور اضافہ کیا ہوگا اور اپنے موضوع پر جامع ہوگی حافظ ذہبی کہتے ہیں قال الدارقطنی فی الضعفاء ہو (ای الباغندی م ۳۱۲) مدلس مخلط یسمع من بعض اصحابہ عن شیخہ ثم یسقط ذکرہ حینا وھو کثیر الخطاء[3] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفصل و مبین ہے اس وقت جتنی رجال پر کتابیں موجود ہیں تقریباً ہر ہر راوی پر جرحاً و تعدیلاً ان شاء اللہ تعالیٰ دارقطنی کا کلام ضرور ملے گا۔

امام ابوحنیفہ اور دارقطنی لیکن ان کی شخصیت مسلم ہونے کے باوجود بہتیرے مقامات میں ان کا قدم جادۂ حق سے ڈگمگا گیا ہے اور ایسی ایسی مسلم برگزیدہ ہستیوں کو اپنے ہدف جرح کا نشانہ بنایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے اور یہی دل چاہتا ہے کہ کاش آنکھیں ایسا نہ دیکھتیں حد یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ

---

[1] مفتاح السنۃ [2] شرح الفیہ [3] تذکرہ ۲۸۷

م ۱۵۰ھ جیسی ثقہ اور مقدس ہستی تک پر جرح کر ڈالی ہے اور ان کو ضعیف کہہ دیا ہے العجب العجب

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں　　تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

کتاب الضعفاء کا تو حال الگ رہا سنن میں اتنا زور لگایا ہے کہ معلوم ہوتا ہے پنجہ جھاڑ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ایک جگہ فرماتے ہیں

حدثنا علی بن عبد اللہ بن مبشر حدثنا محمد بن حرب الواسطی ثنا الاسحق الازرق عن ابی حنیفۃ عن موسی ابن ابی عائشہ عن عبد اللہ بن شداد عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ، لم یسندہ عن موسی بن ابی عائشہ غیر ابی حنیفہ والحسن بن عمارۃ وھما ضعیفان

(امام) ابو حنیفہ موسیٰ بن ابی عائشہ سے اور وہ عبد اللہ بن شداد سے وہ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مقتدی کے لئے امام کی قرأۃ کافی ہے۔

اس حدیث کو موسیٰ بن ابی عائشہ سے سوا (امام) ابو حنیفہ اور حسن بن عمارہ کے کسی اور نے مسند نہیں کیا ہے اور وہ دونوں ضعیف ہیں

[دوس]ری جگہ لکھتے ہیں۔

حدثنا الحسن بن سعید بن الحسن بن یوسف المروزی قال وجدت فی کتاب جدی ثنا [ابو] یوسف القاضی نا ابو حنیفۃ

. . . . ابو حنیفہ خالد بن علقمہ سے وہ عبد خیر سے وہ علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے وضو اس طرح کیا کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو تین بار دھویا۔ پھر کلی تین بار کی اور ناک میں پانی

عن خالد بن علقمة عن عبد خیر عن علی رضی اللہ عنہ انہ توضأ فغسل یدیہ ثلثا و مضمض واستنشق ثلثا و غسل وجہہ ثلثا و ذراعیہ ثلثا و مسح برأسہ ثلثا و غسل رجلیہ ثلثا ثم قال من احب ان ینظر الی وضوء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاملا فلینظر الی ھذا، و قال شعیب ھکذا رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توضأ ھکذا رواہ ابو حنیفۃ عن خالد بن علقمۃ قال فیہ و مسح رأسہ ثلثا و خالفہ جماعۃ من الحفاظ والثقات منھم زائدۃ ابن قدامۃ وسفیان الثوری و شعبۃ و ابو عوانۃ و شریک و ابو الاشھب جعفر بن الحارث و ھارون بن سعد و جعفر بن محمد و حجاج بن ارطاۃ و ابان بن تغلب وعلی بن صالح بن حی و حازم

تین بار ڈالا اس کے بعد اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو تین تین بار دھویا پھر اپنے سر کا مسح تین بار کیا۔ اور اپنے پاؤں کو تین بار دھویا۔ پھر فرمایا کہ جو چاہتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کامل کو دیکھے تو وہ ہمارے اس وضو کو دیکھے اور شعیب نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا اسی طرح (امام) ابو حنیفہ نے خالد بن علقمہ سے اس کو روایت کیا ہے جس میں کہا ہے کہ و مسح رأسہ ثلثا (یعنی اپنے سر کا مسح تین بار کیا)، لیکن حفاظ و ثقات کی ایک جماعت نے (امام) ابو حنیفہ کی اس روایت کی مخالفت کی ہے انھی حفاظ میں سے زائدہ بن قدامہ، ثوری، شعبہ، ابو عوانہ، شریک، جعفر بن الحارث، ہارون بن سعید جعفر ابن محمد، حجاج بن ارطاۃ، ابان بن تغلب، علی بن صالح، حازم بن ابراہیم، حسن بن صالح اور جعفر احمر ہیں ان میں سے ہر ایک نے خالد بن علقمہ سے روایت کرتے ہوئے و مسح رأسہ مرۃ (یعنی اپنے سر کا مسح ایک بار کیا) کہا ہے الا یہ کہ حجاج بن ارطاۃ نے عبد خیر راوی کی جگہ عمر کا نام لیا ہے مگر اس میں ان کو وہم ہوا۔ حالانکہ بجز ابو حنیفہ کے

بن ابراہیم وحسن بن صالح
وجعفر الاحمر وغیرہم عن خالد
بن علقمۃ فقالوا فیہ ومسح راسہ
مرۃ الا ان حجاجا من بینہم
جعل مکان عبد خیر عمرا ذا
امر وہم فیہ ولا نعلم احدا
منہم قال فی حدیثہ انہ مسح
راسہ ثلثا غیر ابی حنیفہ وفی
خلاف ابی حنیفہ فیما روی
لسائر من روی ہذا الحدیث
فقد خالف فی حکم المسح فیما
روی عن علی رض عن النبی صلی
اللہ علیہ وسلم فقال ان السنۃ
فی الوضوء مسح الراس مرۃ واحدۃ [۱]

کوئی ایک بھی ایسا راوی نہیں ہے جنہوں نے اپنی
حدیث میں مسح راسہ ثلثا کہا ہو مگر عجیب بات
ہے کہ اگرچہ ابو حنیفہ نے تمام راویوں کے خلاف
روایت کی ہے لیکن اس کے باوجود خود اپنی روایت
کردہ حدیث کے خلاف مسح علی الراس بالمرۃ
ہی کی نسبت کے قائل ہیں۔

خیر دار قطنی نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر جو کچھ جرح کی ہے اس کا جواب تو شرح ہدایہ للعینی بحث قرأۃ خلف الامام وغیرہ میں ملاحظہ کیجئے مگر یہاں ایک اصولی چیز پیش کی جاتی ہے گرچہ وہ طویل ہے مگر تمام وکمال نقل کرنے پر میں مجبور ہوں ع وللناس فیما یعشقون مذاہب

(باقی آئندہ)

---

[۱] سنن دار قطنی

مغرب پر مسلمانوں کے احسان

(پروفیسر فلپ، کے، حتی کی کتاب "دی عربس" کے ایک باب کا ترجمہ)

(مترجمہ پروفیسر مبارز الدین صاحب رفعت، لکچرر عثمانیہ کالج اورنگ آباد)

مسلم اسپین کے ایک کالج کے باب الداخلہ پر جو کتبہ نصب ہے، اس میں یہ مقبول مقولہ درج ہے "دنیا کا مدار چار چیزوں پر ہے۔ عالموں کا علم، اکابر کا عدل، عابدوں کا تقویٰ اور جوانمردوں کی شجاعت"،

یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ اس یورپی تحریر میں اسلامی تصورات پیش کئے گئے ہیں ان میں علم و دانش ہی کو پہلا مقام دیا گیا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی فوجوں نے مغربی دنیا پر اپنی مردانگی کا نہایت گہرا نقش بٹھایا تھا لیکن یہ نقش دیرپا ثابت نہیں ہوا اگرچہ عربوں کا دین یورپی تخیل کو پوری طرح مسخر نہ کر سکا، اور عربوں کا تصورِ عدل یہاں کم ہی کامیاب رہا، لیکن اسلامی علم و ادب نے مغربی تفکر میں مختلف نقاط سے راہ پائی۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ کے ذہنی ارتقا کی تاریخ میں مسلم اسپین نے ایک نہایت ہی درخشاں باب کا اضافہ کیا ہے اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط اور تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز کے درمیانی زمانے میں عربی بولنے والے ہی ساری دنیا میں تہذیب و تمدن کے مشعل بردار بنے ہوئے تھے۔ عربی زبان ہی وہ واسطہ تھی جس کے ذریعہ قدیم سائنس اور فلسفہ کی بازیافت ہوئی ان میں اضافے ہوئے، ان کی اشاعت ہوئی اور ان سے مغربی یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا۔ مسلم اسپین کا سب سے زبردست اور جید عالم اور بدیع مفکر علی ابن حزم گذرا ہے یہ ۹۹۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۰۶۴ء میں فوت ہوا۔ علی ابن حزم کا شمار ایسے دو تین اسلامی مفکروں

میں ہوتا ہے جن کا ذہن نہایت شاداب اور جن کی تصانیف بے شمار ہیں۔ سوانح نگاروں نے تاریخ، فقہ، حدیث، منطق، شاعری اور متعلقہ موضوعات کی کوئی چار سو کتابیں اس سے منسوب کی ہیں اس کی باقی ماندہ تصانیف میں سب سے گراں قدر تصنیف وہ ہے جس نے ابن حزم کو تقابلی دین کے پہلے عالم ہونے کا اعزاز بخشا ہے اس کتاب میں ابن حزم نے توریت اور انجیل کی داستانوں کے الجھاوے دکھلائے ہیں اور یہ الجھاوے ایسے تھے کہ سولہویں صدی میں معنوی تنقید کے پیدا ہونے تک کسی اور کا ذہن ان کی طرف منتقل نہ ہو سکا تھا۔

سترھویں صدی کے دوران میں مغربی یورپ کی نثر میں جو فرضی قصے کہانیاں اور اخلاقی تمثیلیں رائج رہیں ان میں اور ابتدائی عربی قصوں میں بڑی واضح مشابہتیں پائی جاتی ہیں اور یہ عربی قصے خود بھی ہندو ایرانی قصوں سے لئے گئے تھے۔ کلیلہ ودمنہ کے پرلطف قصوں کا ترجمہ قشتالیہ اور لیون کے بادشاہ الفانسو دانا (۱۲۵۲ء۔ ۱۲۸۴ء) کے لئے اسپینی زبان میں کیا گیا تھا۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایک نو نصرانی یہودی نے ان قصوں کو لاطینی زبان میں منتقل کیا تھا ان قصوں کا فارسی سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس ترجمہ سے لافانٹین نے استفادہ کیا ہے جس کا خود اس شاعر نے اعتراف کیا ہے "مقامہ" مسجع و مقفیٰ نثر میں لکھا جاتا ہے اس میں ہر قسم کی لسانی ندرتوں سے کام لیا جاتا ہے اس سے مقصود ایک سورما سوار کی مہموں کی داستان کے ذریعہ اخلاقی سبق دینا ہوتا ہے۔ اسپینی زبان کے ایسے ناول جن میں ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کے کردار پیش کئے گئے ہیں ان میں اور مقامہ میں قریبی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یورپی ادب پر عربی زبان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اپنی طرز و انشا کا جو اثر ڈالا ہے اسی کی بدولت مغربی تخیل کو سخت ترین ذہنی بندشوں سے رہائی نصیب ہوئی جن میں وہ روایات کے ہاتھوں گرفتار تھا اسپینی ادب کے ملی مزاج میں عربی نمونوں کی جھلک صاف نظر آتی ہے چنانچہ سروانٹس کی کتاب ڈان کویک زاٹ کی ظرافت اور مذاق میں بھی یہی رنگ دکھائی دیتا ہے اس کتاب کا مصنف ایک بار الجیریا میں گرفتار ہو گیا تھا اور

اس نے از راہ مزاح یہ مشہور کر دیا تھا کہ اس کتاب کی اصل عربی زبان میں لکھی گئی ہے۔

عربی زبان جہاں کہیں اور جب کبھی استعمال کی گئی وہاں شعر گوئی کا مذاق بڑے زور شور کے ساتھ فروغ پاتا رہا ہے گنتی اشعار ایک سے دوسرے تک زبانی منتقل ہوتے اور اعلیٰ ادنیٰ ہر ایک سے داد و تحسین حاصل کرتے تھے الفاظ کے حسن و ترنم سے محظوظ ہونا عربی بولنے والی قوموں کی خاص خصوصیت ہے اور اس خصوصیت نے اسپین میں بھی اپنے جلوے دکھائے ہیں۔ اندلس کا پہلا اموی حکمراں اور اس کے بہت سے جانشین شاعر تھے اکثر حکمرانوں نے اپنے اپنے درباروں میں ملک الشعرا مقرر کر رکھے تھے۔ انھیں وہ سیر و سیاحت اور رزم و بزم میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اشبیلیہ کو اس پر فخر تھا کہ یہاں کے اعلیٰ درجے کے شاعروں کی گنتی دوسرے تمام شہروں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ تھی ایک عرصہ سے قرطبہ میں بھی مذاق شعر کی شمع روشن ہو چکی تھی بعد میں یہی شمع غرناطہ میں اس وقت تک ضیا پاشی کرتی رہی جب تک کہ یہ شہر اسلام کی پناہ گاہ بنا رہا۔

ابن زیدون (۱۰۰۳ء سے ۱۰۷۱ء) ایک اور بڑا اور مشہور شاعر ہوا ہے۔ اس کا تعلق ایک عرب گھرانے سے تھا ابتدا میں یہ قرطبہ کی چند سری (Oligarchy) حکومت کے عہدہ کا معتمد تھا اس کے بعد غالباً خلیفہ مستکفی کی شاعرہ بیٹی الولّادہ سے بے محابا عاشقی کی پاداش میں اپنے عہدے سے معزول کیا گیا۔ پھر کئی سال تک قید اور جلا وطنی کے بعد وزیر اعظم کے بلند مرتبہ کے دوسرے عہدے پر فائز ہوا، اور ذو الوزارتین، یعنی وزیر سیف اور وزیر قلم کے خطاب سے بھی سرفراز ہوا۔ حسین و جمیل اور فاضل الولّادہ نے ۱۰۹۱ء میں وفات پائی۔ اس کے ذاتی حسن و جمال اور ادبی قابلیت کی بڑی شہرت تھی، اس طرح وہ گویا اسپین کی سیفو تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسپین کی عرب عورتوں میں ادب اور شاعری کا خاص ذوق اور خاص فطری میلان پایا جاتا تھا۔

اسپین کی عربی شاعری نے قدیم بیانی جکڑ بندیوں سے ایک حد تک آزاد ہو کر نئی بحریں اور

نئی طرزیں ایجاد کیں اور حسنِ فطرت کا تقریباً ویسا ہی ادراک حاصل کیا جو جدید شاعری میں پایا جاتا ہے یہ شاعری اپنی چھوٹی چھوٹی رزمیہ نظموں اور عشقیہ غزلوں کے ذریعہ ان روحانی احساسات کا اظہار کرنے لگی جن میں قرونِ وسطیٰ کے سپاہیانہ نظام کے جلوے پنہاں تھے نغمہ وموسیقی نے ہر جگہ شاعری کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑا اور اسے استوار رکھا ہے

عام طور پر عربی شاعری اور خاص کر اس کی وہ صنف جو غزل کہلاتی ہے دیسی نصرانیوں کو بہت بھا گئی تھی جن عوامل نے نصرانیوں کو عربی ادب کو اپنانے پر ابھارا ان میں سب سے زیادہ طاقت ور عامل یہی غزل کی شاعری تھی عربی تغزلی شاعری کی دو طرزوں کو قشتالیہ کی مقبول عام طرز villancico کی صورت میں فروغ حاصل ہوا یہ طرز نصرانی گیتوں اور میلادِ مسیح کی نظموں میں بہت زیادہ استعمال کی جاتی تھی۔

آٹھویں صدی ہی میں اسپینی زبان میں افلاطونی محبت کی جو باقاعدہ تحریک شروع ہوئی تھی اس پر عربی شاعری کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ گیارہویں صدی کے آخر میں جنوبی فرانس کے اولین پرادنسی (Provencal) شعرا عشق ومحبت کی شعلہ سامانیوں کو عجیب وغریب پُر بہار تخیل کے سانچوں میں ڈھالتے بڑے زور شور کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے غزل گو شاعر جنہیں بارہویں صدی میں فروغ حاصل ہوا تھا اپنے "جنوبی" غزل سرا" (Zajal Singer) معاصروں ہی کے پیرو تھے۔ عربی مثالوں کو ہی اپنے سامنے رکھ کر جنوبی یورپ میں 'مسلک ظرافت' (Cult of Dame) یک بیک نمودار ہوا۔ ابتدائی یورپی ادب کی سب سے بڑی یادگار 'چان سن ڈی رولینڈ' (Chanson de Roland.) ہے جو ۱۰۸۰ء میں لکھی گئی۔ جس طرح ہومر کی نظموں سے تاریخ یونان کے آغاز کا پتہ چلتا ہے، بالکل اسی طرح چان سن ڈی رولینڈ سے بھی ایک نئے تمدن یعنی مغربی یورپ کے تمدن کے آغاز کے آثار وعلامات کا سراغ ملتا ہے یہ کتاب اپنی تخلیق کے لحاظ سے ایک ایسے فوجی ربط کی رہین منت ہے جو اہل یورپ نے اس زمانہ میں اسلامی

اسپین سے قایم کیا تھا۔

جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، اسپین میں ابتدائی تعلیم بہت عام تھی اور تمام اسلامی ملکوں کی طرح اس کی بنیاد قرآن پڑھنے اور عربی صرف و نحو اور شاعری کے مطالعہ پر رکھی گئی تھی۔ علمی دنیا میں عورتوں کے مراتب ثابت کرتے ہیں کہ اندلس میں ان مقولوں پر کم ہی عمل کیا جاتا تھا جن میں عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی ممانعت آئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی اساس دینیات، صرف و نحو، شاعری، لغت، تاریخ اور جغرافیہ تھی۔ کئی بڑے بڑے شہروں میں ایسی درسگاہیں تھیں جنہیں جامعات کہا جا سکتا ہے ان میں قرطبہ، اشبیلیہ، مالقہ اور غرناطہ کی جامعات بہت ہی بلند پایہ تھیں جامعہ قرطبہ میں فقہ اور قانون کے سوا ہیئت، ریاضیات اور طب کے شعبے بھی قایم کئے گئے تھے۔ اس جامعہ میں ہزاروں طالب علم شریک ہوتے تھے اور یہاں کی سندیں ملک کے سب سے زیادہ بیش قرار عہدوں کی ضامن سمجھی جاتی تھیں۔ جامعہ قرطبہ کا نصاب تعلیم فقہ، اصول قانون، طب، کیمیا، فلسفہ اور ہیئت کے مضامین پر حاوی تھا۔ قشتالیہ اور دوسرے ملکوں کے طالب علم اس ادارہ کے بڑے دلدادہ تھے۔

جامعات کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کو بھی فروغ حاصل ہوتا گیا۔ قرطبہ کا شاہی کتب خانہ وسعت کے لحاظ سے بہت بڑا اور علمی ذخیرے کے اعتبار سے سب سے بہتر کتب خانہ تھا۔ بہت سے لوگوں کے پاس جن میں کچھ عورتیں بھی شامل ہیں اپنے خانگی کتب خانے بھی ہوتے تھے۔ سیاسی مجلسیں اور ناٹک گھر یونان اور روما کی زندگی کی نمایاں خصوصیات تھیں اسلامی زندگی میں ان چیزوں کو کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا۔ اس لئے اسلامی زندگی نے کتابوں ہی کو حصول علم کا تنہا ذریعہ بنا دیا تھا۔

جیسا کہ ہم بغداد کی سیر میں دیکھ چکے ہیں، وہاں کاغذ کی صنعت کافی فروغ پا چکی تھی اسلام نے یورپ پر جو بڑے بڑے احسان کئے ہیں ان میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے یورپ کو کاغذ سازی کے فن سے آشنا کرایا۔ اندلس میں بھی مقامی طور

پر کاغذ تیار کیا جاتا تھا اور اسی کی بدولت یہاں بڑی تعداد میں کتابیں جمع ہوگئی تھیں۔ ورنہ کاغذ کی صنعت کے بغیر یہ کبھی ممکن نہ ہوتا۔ مراکش نے کاغذ کی صنعت مشرق سے سیکھی اور بارہویں صدی کے وسط میں یہ صنعت مراکش سے اسپین منتقل ہوئی۔ انگریزی زبان میں اس تاریخی حقیقت کی ایک لسانی شہادت "ریم" (Ream) کی صورت میں اب بھی موجود ہے۔ یہ لفظ قدیم فرانسیسی لفظ Rayme سے لیا گیا ہے فرانسیسی زبان نے یہ لفظ اسپینی زبان کے لفظ Rasma سے حاصل کیا ہے اور خود اسپینی زبان نے یہ لفظ عربی لفظ "رزمہ" سے مستعار لیا ہے۔ اس لفظ کے معنی عربی میں گٹھری کے ہیں۔ اسپین کے بعد کاغذ سازی کی صنعت سنہ ۱۲۷۰ء کے قریب اسلامی اثر کے نتیجہ کے طور پر غالباً صقلیہ سے اطالیہ آئی۔ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ فرانس میں کاغذ سازی کے کارخانے پہلے پہل نصرانی مجاہدوں کے ذریعہ قایم ہوئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اسپین کا عطیہ ہے۔ ان دونوں ملکوں سے کاغذ سازی کی صنعت پورے یورپ میں پھیل گئی۔ عبدالرحمٰن کا ایک معتمد اپنے گھر پر سرکاری مراسلے لکھ کر ایک خاص دفتر "طبع" —— چھپائی کی اولین صورت —— کرنے کے لئے بھیج دیا کرتا تھا اور اس کے بعد یہاں سے حکومت کے مختلف نمائندوں کے نام اس کے نسخے جاری ہوتے تھے۔

اسپین کی اسلامی سلطنت کی بربادی کے بعد فلپ ثانی (۱۵۵۶ء — ۱۵۹۸ء) اور اس کے جانشینوں نے بچی باقی ماندہ کتابیں عربی کتب خانوں سے فراہم کیں ان کی تعداد کم و بیش دو ہزار تھی یہی کتابیں کتب خانۂ اسکوریال کی بنیاد بنیں۔ یہ کتب خانہ شہر میڈریڈ سے کچھ دور اب بھی موجود ہے۔ ان کتابوں کے سوا اور دوسری کتابوں کی فراہمی کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ سترھویں صدی کی ابتداء میں مراکش کا ایک سلطان شریف زیدان اپنے مال و متاع کے ساتھ کہیں فرار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا کتب خانہ بھی ایک جہاز پر بار کرا دیا۔ لیکن اس جہاز کے کپتان کو پوری اجرت پیشگی نہیں ملی تھی۔ اس لئے اس نے

ان کتابوں کو اپنی منزل مقصود پر اتارنے سے انکار کردیا اور مارسلیز جاتے ہوئے راستے میں یہ بحری قزاقوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ ان کتابوں کی تعداد کم و بیش تین چار ہزار تھی۔ فلپ سوم کے حکم پر اس مال غنیمت کو اسکوریال کے کتب خانہ میں محفوظ کردیا گیا اور اس کی بدولت یہ کتب خانہ عربی زبان کے قلمی نسخوں کا ایک بیش بہا خزانہ بن گیا۔

مغربی مسلمانوں نے ادب اور تاریخ کے میدان میں جو کمال دکھائے ہیں ان میں بنی نصر کے دربار کے دو عہدہ دار دوستوں یعنی ابن الخطیب اور ابن خلدون کا مرتبہ بہت ہی بلند ہے لسان الدین بن الخطیب (۱۳۱۳ء — ۱۳۷۴ء) شام کے ایک عرب خاندان میں پیدا ہوا اس کا خاندان شام سے ہجرت کرکے اندلس میں آباد ہو گیا تھا غرناطہ کے بنی نصر کے ساتویں سلطان یوسف بن الحجاج اور اس کے بیٹے محمد پنجم نے اسے 'ذوالریاستین' کا خطاب دیا تھا۔ سنہ ۱۳۷۱ء میں یہ ایک درباری سازش سے جان بچا کر بھاگا اور اس کے تین سال بعد فاس کے مقام پر ایک خانگی جھگڑے میں مارا گیا۔ اس کی موت سے پورے عرب اسپین کا نہ سہی۔ لیکن غرناطہ کا آخری مشہور و معروف مصنف، شاعر اور سیاس دنیا سے اٹھ گیا۔ ابن خطیب نے شاعری، تاریخ، جغرافیہ، طب اور فلسفہ پر ساٹھ کتابیں لکھی ہیں ان ساٹھ کتابوں میں سے اس وقت ایک تہائی کتابیں محفوظ رہ گئی ہیں۔ اس کی جو کتابیں زمانے کی دست برد سے بچ رہی ہیں، ان میں سے ہمارے لئے سب سے اہم غرناطہ کی تفصیلی تاریخ ہے۔

عبدالرحمٰن بن خلدون (۱۳۳۲ء — ۱۴۰۶ء) تونس کے ایک اندلسی خاندان میں پیدا ہوا۔ یہ خاندان اپنا سلسلۂ نسب قبیلۂ کندہ سے ملاتا تھا۔ اس خاندان کا بانی نویں صدی میں یمن سے اندلس میں ہجرت کر آیا تھا اس خاندان کے لوگ تیرھویں صدی تک بھی اشبیلیہ میں باقی تھے۔ اپنی خدمت سے معزول ہونے سے پہلے وہ فاس میں کئی بڑی خدمتوں پر فائز رہا ۱۳۶۲ء میں اس نے غرناطہ کے سلطان محمد سادس کی خدمت اختیار کر لی۔ اس سلطان نے ابن خلدون سے کئی اہم سیاسی کام لئے۔ اس کے بعد وہ اپنے طاقت ور دوست

ابن الخطیب کے حسد کا شکار ہوا، اور اندلس چھوڑ کر المغرب چلا آیا اور یہاں تصنیف وتالیف میں مشغول ہو گیا۔ ابن خلدون کو اپنے مقدمہ (تاریخ) کی بنا پر بڑی شہرت حاصل ہوئی ہے اس میں ابن خلدون نے پہلی بار تاریخ کے ارتقار کا نظریہ دنیا کے آگے پیش کیا ہے۔ اس نظریے میں اخلاقی اور روحانی قوتوں کے سوا آب وہوا اور جغرافیہ کے طبعی حقائق بھی پورے وقوف وآگہی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ قومی عروج وزوال کے قوانین کی دریافت اوران کی تدوین کی سب سے پہلی کوشش ابن خلدون ہی نے کی ہے۔ اس لئے ابن خلدون کو ـــــ جیسا کہ خود اس نے دعویٰ کیا ہے فن تاریخ کی ماہیت اور اس کی وسعت کا انکشاف کرنے والا یا کم سے کم عمرانی علوم کا حقیقی بانی کہا جا سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ابن خلدون سے پہلے تاریخ پر مجموعی حیثیت سے ایسی وسیع اور فلسفیانہ نظر ـــــ یورپ والوں کا ذکر ہی کیا ـــــ کسی عرب مصنف نے بھی نہیں ڈالی تھی۔ ابن خلدون نے سنہ ۱۴۰۶ء میں وفات پائی۔ دنیا نے اس کے کارنامہ پر جتنی تنقیدیں اور تبصرے کئے ہیں، ان سب میں اتفاق اسی بات پر کیا گیا ہے کہ وہ اسلام کا عظیم ترین اور دنیا کا ایک زبردست مفکر تاریخ گذرا ہے۔

عربوں کی جغرافیائی تحقیقات کا اثر مغرب پر کم پڑا ہے تاہم یہ واقعہ ہے کہ زمین کے گول ہونے کے قدیم نظریے کو عربوں ہی نے ہمیشہ زندہ رکھا ہے۔ ہم اس سے پہلے ہندوؤں کے اس تصور کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ زمین کے نصف معلوم کرہ کا ایک مرکز ہے جو چاروں سمتوں سے مساوی فاصلہ پر واقع ہے اس کو آرین (Arin) کہتے ہیں اس آرینی نظریہ کو ایک لاطینی تصنیف میں جگہ مل گئی جو سنہ ۱۴۱۰ء میں شائع ہوئی۔ اس تصنیف سے کولمبس نے وہ نظریہ اخذ کیا جس کی رو سے اسے یقین ہو چلا تھا کہ زمین کی شکل ناسپاتی جیسی ہے اور مغربی نصف کرہ میں آرین کے مقابل ویسا ہی ایک اونچا مرکز واقع ہے۔

مسلمانوں نے ہیئتی جغرافیہ اور ریاضیات کے جدید تصورات سے مغربی علوم کے

دامن بھرے ہوئے تھے اسپین میں ہیئت کا باقاعدہ مطالعہ دسویں صدی کے بعد سے شروع ہوا تھا۔ قرطبہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ کے مسلمان حکمرانوں کو اس سے بڑی گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اندلس کے اکثر ہیئت داں ستاروں کے اثرات کے قائل تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا میں پیدائش سے لے کر موت تک جو واقعات پیش آتے ہیں ان میں سے اکثر واقعات ستاروں ہی کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں' ستاروں کے اثرات کا مطالعہ یعنی علم نجوم کی تحصیل کے شوق کی بدولت دنیا کے تمام مقامات کے محلِ وقوع اور ان کے طولِ بلد اور عرضِ بلد متعین کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس طرح علم نجوم ہیئت کا سرچشمہ بن گیا لاطینی مغرب میں مشرقی ہیئت اور نجوم کا شوق اسپین ہی کے ذریعہ پھیلا۔ اسپین ہی میں مسلمانوں کی اہم ترین ہیئتی تصانیف کے لاطینی ترجمے ہوئے اور تیرھویں صدی میں الفانسو دہم نے جو الفانسوی جدولیں' تالیف کی تھیں، وہ اسلامی ہیئت کی ایک ارتقائی شکل کے سوا اور کچھ نہ تھیں۔ عرب مصنفوں نے ستاروں سے متعلق جو تحقیق کی تھی اس کے ذریعہ انھوں نے کروی اور مستوی مثلث کے ابتدائی ابواب دئے۔ کیونکہ الجبرا اور تحریری علم ہندسہ کی طرح علم مثلث کی بنیاد بھی بڑی حد تک عربوں ہی نے ڈالی ہے جو کوئی بھی اجرام فلکی کے کسی معمولی نقشہ پر نظر ڈالے تو یہ بات اس پر روشن ہو جائے گی کہ عرب ہیئت دانوں نے آسمان پر بھی اپنی محنت کے لازوال ارتسامات چھوڑے ہیں۔ یورپی زبانوں میں نہ صرف ستاروں کے نام ہی عربی الاصل ہیں —— جیسے AC rab عقرب، Algedi الجدی، Altair الطائر Daneb ذنب، Pherkad فرقد وغیرہ —— بلکہ ان زبانوں میں بے شمار فنی اصطلاحیں بھی ایسی ملیں گی جو عربی الفاظ سے لی گئی ہیں۔ جیسے Azimuth السموت، Nadir النظیر، Zenith السمت وغیرہ۔ یہ اصطلاحیں علم و حکمت کے اس بے بہا اسلامی ترکے کا بین ثبوت ہیں جس سے نصرانی یورپ مستفید ہوا ہے

عربی زبان سے ریاضیات کی جتنی بھی اصطلاحیں مستعار لی گئی ہیں ان میں ایک نہایت

دلچسپ اصطلاح "صفر" ہے اگرچہ عربوں نے "صفر" ایجاد نہیں کیا، لیکن عربوں ہی نے یورپ کو عربی اعداد کے ساتھ ساتھ "صفر" سے بھی روشناس کرایا۔ اور اہل مغرب کو اس مفید ترین حسابی طریقہ کے استعمال کا ڈھنگ سکھا کر روزمرہ کی زندگی میں عملی حساب کی سہولتیں مہیا کیں۔ اگر حساب میں "صفر" کا استعمال نہ ہوتا تو ہمیں اپنے اعداد کے جوڑنے کے لئے اکائیوں دہائیوں اور سینکڑوں وغیرہ کے خانوں کا ایک جدول تیار کرنا یا گنتارا استعمال کرنا پڑتا۔

غیر مسلم یورپ میں عربی اعداد کی نشر و اشاعت کی رفتار بہت ہی سست رہی گیارہویں اور بارہویں صدی میں تمام تر اور ایک حد تک تیرھویں صدی میں بھی نصرانی یا تو قدیم رومی اعداد اور گنتارے سے استعمال کرتے رہے یا جدید عربی اعشاری نظام کو اپنے پرانے نظام سے ملا کر اس سے کام لیتے رہے عملی مقاصد میں نئے رموز سے پہلے اطالیہ میں استعمال کئے گئے، پیسا کے لیونارڈو فیبانکی نے ۱۲۰۲ء میں ایک کتاب شائع کی جو عربی اعداد کی ترویج و اشاعت میں بڑی عہد آفریں ثابت ہوئی۔ اس شخص نے ایک مسلمان استاد کی شاگردی کی تھی اور شمالی افریقہ کی سیاحت کر چکا تھا۔ اس کی لکھی ہوئی کتاب نہ صرف عہد آفریں ثابت ہوئی بلکہ اسی کتاب سے یورپی ریاضیات کا آغاز ہوتا ہے اگر پرانے اعداد ہی استعمال ہوتے رہتے تو علم حساب نے اب جو اپنی بعض شاخوں میں ترقی کی ہے وہ ہرگز ممکن نہ ہوتی۔ ہم اس وقت اپنے علم حساب کو جس ترقی یافتہ صورت میں دیکھ رہے ہیں وہ تمام تر عربی اعداد اور "صفر" ہی کا کرشمہ ہے۔

مغربی مسلمانوں نے ہیئت اور ریاضیات کی طرح مطالعۂ قدرت کے میدان میں خاص کر خالص اور اطلاقی نباتیات کی تحقیقات سے دنیا کے علم میں بڑا اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے کھجور اور حشیش جیسے درختوں اور پودوں کے صنفی اختلافات کے نہایت صحیح مشاہدے کئے۔ انھوں نے پودوں کی تقسیم گروہوں میں کی پہلا گروہ ان پودوں کا قرار دیا جو قلم لگانے سے اُگتے ہیں۔ دوسرا گروہ ایسے پودوں کا مانا جو بیج سے اُگتے ہیں اور تیسرے گروہ میں ایسے پودے شامل کئے جنھیں وہ خودرو سمجھتے تھے اشبیلیہ کے ابن العوام نے بارھویں صدی کے آخر میں زراعت

پر ایک رسالہ لکھا تھا یہ رسالہ اپنے موضوع پر نہ صرف اہم ترین اسلامی رسالہ مانا جاتا ہے بلکہ سارے قرون وسطیٰ میں اس موضوع پر جتنی بھی کتابیں منظر عام پر آئیں ان سب میں اس رسالہ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ابن العوام نے اس رسالہ کی تیاری میں کچھ تو قدیم یونانی اور عربی ماخذوں سے خوشہ چینی کی ہے اور کچھ اسپین کے کاشتکاروں کے عملی تجربوں سے استفادہ کیا ہے اس رسالہ میں پانچ سو پچاسی درختوں اور پچاس سے زیادہ پھلوں کی کاشت کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اس میں قلم لگانے کے نئے مشاہدے بھی پیش کئے گئے ہیں اور زمین اور کھاد کے خواص بیان کئے گئے ہیں ان کے سوا درختوں اور انگور کی بیلوں کے امراض کی علامتیں اور ان کے علاج کے طریقے بھی بتلائے گئے ہیں۔

اسپین بلکہ حقیقت میں اسلامی دنیا کا مشہور ترین عطار اور ماہر نباتیات عبداللہ ابن احمد ابن البیطار گذرا ہے اس نے سنہ ۱۲۴۸ء میں بمقام دمشق وفات پائی، عبداللہ بن البیطار نے "آسان علاجوں" پر ایک رسالہ یادگار چھوڑا ہے۔ یہ رسالہ قرون وسطیٰ کے تمام رسالوں میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

عام طور پر اسپین کے عرب طبیب پیشہ ور طبیب تھے انھوں نے طب کا پیشہ اپنی طبعی صلاحیتوں کی بنا پر اختیار کیا تھا۔ ابن الخطیب کو ہم ادیب اور مورخ کی حیثیت سے پیش کر چکے ہیں۔ اس کے پاس اور دوسرے بہت سے طبیبوں کی طرح ایک قلمدان وزارت بھی تھا چودھویں صدی کے وسط میں یورپ "کالی بلا" یعنی طاعون کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہا تھا اور ملت مسیح کو اس عقیدہ نے بالکل ہی لاچار اور بے دست و پا بنا رکھا تھا کہ یہ دبا قضائے الٰہی ہے جس کو کسی طرح رد کا نہیں جا سکتا۔ لیکن غرناطہ کے اسی مسلمان طبیب ہی نے اس زمانے میں تعدیہ کی تائید میں ایک رسالہ لکھا۔ اس رسالہ میں حقیقی سائنٹفک تحقیقات کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔

"جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم تعدیہ کے امکان کو نہیں مان سکتے کیونکہ یہ احکام الٰہی کے خلاف ہے، ان لوگوں کو ہمارا یہ جواب ہے کہ تعدیہ کا وجود تجربات، تحقیقات، فہم و ادراک کی شہادت اور قابل اعتماد

بلاشت سے ثابت ہے یہ تمام حقائق زبردست دلیلیں ہیں۔ تعدیہ کی صداقت ہر تحقیق کرنے والے پر پوری طرح ثابت ہو سکتی ہے جب کہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو کسی متعدی مرض میں مبتلا مریض کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور رہتا سہتا ہے اکثر اسی مرض میں خود بھی مبتلا ہو جاتا ہے لیکن ایک ایسا شخص جو متعدی مرض میں مبتلا مریض سے دور رہتا ہے اس مرض سے بالکل محفوظ رہتا ہے، تحقیق کرنے والا یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ متعدی مرض کے جراثیم مریض کے کپڑوں، اس کے کھانے پینے کے برتنوں حتیٰ کہ کان کے بندوں کے ذریعہ سے بھی دوسرے آدمیوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔"

اسلامی فتح اسپین کی ابتدائی دو صدیوں میں مشرقی ثقافت کا دریا اندلس کی سرزمین میں کافی چڑھاؤ کے ساتھ بہتا رہا۔ اسپین کے عالم طلب علم میں مصر، شام، عراق یہاں تک کہ ماوراء النہر اور چین تک کا سفر کیا کرتے تھے لیکن گیارہویں صدی اور اس کے بعد کے زمانوں میں دریا کا رخ بالکل پلٹ گیا اور بارہویں صدی میں یہ پورے چڑھاؤ کے ساتھ یورپ کی طرف بہنے لگا۔ شمالی افریقہ اور اسپین نے اور خاص کر شہر طلیطلہ (جہاں کریمونا کے جیرارڈ اور مائیکل اسکاٹ نے کام کیا تھا) نے عربی طب کو یورپ منتقل کرنے میں نہایت اہم حصہ لیا ہے اسی کی بدولت طب کی تینوں روایتوں یعنی یہودی، نصرانی اور اسلامی روایتوں کو ترجمہ کی صورت میں یکجا ہونے کا موقع ملا، ترجمے کے اس روپ میں روایتیں آسانی کے ساتھ ایک دوسرے میں گھل مل گئیں ان ترجموں کے سوا ایسے ہی دوسرے ترجموں کے ذریعہ سے بھی عربی زبان کی بہت سی فنی اصطلاحیں یورپی زبانوں میں رائج ہو گئیں۔ مثلاً Julep عربی لفظ جلاب جو فارسی لفظ گلاب کا معرب ہے اور اس کے معنی عرق گلاب کے ہیں، کی اصطلاح ایک خوشبودار طبی مشروب کے لئے استعمال کی جاتی ہے طبی ضابطے کے مطابق شکر کو پانی میں حل کرکے اس میں کوئی دوا ملا دی جاتی ہے اور اس محلول کو Syrup کہتے ہیں جو عربی لفظ شراب سے لیا گیا ہے۔ قرون وسطیٰ کی لاطینی زبان میں سوڈا (Soda) کے معنی دردسر اور سوڈانیم (Sodanum) کے معنی دردسر کے علاج کے تھے۔ حقیقت میں یہ عربی لفظ صداع ہے

جس کے معنی شدید درد سر کے ہیں۔ عربی تصانیف کی بے شمار کیمیائی اصطلاحیں لاطینی زبان کے ذریعہ یورپی زبانوں میں پھیل گئیں۔ مثلاً الکوہل (Alcohal)، المبک (Alambic) القلی (Alchali) اور انٹی مونی (Antimony) وغیرہ۔

اسپین کے عرب عالموں کا سب سے بڑا کارنامہ تو وہ ہے جو انھوں نے فلسفۂ فکر کی اقلیم میں انجام دیا ہے۔ ان لوگوں نے اور ان کے مشرقی ہم مذہبوں نے یونانی فلسفہ کو اپنی جن تصانیف اور تالیفوں کے ذریعہ لاطینی مغرب میں منتقل کیا ہے، اگر اس کو ایک زنجیر سے تعبیر کیا جائے تو ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اسپین کے عربوں نے اس زنجیر میں آخری اور محکم ترین کڑی کا اضافہ کیا ہے۔ اس علم میں انھوں نے اپنی طرف سے اضافے کئے ہیں اور عقل و ایمان، مذہب اور سائنس کے درمیان مطابقت پیدا کر کے بہت بڑا کام کیا ہے اگرچہ مسلمان مفکروں کے نزدیک ارسطو کا کہا حق تھا، افلاطون کا کہا حق تھا اور قرآن کا کہا حق تھا لیکن حق کا ایک ہی ہونا بھی ضروری تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تینوں میں مطابقت کیلئے وہ بڑی مستعدی سے کمربستہ ہو گئے۔ زمانے میں نصرانی متکلموں کو بھی اسی مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ لیکن ان کی دینیات میں عقائد اور اسرار دونوں یکجا ہو جانے کی وجہ سے ان کا کام اور مشکل ہو گیا تھا۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں یونانیوں کا فروغ دیا ہوا فلسفہ اور عبرانی پیغمبروں کا پروان چڑھایا ہوا دین توحید یہی دو چیزیں قدیم مغرب اور قدیم مشرق کے سب سے بڑے ورثے ہیں۔

جدید تصورات کا جو پہلا سیلاب (اس میں زیادہ تر فلسفہ اور طب کے تصورات تھے) یورپ میں امنڈا ہے، اس سے تاریک زمانہ ختم ہوتا ہے اور علمی دور کی سحر نمودار ہوتی ہے عربی خیالات سے واسطہ پڑنے پر یورپ والوں کے دلوں کو علم و فلسفہ کی تحصیل کے شوق نے گرمایا اور قدیم یونانی علوم کی نوآگہی نے اس آتش شوق کو اور بھڑکایا۔ ان دونوں کے طفیل اہل یورپ نے بڑی تیزی اور مستعدی کے ساتھ اپنا آزاد علمی ماحول پیدا کر لیا جس کے ثمرات سے ہم اب تک مستفید ہوتے چلے آرہے ہیں۔

یہاں ہم مسلم اسپین کے بہت سے بڑے بڑے فلسفیوں میں صرف چند ایک ہی کا ذکر کر سکتے ہیں۔ ان میں ایک ابن طفیل ہے جس نے ۱۱۸۵ء میں وفات پائی ہے اس کا شاہکار ایک اچھوتا فلسفیانہ افسانہ ہے۔ اس افسانہ کا عنوان ہے "حیّ ابن یقظان" اس افسانے کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ فہمِ انسانی کسی خارجی عامل کی مدد کے بغیر عالمِ بالا کی آگہی حاصل کر سکتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس دنیا کا دار و مدار ایک قادر مطلق ہستی پر ہے یہ قرون وسطیٰ کے ادب کا بالکل اچھوتا اور نہایت دلکش افسانہ ہے۔ ماڈورڈ پوکاک نے سنہ ۱۶۷۱ء میں اسے پہلی بار لاطینی میں منتقل کیا تھا پھر اس کے بعد یورپ کی اکثر زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ چنانچہ ولندیزی زبان میں اس کا ترجمہ سنہ ۱۶۷۲ء میں فرنچی زبان میں سنہ ۱۹۲۰ء میں اور اسپینی زبان میں حال ہی میں یعنی سنہ ۱۹۳۱ء میں ہوا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزی زبان کی تصنیف رابن سن کروسو کا سرچشمہ بھی یہی کتاب ہے

اپنے اثر اور خاص کر مغرب پر اپنے اثر کے لحاظ سے سب سے بڑا مسلمان فلسفی، عرب اسپین کا ہیئت داں، طبیب اور ارسطو کا شارح ابن رشد ہے جسے یورپ والے Averroes کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ابن رشد سنہ ۱۱۲۵ء میں بمقام قرطبہ پیدا ہوا تھا۔ علم طب میں اس کا اہم ترین کارنامہ اس کی وہ تصنیف ہے جس میں اس نے اس حقیقت کو تسلیم کرایا ہے کہ کسی شخص کے چیچک ایک سے زیادہ مرتبہ نہیں نکلتی اور جس میں پردہ چشم (شبکۃ العین) کے وظیفہ کی ٹھیک ٹھیک تشریح کی گئی ہے۔ تاہم یہودی اور نصرانی دنیا میں ابن رشد پہلے پہل ارسطو کے فلسفہ کے شارح کی حیثیت سے مشہور ہوا، یہاں یہ یاد رہے کہ قرون وسطیٰ کے شارح بذات خود مصنف ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ اگلوں کی تصانیف کے خاکے کے اندر یا اس کو پس منظر میں رکھ کر فلسفہ یا سائنس پر اپنی مستقل تصانیف پیش کیا کرتے تھے اس طرح ابن رشد نے جو شرحیں لکھی ہیں وہ سب کی سب اصل میں اس کے اپنے مستقل رسالوں کا

ایک سلسلہ ہیں۔ اپنے بعض رسالوں میں ابن رشد نے ارسطو کی بعض تصانیف کے صرف نام لئے ہیں اور ان کے مضامین کے خلاصے کئے ہیں۔ مسلم ایشیا یا مسلم افریقہ کے مقابلہ میں ابن رشد کا رشتہ نصرانی یورپ سے زیادہ استوار معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح ارسطو کو اہل مغرب نے "استاد" مانا ہے بالکل اسی طرح ابن رشد کو "شارح" تسلیم کیا ہے۔ حقیقت میں یہ ابن رشد کا ارسطو تھا جس نے قرون وسطی کے یورپی نصرانیوں، اہل مکتب اور عالموں کے دلوں میں اضطراب کی لہر دوڑا دی۔ بارہویں صدی کے آخر سے لے کر سولھویں صدی کے ختم تک سب سے زیادہ ذی اثر مکتب خیال ابن رشد کا فلسفہ ہی تھا۔ تنگ خیال مذہبی ردعمل کے باوجود یہ مکتب خیال سب سے پہلے اسپین کے مسلمانوں ہی میں قایم ہوا اس کے بعد یہودیوں اور آخر میں نصرانی پادریوں میں اس کی نشر و اشاعت ہوئی۔ ابن رشد عقلیت پسند تھا اس کا دعویٰ تھا کہ مذہب کے الہامی اصول و عقائد کے سوا ہر چیز کو عقل اور دلیل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے چنانچہ ابن رشد کے اس خیال کی بنا پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ آزاد خیالی کا بانی اور مذہب کا بہت بڑا دشمن تھا لیکن اس خیال میں کچھ بھی صداقت نہیں ارسطو کے فلسفہ پر جن اگلے مسلمان محققوں نے کام کیا تھا انھوں نے بہت سی غیر مستند کتابوں کو بھی ارسطو کی تصنیف سمجھ لیا تھا ان میں بہت سی اشراقی کتابیں بھی شامل ہیں۔ ابن رشد کے فلسفہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کو خالص اور سائنٹفک ارسطاطالیت کا راستہ دکھایا مذہبی علماء نے ابن رشد کی تصانیف سے مذہب کی نظر میں قابل اعتراض اجزاء کو خارج کیا اور اس کے بعد جامعہ پیرس اور اعلیٰ تعلیم کے دوسرے اداروں میں اس کی تصانیف نصاب میں شریک کی گئیں۔ ابن رشد نے جس ذہنی تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی وہ اپنے تمام محاسن و معائب کے ساتھ یورپی فکر میں جدید مغربی سائنس کے ظہور تک ایک ذی حیات عامل کی طرح اپنا کام کرتی رہی۔

اس زمانے کے فلسفیوں میں اگر کسی کو ابن رشد کے بعد پہلا درجہ دیا جا سکتا ہے تو وہ اس کا ہم عصر اور ہم وطن قرطبی یہودی ابن میمون یا ابن میمونذ ہے جو عیسٰی ابن میمون کے نام سے مشہور ہے۔ اسے پورے عربی دور کے تمام یہودی فلسفیوں اور طبیبوں میں سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ یہ ۱۱۳۵ء میں بمقام قرطبہ پیدا ہوا لیکن اس کا خاندان مسلمانوں کی مذہبی تعذیب کی تاب نہ لا کر ۱۱۶۵ء میں قاہرہ چلا آیا اور یہیں بس گیا۔ بعض سوانح نگاروں نے دعویٰ کیا ہے کہ ابن میمون نے اسپین میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا اور در پردہ دین موسوی پر قایم رہا لیکن اس دعوے پر حال ہی میں نقادوں نے سخت تنقیدیں کی ہیں۔ قاہرہ میں ابن میمون شہرۂ آفاق سلطان صلاح الدین اور اس کے بیٹے ملک العزیز کا درباری طبیب مقرر ہوا۔ سنہ ۱۱۷۷ء میں اس کو قاہرہ کے یہودیوں کا سب سے بڑا مذہبی عہدہ دیا گیا اس عہدہ پر وہ اپنی وفات تک فائز رہا۔ اس نے ۱۲۰۴ء میں وفات پائی۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کی میت کو اسی راستہ ہاتھوں ہاتھ لے جایا گیا جس پر کسی زمانے میں حضرت موسیٰ چل چکے تھے اور طبریہ لے جا کر وہاں اسے دفن کیا گیا، اس کی قبر تکلف سے بری اور بالکل سیدھی سادی ہے۔ اس کی زیارت کے لئے اب بھی ہزاروں زائر آیا کرتے ہیں۔ مصر جدید کے نادار یہودی مریض اب بھی قاہرہ کے صلوات ربی موسیٰ بن میمون کے تہ خانے میں اس لئے شب بسری کیا کرتے ہیں کہ اس مقام کی برکت سے ان کا مرض دور ہو جائے۔ یہودیوں کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ "موسیٰ سے موسیٰ تک موسیٰ کا ہم پلہ کوئی نہیں ہوا" اس کہاوت سے یہودیوں میں موسیٰ بن میمون کی ہر دلعزیزی اور اس کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

ابن میمون نے ایک ہیئت داں، عالم دینیات طبیب اور سب سے بڑھ کر ایک فلسفی کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ اس نے فصد کے طریقے کی اصلاح کی۔ بواسیر کی علامت فیصل کو قرار دیا اور اس کے لئے ایک ایسی ہلکی پھلکی غذا تجویز کی جس میں بیشتر ترکاریاں ہیں۔

حفظ صحت کے بارے میں اس کے تصورات بہت بلند تھے طب میں اس کی سب سے مشہور کتاب "الفصول فی الطب" ہے فلسفہ پر اس نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ کتاب ہے جس کا نام "دلالۃ الحائرین" ہے اس کے معنی پریشان لوگوں کے رہنما کے ہیں۔ اس کتاب میں اس نے موسوی شریعت کو اسلامی ارسطاطالیت سے یا اس سے بھی وسیع ترمعنی میں عقل اور مذہب کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس نے پیغمبرانہ خوابوں کی تعبیر اس طرح کی ہے گویا یہ بھی طبعی تجربات تھے اس حد تک کم سے کم وہ حکیمانہ فلسفہ کا علم بردار ہے اور یہ فلسفہ انجیل کے بنیادی عقائد کے خلاف ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدامت پسند علماء اس سے اس قدر بگڑ گئے کہ اس کی کتاب کو 'دلالۃ' کے بجائے 'ضلالۃ' یعنی بھٹکانے والی کہنے لگے۔ اس کتاب میں اور اسی طرح دوسری کتابوں میں جو فلسفیانہ تصورات پیش کئے ہیں وہ ابن رشد کے خیالات سے ملتے جلتے ہیں مگر ابن میمون نے اس باب میں ابن رشد سے کوئی استفادہ نہیں کیا ہے بلکہ آزادانہ طور پر انھیں فروغ دیا ہے ابن رشد کی طرح وہ بھی یونانی زبان سے ناواقف تھا اور اس کو صرف عربی ترجموں پر تکیہ کرنا پڑا۔ اگرچہ اس نے نظریۂ تخلیق کو پیش ضرور کیا ہے لیکن اس پر غور و فکر کرنے میں اس نے خود حصہ نہیں لیا۔ اس زمانے کے ان تمام مفکروں کے پاس جو عربی زبان میں اپنے افکار و تخیلات پیش کیا کرتے تھے دو قسم کے نظریے تھے ایک نظریہ انجیل کے بنیادی عقاید کی صداقت کا ہے اس کی رو سے خدا کو ہر شے کا خالق تسلیم کیا گیا ہے اور دوسرا نوافلاطونی اور ارسطاطالیسی نظریہ تھا ابن میمون کا پیش کیا ہوا نظریہ ان دونوں نظریوں سے الگ تھا اس کا یہ نظریہ جوہر کے نظریہ سے مشابہ تھا ایک کتاب کے سوا اس کی تمام تصانیف عربی زبان میں ہیں لیکن ان کا رسم خط عبرانی ہے۔ یہ تصنیفیں بہت جلد عبرانی زبان میں اور اس کے بعد جزئی طور پر لاطینی زبان میں منتقل ہو گئیں۔ ان تصانیف نے اپنے اثرات زیادہ تر یہودیوں اور نصرانیوں پر مرتب کئے ہیں اور یہ اثرات زمانۂ ...

ملاں کے اعتبار سے بہت دور رس تھے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک اس کی کتابیں
یہودی فلسفہ کو غیر یہودی فرقوں میں منتقل کرنے کا زبردست وسیلہ بنی رہیں چنانچہ دور
جدید کے نقادوں نے البرٹس میاگنس (Albertus magnus) اور اس کے رقیب
ڈنس اسکوٹس (Duns scotus) اور اسپی نوزا (Spinoza) حتیٰ کہ کانٹ
(Kant) کی تصانیف میں بھی ابن میمون کی تصانیف کے اثر کا سراغ لگایا ہے
اس زمانے کے عارف کامل اور اسلامی تصوف کے روح رواں ایک ہسپانوی
عرب محی الدین ابن عربی تھے یہ اشبیلیہ میں پیدا ہوئے اور یہیں انھوں نے اپنی زندگی
بسر کی، لیکن سنہ ۱۲۴۰ء میں بمقام دمشق وفات پائی، جہاں ان کا مقبرہ اب بھی موجود ہے
انھوں نے اپنی ایک تصنیف میں حضرت محمدؐ کے سفر معراج اور سیر افلاک کے واقعہ
کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہتے ہیں کہ ڈانتے نے اپنے شہ کار طربیہ خداوندی
کی تیاری میں اسی تصنیف سے استفادہ کیا ہے۔
تیرہویں صدی کے آخر تک عربی سائنس اور عربی فلسفہ دونوں یورپ منتقل
ہو چکے تھے۔ وہ ذہنی راستہ جو الطلیطلہ کی پھاٹکوں سے شروع ہو کر کوہ پرنیز میں
سے ہو کر گذرتا تھا اب پراونس (Provence) اور الپائن کے دروں میں سے
پل کھاتا لورین، جرمنی، وسطی یورپ اور رود بار انگلستان کو پار کر کے انگلستان کی سرحد
تک پہنچ گیا تھا، سرزمین فرانس میں مارسیلز، تولوز، ناربونے اور مانٹ پلیبر عربی فلسفہ
کے مرکز بن گئے تھے مغربی فرانس میں کلونی کا خطہ جہاں کی خانقاہ میں کئی اسپینی راہب
مقیم تھے بارہویں صدی میں علوم و فنون کی نشر و اشاعت کا مرکز بن گیا تھا پیٹر نامی یہاں
کے ایک پادری نے ۱۱۴۱ء میں اسلام کے خلاف کئی رسالے شائع کرنے کے سوا قرآن
کا سب سے پہلا لاطینی ترجمہ بھی شائع کیا تھا۔ لورین یا لوتھارنجیا (Lotharingia)
میں عربی سائنس کی ترویج دسویں صدی میں ہوئی تھی اس کی بدولت یہ سارا علاقہ

بتدریج کئی دو صدیوں تک سائنٹفک تحقیق کا مرکز بنا رہا۔ عربی علوم و فنون کی ترویج کے لئے بیاج، گوزز، کولون اور دوسرے لوتھارنجی شہروں نے نہایت ہی زرخیز زمین مہیا کی تھی۔ لورین سے عربی علوم و فنون کی شعاعیں جرمنی کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیلنے لگیں، لورین کے باشندوں اور یہاں کے تعلیم پائے ہوئے لوگوں نے اس روشنی کو نارمن انگلستان میں منتقل کیا۔ اسپینی عربی علوم و فنون سارے مغربی یورپ کی رگ و پے میں سرایت کر گئے اور ان علوم و فنون کو یورپ میں منتقل کرنے کے لئے اسپین واسطے کی جو خدمت انجام دیتا چلا آ رہا تھا، اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

تفسیر مظہری

تمام عربی مدرسوں، کتب خانوں اور عربی جاننے والے اصحاب کیلئے بے مثل تحفہ

ارباب علم کو معلوم ہے کہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی یہ عظیم المرتبہ تفسیر مختلف خصوصیتوں کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتی لیکن اب تک اس کی حیثیت ایک گوہر نایاب کی تھی اور ملک میں اس کا ایک قلمی نسخہ بھی دستیاب ہونا دشوار تھا۔

الحمد للہ کہ سالہا سال کی عرقریز کوششوں کے بعد ہم آج اس قابل ہیں کہ اس عظیم الشان تفسیر کے شائع ہو جانے کا اعلان کر سکیں اب تک اس کی حسب ذیل جلدیں چھپ چکی ہیں جو کاغذ دیگر سامان طباعت و کتابت کی گرانی کی وجہ سے بہت محدود مقدار میں چھپی ہیں۔

ہدیہ غیر مجلد جلد اول تقطیع ۲۲×۲۹ سات روپے، جلد ثانی سات روپے
جلد رابع پانچ روپے، جلد خامس سات روپے، جلد ششم آٹھ روپے

جلد ثالث زیر طبع

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

ادبیات

نعت

ترمیم :- سید معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی بر نعت جناب منشی چند بہاری لال صبا

دو جہاں سے ہو بڑا گر ہو جہانِ مصطفیٰ ہو اگر ہو لامکاں صحنِ مکانِ مصطفیٰ
ہو اگر عرشِ بریں پر آشیانِ مصطفیٰ ہو اگر روح الامیں ہو پاسبانِ مصطفیٰ
رک نہیں سکتے کسی سے عاشقانِ مصطفیٰ

ہوں اگر بالغ نظر میری بلاغت پہ عزیز فرق کرنا دو زبانوں میں کٹھن ہے اور چیز
صاحبِ ایماں ہوں ایماں ہے مجھے اپنا عزیز کیا کہوں قرآں اٹھا کر ہو نہیں سکتی تمیز
یہ زباں اللہ کی ہے یا زبانِ مصطفیٰ

غرقِ دریائے معاصی ہوں میں از سر تا قدم فکر بھی ہے پرسشِ محشر کی مجھ کو دمبدم
لیکن اب تر دامنی کا کچھ رہا مجھ کو نہ غم اب مرا دامن نہیں ہے دامنِ رحمت سے کم
آ پڑی ہے اس پہ خاکِ آستانِ مصطفیٰ

ذکرِ میلادِ مبارک میں ہو کوئی نغمہ زا ہو کوئی مصروفِ نعتِ پاکِ ختم الانبیا
اور ہو لب پر کسی کے نعرۂ صلِّ علےٰ عیدِ میلادِ نبی کی بزم ہے آراستہ
آج ہونا چاہیئے اظہارِ شانِ مصطفیٰ

پہلے سب مخلوق سے انسان کو اشرف کیا اور کرمنا کا رکھا سر پہ تاجِ اعتلا
پھر بنایا اس نے ہم کو عاشقِ خیر الوریٰ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کرم اللہ کا
بن گیا خود پیشوائے عاشقانِ مصطفیٰ

ایک رفعت، ایک شانِ منزلت دونوں میں تھی جلوۂ قدرت وہی انوارِ رحمت بھی وہی
اور پھر شوقِ زیارت میں مری وارفتگی سادگی تو دیکھئے میری جبیں کی جھک گئی
عرشِ اعظم کو سمجھ کر آستانِ مصطفےٰؐ

عشق ہو دل میں تو کوئی بھی نہیں منزل کڑی شوق ہو رہبر تو پھر کیا ہے ضرورت خضرؑ کی
ہے وہی دنیا میں رہ کر کامیابِ زندگی آفریں ہمت پہ اس کی رحمتِ حق کہہ اٹھی
لے لیا گر پڑ کے جس نے آستانِ مصطفےٰؐ

عاشق و معشوق میں جب منکشف بیگانگی ہو بھی تو پھر کس طرح ہو امتیازِ باہمی
اور صورت تو کوئی فرقِ مراتب کی نہ تھی بندگی کی شان سے تفریق پیدا ہو گئی
ورنہ ہو جاتا خدا پر بھی گمانِ مصطفےٰؐ

عشق کی ہر وقت ان کے دل میں رہتی ہے کھٹک عشق نے کر دی ہے پیدا ان کی رگ رگ میں کسک
عشق کی ہر بات میں ان کی نمایاں ہے جھلک عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں سر سے لے کر پاؤں تک
عشق کی تصویر ہیں سب عاشقانِ مصطفےٰؐ

گرچہ جدِ مصطفےٰؐ نے اس کی رکھی ہے بنا اولیں معبد ہے دنیا میں یہی اللہ کا
سجدہ گاہِ عاشقاں سے کعبہ کو نسبت ہے کیا ہم دکھا دیں گے تمہیں کعبہ ادھر آتا ہوا
جس طرف سجدہ کریں گے عاشقانِ مصطفےٰؐ

کس طرح پھر ہو سکے بیت المقدس ہمسری کعبہ بھی جب اس کا ہم رتبہ نہیں ہے بالیقیں
کیا کہوں ایسا نہیں کوئی بھی بالائے زمیں میں تو کہتا ہوں خدا کا عرشِ اعظم بھی نہیں
جس قدر بھاری ہے سنگِ آستانِ مصطفےٰؐ

کہنے والے اپنے منہ سے جا ہے جو کچھ بھی کہیں لیکن اب اس میں ذرا بھی شک نہیں اطہر ہمیں
ماننے کی بات ہے یہ سب اسی کو مان لیں آخر انساں ہے صبا یہ سب ملائک کہتے ہیں
ہو نہیں سکتا بیانِ عز و شانِ مصطفےٰؐ

غزل

(جناب بسملؔ شاہجہانپوری)

نہ کہے اب کوئی ناکامِ تمنا مجھ کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے وہ جلوۂ یکتا مجھ کو

ایک عالم ہے کہ حیرت سے ہے تکتا مجھ کو تیرے جلووں نے بنایا ہے تماشا مجھ کو

پھر سرِ طور کوئی برق ہے کیا جلوہ فگن لے چلا آج کدھر ذوقِ تماشا مجھ کو

بیخودی کا ہو وہ عالم کہ تو ہی تو ہو فقط سو تمناؤں کی ہے ایک تمنا مجھ کو

ہاتھ آیا جو دمِ یاس تمہارا دامن مل گیا بحرِ محبت کا کنارا مجھ کو

دیکھئے کیا ہو مرے جوشِ طلب کا انجام آنکھیں دکھلاتا ہے ہر نقشِ کفِ پا مجھ کو

میں تجھے تجھ سے بھی نزدیک نظر آتا مگر تو نے اے دوست صداقت سے نہ دیکھا مجھ کو

خلشِ یک خزہ کاش مرے دل میں رہے ایک تنکے کا بھی کافی ہے سہارا مجھ کو

بحرِ عالم میں جدھر اٹھ گئیں نظریں بسملؔ ڈگمگاتا ہی نظر آیا سفینا مجھ کو

آگیا اے عشق پھر نازک مقام

(شاعرِ انقلاب جناب انورؔ صابری)

ہر قدم حسن و وفا کا اہتمام ہر نظر پابندِ آداب و سلام

حسن پھر کرنے لگا ہے احترام آگیا اے عشق پھر نازک مقام

اب ہے میری سمت معروفِ کرم دیدۂ کوثر چکاں بادہ بجام

اب ہے دوشِ آرزوئے دید پر گیسوئے شب رنگ سرگرمِ خرام

اب نہیں میں دامِ زلف و تیغ میں بند اب ہے میرے ساتھ دورِ صبح و شام

اب میں ہوں روحِ حیاتِ جاوداں اب مرے قبضہ میں ہے عمرِ دوام

اب نہیں دنیا رہینِ اضطراب اب ہے مستحکم زمانہ کا نظام

اب ہے ہر جائز خوشی میرے لئے اب ہوا مجھ پر غمِ دنیا حرام

ہے یہی انورؔ کمالِ عاشقی بات اُن کی ہے مرا رنگِ کلام

تبصرے

خاص نمبر

رہنمائے تعلیم انسانیت نمبر تقطیع کلاں ضخامت ۲۷۲ صفحات طباعت و کتابت بہتر قیمت دو روپیہ۔ پتہ:- دفتر رسالہ رہنمائے تعلیم ترا ہا بیرم خاں دہلی۔

سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ صاحب اردو زبان کے بہت پرانے اور مخلص خادم ہیں ماہنامہ "رہنمائے تعلیم" کے ذریعہ وہ ایک عرصہ دراز سے بلا تفریق مذہب وملت ملک کی تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں بحیثیت انسان کے موصوف جن اخلاقی اوصاف اور کمالات و فضائل کے حامل ہیں ان کا اندازہ کرنے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اگرچہ آپ ان خانماں خراب لوگوں میں سے ہیں جن کو فرقہ پرستی کے جنون نے اپنا وطن اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر پنجاب سے دہلی آنے پر مجبور کیا لیکن اس کے باوجود کیا مجال کہ سردار صاحب کے آئینہ شرافت و کمال انسانی پر ہلکا سا ایک بال بھی آیا ہو زبان سے بے تعصبی اور انصاف کا نام لینے والے کم نہیں لیکن ایسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں جو دراصل اپنے عمل اور طور طریق سے بھی انسانیت و شرافت کے اعلیٰ اقدار کے حامل ہوں اور کوئی شبہ نہیں کہ سردار صاحب انھیں چند خاص قسم کے افراد میں سے ہیں اسی بنا پر آپ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگوں میں مقبول و محبوب ہیں اور سب آپ کی عزت کرتے ہیں رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور کا بہت پرانا ماہنامہ ہے سردار صاحب نے ترک وطن کے بعد دہلی میں رہائش اختیار کرتے ہی اسے دہلی سے شائع کرنا شروع کر دیا تھا زیر تبصرہ نمبر اسی کا خاص نمبر ہے جس میں ہر فرقہ اور ہر ملت کے اونچے درجہ کے لیڈروں، ادیبوں، شاعروں، مردوں

اور عورتوں نے حصہ لیا ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس ملک میں انسانیت و آدمیت کا وقار دوبارہ قائم کرنے کے لئے اپنے افکار و محسوسات کو قلمبند کیا ہے سردار صاحب کا خلوص اس ضخیم رسالہ میں مختلف شکل و صورت میں جگہ جگہ نمایاں ہے ہند اور پاکستان کے ہر اس شخص کو جسے احیائے انسانیت کے فرض سے دلچسپی اور اس کا ذوق ہے کم از کم ایک مرتبہ اس نمبر کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

الحسنات آخرت نمبر" | تقطیع ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۱۰۸ صفحات طباعت و کتابت روشن قیمت خاص نمبر ایک روپیہ رسالہ کا عام سالانہ چندہ ۶/

الحسنات جماعت اسلامی کا ایک پندرہ روزہ رسالہ ہے جو انڈین یونین میں اس جماعت کے مرکز رام پور سے شائع ہوتا ہے، الحسنات کے مضامین بچوں، بچیوں اور عورتوں کے ذہنی اور دماغی قالب کو پیش نظر رکھ کر مرتب کئے جاتے ہیں چنانچہ آخرت نمبر کے مضامین بھی اسی معیار کے مطابق ترتیب دئے گئے ہیں زیر نظر نمبر میں آخرت سے متعلق اچھے خاصے مفید اور نتیجہ خیز مضمون جمع کر دئے گئے ہیں، مولانا سید ابو الحسن علی کا مضمون "اُس پار" مولانا ابو اللیث ندوی کا مضمون "زندگی پر عقیدۂ آخرت کا اثر" مولوی جلیل احسن صاحب ندوی کا مضمون "قیامت کیوں ہوگی" خاص طور پر لائق مطالعہ ہیں جو بچوں اور عورتوں کے علاوہ عام پڑھے لکھے مسلمانوں کے لئے بھی مفید ہیں عقیدۂ آخرت کو دل کی گہرائیوں میں جمانے کے لئے دوسرے افسانوں اور قصوں کے علاوہ نعیم صدیقی صاحب کا ایک افسانہ "لیڈر قاضی کے سامنے" بھی شریک اشاعت کیا گیا ہے سید حامد علی صاحب کی نظم "خدا ظالم نہیں ہے" بھی آخرت نمبر کے مقصد کو پوری پوری تقویت پہنچاتی ہے، مجموعی اعتبار سے پورا نمبر سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے اور عام مسلمانوں کے مطالعہ کے قابل ہے۔ (ع)

جدید رسائل

نوائے ادب | مرتبہ جناب ظہیر الدین مدنی صاحب تقطیع متوسط ضخامت ۹۰ صفحات

کتابت طباعت بہتر سالانہ چندہ تین روپیہ پتہ :- انجمن اسلام ۹۲ باری روڈ بمبئی۔

نوائے ادب بمبئی کی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری ۱۹۵۰ء سے نکلنا شروع ہوا ہے اب تک اس کے تین نمبر نظر سے گذرے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر نمبر میں اردو ادب و شعر سے متعلق محققانہ، سنجیدہ اور تنقیدی مقالات شائع ہوئے ہیں جن کے پیش نظر بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد "سہ ماہی اردو" کے دہلی سے کراچی منتقل ہو جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کو اس رسالے نے پُر کر دیا ہے علاوہ معیاری مقالات کے نوائے ادب نے ایک مفید جدت یہ کی ہے کہ اس کی ہر اشاعت میں "مقالہ نما" کے عنوان سے ہند اور پاکستان کے تمام قابل ذکر رسالوں کے مضامین و مقالات کا خلاصہ مختلف عنوانات کے ماتحت حروف تہجی کی ترتیب سے درج کیا جاتا ہے جس کو پڑھ کر ایک شخص بہت تھوڑے وقت میں یکجا طور پر دونوں ملکوں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا حال معلوم کر سکتا ہے خوش قسمتی سے بمبئی میں اس وقت اردو زبان کے نامور ادیبوں، محققوں اور نقادوں کا اچھا اجتماع ہے اور وہ سب انجمن سے وابستہ معلوم ہوتے ہیں اس لئے امید ہے کہ یہ رسالہ اپنے مقاصد کی تکمیل باحسن وجوہ کرے گا ارباب ذوق کو اس رسالہ کی ہر نوع حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔

کرن | ایڈیٹر جناب محمد عبدالغنی صاحب عزیزی تقطیع متوسط ضخامت ۵۲ صفحات کتابت طباعت بہتر۔ سالانہ چندہ پانچ روپے۔

یہ رسالہ ستمبر ۱۹۵۰ء سے گیا سے نکلنا شروع ہوا ہے اس میں دلچسپ افسانے نظمیں، غزلیں اور ہلکے پھلکے مقالات و مضامین سب کچھ ہوتے ہیں ہر مضمون اور افسانہ میں کسی نہ کسی افادی مقصد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے عریانی اور آج کل کی بدنام ترقی پسندی سے اس کا دامن پاک ہے علاوہ ادبی اور علمی خدمت کے بہار کی ایک بڑی علمی

برادری کی اخلاقی اور عملی اصلاح بھی اس رسالہ کا ایک مقصد ہے موجودہ اردو شکن ماحول میں ارباب برہان کی ہمت و عزیمت لائق صد تحسین و آفریں ہے امید ہے کہ قدردان اردو اس رسالہ کی بھی قدر کریں گے۔

اشارہ اڈیٹر قیوم خضر صاحب تقطیع متوسط ضخامت ۵۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر سالانہ چندہ چھ روپیے۔ پتہ:۔ گوتم بدھ روڈ گیا (بہار)

یہ ایک ادبی ماہنامہ ہے جو ابھی چند ماہ سے گیا سے شائع ہونا شروع ہوا ہے یہ بھی سنجیدہ و متین مضامین و مقالات کے علاوہ اچھے افسانوں، نظموں اور غزلوں کا حامل ہوتا ہے پہلے نمبر میں ڈاکٹر محمود صاحب وزیر مواصلات صوبہ بہار اور پنڈت سندر لال کے مقالات "بھارت کا کلچر کیا ہونا چاہیے" اور "اسلام کا سماجی سنگٹھن" خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہیں صوبہ بہار کے ان حوصلہ مند نوجوانوں کی کوششیں جو وہ اردو کے تحفظ و بقا اور اس کی ترقی و اشاعت کے لئے کر رہے ہیں ہر نوع حوصلہ افزائی کی مستحق ہیں

یثرب تقطیع ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۱۲۰ پتہ:۔ مکتبہ یثرب ۱۰- اے دی مال لاہور کتابت طباعت بہتر قیمت زیر نظر نمبر بابت نومبر و دسمبر ۱۹۵۰ء ایک روپیہ، سالانہ چندہ عہ

یہ ایک دو ماہی رسالہ ہے جو جنوری ۱۹۵۱ء سے ماہنامہ ہونے والا ہے ملک کی تقسیم کے بعد سے جماعت اسلامی کی لٹریری سرگرمیوں میں جو زبردست اضافہ ہوا ہے یثرب اس کا زندہ ثبوت ہے اور اسے بے تکلف اس جماعت کی ثقافتی اور ادبی خصوصیتوں کا ترجمان کہا جا سکتا ہے دوسرے شماروں کی طرح زیر نظر نمبر کے مضامین بھی سلیقے اور وسعت نظر سے ترتیب دئے گئے ہیں رسالہ کے مدیر اول ابو صالح صاحب اصلاحی نے "اپنی باتیں" جس انداز سے کہی ہیں وہ ان کی صلاحیت کار کی پوری طرح غمازی کرتی ہیں مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا مضمون "میرا بچپن" اور مشہور یورپین فلسفی برٹرنڈ رسل کی کتاب History of ...Philosophy کے دیباچہ کا ترجمہ مغربی

نظریات پر ایک نظر" اس شمارے کے لائق مطالعہ مضامین ہیں، مقالات کے علاوہ رسالے کا حصہ نظم بھی کافی دلچسپ اور سبق آموز ہے بلکہ غور کیا جائے تو اسی حصے کو دیکھ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ یثرب محض ادبی اور تاریخی رسالہ ہی نہیں بلکہ جماعت اسلامی کی نظریات کا خصوصی ترجمان بھی ہے۔ ماہر القادری کی نظم "آبگینے" کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

تیرے ساتھ اے مجلسِ دستور ساز　　جہل بھی ہے اور غلطکاری بھی ہے

اور خود شاعر کے قلم سے نکلا ہوا یہ نوٹ بھی جس میں اس شعر کی تشریح اس طرح کی گئی ہے "پاکستان کی مجلس دستور ساز جس نے سرتاپا غیر اسلامی دستور مرتب کیا اور اصرار اس پر کہ اسے اسلامی سمجھو نظم اس شعر پر ختم کی گئی ہے ؎

داد دے اے ملک اس تخئیل کی　　لیگ قومی بھی ہے سرکاری بھی ہے

یثرب کے افسانے اور غزلیں ان حضرات کو خاص طور پر پڑھنے چاہئیں جو اس جماعت کے تقشف اور خشک مزاجی کے شاکی رہتے ہیں۔

(ع)

REGISTERED No D 148

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسن خاص۔ جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین۔ جو حضرات پچیس روپے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہوں گے ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبہ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" کسی معاوضہ کے بغیر پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین۔ جو حضرات اٹھارہ روپے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ احبار۔ نو روپے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبار میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جائیں گی۔ یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلباء کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ رتاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہوجاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ رتاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہیئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ بہرحال ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ ششماہی تین روپے چار آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ دس آنے ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کراکر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔